زندگی کا رقص
م۔م۔ راجندر

زندگی کا رقص

(افسانوں کا مجموعہ)

م۔ م۔ راجندر

۱۔ یہ کتاب اترپردیش اردو اکاڈمی کے مالی اشتراک سے شائع ہوئی

۲۔ اس کتاب کے مندرجات سے اترپردیش اردو اکاڈمی کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے

ناشر:۔ م۔م۔ راجندر

تقسیم کار:۔ ۱۔ بیسویں صدی پبلیکیشنز (پرائیویٹ) لمٹیڈ
دریا گنج۔ نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۰۲

۲۔ طارق پبلیکیشنز۔ ۸۰۱۔ جامع مسجد۔ دہلی ۱۱۰۰۰۶

تعداد : چھ سو

سن اشاعت: ۱۹۸۵

قیمت :۔ 150/-

مطبع : کلر پرنٹنگ پریس، دہلی

کچھ مصنّف کے بارے میں

اصل نام :- مدن موہن لعل بھٹناگر
والد :- شری جگموہن لعل بھٹناگر (مرحوم)
والدہ :- شریمتی چنبیلی دیوی (مرحوم)
مقام پیدائش :- انبالہ چھاؤنی
تاریخ پیدائش اور عمر :- ۲۱ اگست ۱۹۲۳ء، اکسٹھ سال
تعلیم :- ایم۔ اے (انگریزی ادب)، آنرزان پرشئین
پیشہ :- سرکاری ملازمت (ریٹائرڈ ڈپٹی ڈائرکٹر پرسنل (آفیسرز) انڈین ایئر فورس۔ حالیہ افسانہ نگاری اور جرنلزم
ادبی زندگی :- چالیس سال

اب تک کی تصنیفات

(۱) کھو کھلے انبار (افسانوں کا مجموعہ)
(۲) آگ اور دھواں (ناول)
(۳) آگ اور دھواں (ناول۔ ہندی)
(۴) آکاش گنگا (افسانوں کا مجموعہ)
(۵) روشنی کے مینار (افسانوں کا مجموعہ)

معنون

اپنی بیوی ساوتری بھٹناگر کے نام جو میری تمام
خوشیوں کا سرچشمہ ہے اور جس کے ایثار اور
قربانی کا بدلہ کبھی نہیں چکایا جاسکتا

م۔ م۔ راجندر

ہمارے افسانہ نگاروں کی سب سے نمایاں خصوصیت آج یہ ہے کہ وہ مختلف موضوعات کے رنگارنگ پھولوں کا گلدستہ ہے۔ شاید ہی زندگی کا کوئی موضوع ایسا ہو جس کی جھلک ہمیں اُردو افسانہ نگاری میں نظر نہ آتی ہو۔ اور ان موضوعات کو پیش کرنے کے سلسلے میں مختلف افسانہ نگاروں نے اپنے اپنے نقطۂ نظر کو بھی پیش کیا ہے۔

م۔م۔راجندر اُردو کے مشہور افسانہ نگار ہیں اور انکے افسانوں میں انسان دوستی کے پیام کی گونج سنائی دیتی ہے۔ اگرچہ انکے چند افسانوں میں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ صرف زندگی کی عکاسی اور ترجمانی ہی کر رہے ہیں مگر بیشتر افسانوں میں وہ ایک قدم آگے بڑھ کر افراد کی الجھنوں اور پریشانیوں کا بھی پتہ لگاتے ہیں اور یہ بات ان کے پختہ سماجی شعور پر دلالت کرتی ہے۔

راجندر کے زیادہ افسانے متوسط طبقے کے افراد کی زندگی کے متعلق ہیں انہوں نے کہیں کہیں اس طبقے کے افراد کی زندگی کے کھوکھلے پن سے بھی پردہ اٹھانے کی کوشش کی ہے اور اس طرح اس طبقے کو بے نقاب کر دیا ہے جس کی زندگی میں دورنگی کارفرما ہے

اُن کے چند افسانوں میں محبّت پر ایک ایسی نظر ڈالی گئی ہے جو توجہ کی مستحق ہے اور اس طبقے کے خدوخال پر زیادہ روشنی ڈالتی ہے جس کی وہ عکّاسی کرتے ہیں۔ ان کے بعض کردار محبّت کرتے ہیں لیکن حقیقتاً محبت نہیں کرتے۔ ان کی محبت ایک کھیل کی حیثیت رکھتی ہے کیونکہ ان کے پاس خلوص نہیں ہوتا عمل کی صلاحیت نہیں ہوتی، حوصلے اور ولولے نہیں ہوتے جو اس طبقے کی خصوصیات ہیں۔

اپنے سب افسانوں میں راجندر نے ماحول کی عکاسی، سماں بندی اور مختلف کرداروں کے ذہنی تجزیے کا خاص خیال رکھا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں میں تکنیک کی رنگارنگی ملتی ہے۔ ان کے افسانوں میں موضوع اور ہیئت کی ایسی ہم آہنگی پائی جاتی ہے جو افسانے کی ایک بڑی خوبی ہے۔

(ڈاکٹر) عبادت بریلوی

ترتیب

ایک ہار، ایک جیت

شام ہوتے ہی اوصاف علی کی بیٹھک میں رونق ہونی شروع ہو جاتی اور حقہ گڑ گڑانے لگتا۔ اوصاف علی اپنے دوستوں میں بڑا مقبول تھا اور آندھی ہو یا بارش ہر شام کو اس کے دوست اس کے یہاں ضرور اکٹھے ہوتے۔ اس کے دوستوں میں ہر طرح کے لوگ شامل تھے۔ اس کے دفتر کے ساتھی مقبول احمد، ممتاز اور رام ناتھ اور ان کے علاوہ کشن حلوائی موتی پان والا، احمد ٹھیلے والا اور بخشو جو بالکل بیکار تھا۔

اوصاف علی نہر کے دفتر میں کلرک تھا۔ اسے ملازمت کرتے بیس برس ہو گئے تھے اس کے رہن سہن اور اس کی بیٹھک کی مشرقی طرز کی سجاوٹ کو دیکھ کر اس کی مالی حالت کے بارے میں اچھا ہی خیال پیدا ہوتا تھا۔ وہ اپنے دادا کے بنائے ہوئے مکان میں رہتا تھا جس کا وہ اب تنہا وارث تھا۔ اگرچہ وہ بیوی بچّوں والا تھا مگر سر شام حقہ لے کر اپنی بیٹھک میں دوستوں کے ساتھ بیٹھنا اور رات گئے اٹھنا اس کا پرانا معمول تھا۔ اس کی عمر کوئی پینتالیس سال کی تھی اور اس کی صحت غیر معمولی طور پر اچھی تھی۔

اگرچہ اوصاف علی کی مجلس میں گنے چنے اور مخصوص لوگ ہی شریک ہوتے تھے مگر ایک روز اس نے اپنے دفتر میں آئے ہوئے نئے بابو نثار احمد کو بھی اپنے یہاں اٹھنے بیٹھنے کو کہہ دیا۔ شروع شروع میں تو نثار اوصاف علی کے یہاں نہ جا سکا مگر جب اوصاف علی نے نثار کو مکان بھی اپنے محلّے میں ہی دلوا دیا تو وہ اسی روز شام کو اس کے یہاں پہنچا۔ اوصاف علی کمرے کے وسط میں چاندنی پر بیٹھا ہوا جھک کر کاغذ پنسل لئے کچھ حساب سا لگا رہا تھا۔ پاس ہی ایک طشتری میں کچھ لگے ہوئے پان رکھے تھے۔ اتنے میں نوکر آیا اور بھرا ہوا حقہ رکھ کر چلا گیا۔ نثار سلام کر کے پاس ہی بیٹھ گیا اور اوصاف علی نے سلام کا

جواب دینے کے بعد ایک پان نثار کو پیش کیا اور ایک خود کھایا۔ دونوں ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ تھوڑی دیر میں مقبول احمد، ممتاز اور رام ناتھ آ گئے اور انہوں نے نثار سے اس کے نئے مکان کے بارے میں پوچھا۔ اتنے میں کشن حلوائی آ گیا۔ اور یہ سب ذرا پیچھے ہٹ کر ایک دائرے میں بیٹھ گئے اور کشن کو ایک ممتاز جگہ دے دی گئی۔ کشن نے ایک مشکوک سی نظر نثار پر ڈالی تو اوصاف علی بولا۔

" کوئی نہیں۔ اپنے ہی آدمی ہیں۔"

" وہ تو چونسٹھ ہی کہہ رہا ہے۔" کشن نے آنکھوں کو چڑھا کر کہا۔

" تو چونسٹھ ہی تو اس کی خبر ہے۔ کلّو کی" ممتاز بولا۔

اوصاف علی نے طشتری سے ایک اور پان اٹھا کر منہ میں ڈالتے ہوئے سوچ کر کہا۔

" اوں ہوں۔ اس سالے کلّو کو کیا پتہ۔ میرا خیال ہے آج ساٹھ نہیں چوک سکتا۔"

اتنے میں احمد اور موتی آ گئے۔ موتی بیٹھتے ہی بولا۔

" بخشو ابھی آیا یا نہیں۔"

" بخشو کو میں نے کہہ دیا تھا کہ جب تک وہ منہ سے کچھ نہ بولے تو اس کے پاؤں ہی دباتا رہیو۔ میرا خیال ہے وہ اب آتا ہی ہو گا۔" اوصاف علی بولا۔

اوصاف علی کے منہ سے یہ فقرہ نکلا ہی تھا کہ دروازے کو زور سے کھولتا ہوا بخشو آ گیا۔ وہ ایک میلی سی چادر میں لپٹا ہوا تھا۔ اور اس کی انگلیوں میں ایک بیڑی جلتی ہوئی تھی۔ وہ بیچ میں گھس کر بیٹھ گیا۔ اس نے بیڑی ہاتھ کی رگڑ سے بجھا کر جیب میں رکھ لی اور حقے کی نے اپنی طرف کر کے ایک زور کا کش لگایا۔ اس کے بعد جھک کر آہستہ سے بولا۔

" چار چونیاں "

" چار چونیاں"، کشن نے سوچتے ہوئے دہرایا۔

" استاد" بخشو اپنی گردن کو سارس کی طرح گھما کر بولا۔ "لوگ اسے کہتے تو پاگل ہیں مگر وہ شاہ ہے شاہ۔ صبح دس بجے سے جو میں اس کے پاؤں دبانے بیٹھا ہوں تو یہ وقت آ گیا۔ آج اس کی لاتیں تک کھائی ہیں۔ اب اندھیرا ہو گیا تو میں نے پاؤں پر سر رکھ کر کہا

سائیں آج بتادے پھر نہیں پوچھوں گا تو وہ بولا "پہلے چار چونیاں لا۔"

"چار چونیاں" اوصاف علی حقے کا کش لگا کر بولا۔ "چونسٹھ بھی ہوتا ہے اور بندی بھی"

"بندی کیسے؟" رام ناتھ نے پوچھا۔

"بھئی چونسٹھ کل آیا تھا۔ چونسٹھ میں سے چونسٹھ گئے۔ میرا تو بندی پر ہی دل ٹھکتا ہے۔" اوصاف علی بولا۔

"میں کہتا ہوں وہ چونسٹھ کا ڈرا آج پھر مارے گا۔ اس کا نام بھی کانشی رام ہے۔" احمد اپنے آپ کو سمیٹتا ہوا بولا۔

"تو پرچہ بنالو" کشن بولا۔

اوصاف علی نے "پرچہ" بنایا۔ کشن کے دس روپے چونسٹھ پر، اوصاف علی کا پانچ روپے کا ساٹھ اور دو روپے کا چونسٹھ۔ ممتاز، مقبول اور رام ناتھ کا دو دو روپے کا چونسٹھ اور ایک ایک روپے کی بندی، سوا روپے کی بندی موتی کی۔ احمد کی آٹھ آنے کی بندی اور آٹھ آنے کا چونسٹھ۔ ایک آنے کا بخشو کا چونسٹھ۔ بخشو نے پیسے لئے، انہیں گنا، پرچے کو اپنی چادر کی تہوں میں چھپایا اور بجھی ہوئی بیڑی کو چلم سے سلگا کر باہر نکل گیا۔

بخشو چلا گیا تو اوصاف علی نثار کی طرف متوجہ ہوا جو اب تک ان باتوں کو حیرانی سے سن رہا تھا۔ مسکرا کر بولا۔

"نثار بابو۔ بھئی یہ ہمارا پرانا شغل ہے۔"

نثار بھی مسکرا دیا اور اوصاف علی نے پان کی طشتری اس کی طرف بڑھا دی اور نوکر کو آواز دے کر حقہ تازہ کرنے کے لئے کہا۔ اوصاف علی پھر بولا۔

"نثار بابو قسمت کا کھیل تو ہے ہی مگر اس کام میں حساب کتاب بھی بہت چلتا ہے۔ ہمارے استاد کشن تو اس کام میں بہت ہی ماہر ہیں۔"

نثار نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے کشن حلوائی کی طرف دیکھا جس کی آنکھوں اور ناک کی حرکت سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ ان سے سوچتا بھی ہے۔ اوصاف علی

کہنے لگا۔

"بس گیارہ بجے فیصلہ ہو جائے گا۔ گھڑیا فیروز پور میں پونے گیارہ بجے کھلتی ہے اور اسی وقت تاریں کھڑک جاتی ہیں۔"

نثار اوصاف علی کی باتیں سنتا رہا۔ وہ تھوڑی دیر اور بیٹھا اور پھر چلا گیا۔ راہ میں وہ گھڑیا، دڑا، بندی اور چار چونیاں جیسے عجیب و غریب الفاظ پر غور کرتا رہا۔ اوصاف علی کے بارے میں اس کا یہ خیال نہیں تھا کہ وہ سٹے باز ہے۔ مگر اوصاف ہی کیا اس میں تو اس کا تقریباً سارے کا سارا نہر کا دفتر ہی پھنسا ہوا تھا۔

اگلے روز نثار دفتر پہنچا تو اوصاف علی کی میز کے گرد مقبول، ممتاز اور رام ناتھ کھڑے ہوئے زور زور سے بول رہے تھے۔ پتہ لگا کہ کل چولنٹھ آگیا تھا اور اوصاف علی کو کوئی ایک سو اسّی روپے ملے ہیں۔ اتنی ہی رقم ان تینوں کو بھی ملی تھی کشن کو سب سے زیادہ یعنی تقریباً نو سو روپے ملے تھے۔ بخشو کو بھی پانچ روپے مل گئے تھے۔ اوصاف علی کا چہرہ دمک رہا تھا اور اس کی ناک فخر سے پھولی ہوئی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا کہ اگر وہ حساب نہ لگاتا تو سب مر گئے ہوتے۔ ہر ایک مستانہ سائیں کے گُن گا رہا تھا اور اوصاف علی نے تو یہ تہیہ کر لیا تھا کہ وہ کسی دن مستانہ کو گھیر گھار کر اپنے گھر لائے گا اور قورمے اور پلاؤ وغیرہ سے اس کی خوب تواضع کرے گا۔

نثار کو سٹے سے کوئی رغبت نہیں تھی۔ مگر اوصاف علی کی مقناطیسی شخصیت اسے کھینچتی گئی۔ اوصاف علی طبیعت کا بڑا اچھا تھا اور دوستوں پر خرچنے میں اس کا دل کافی فراخ تھا۔ اوصاف علی کے ساتھ اس کا اٹھنا بیٹھنا بڑھتا گیا حتیٰ کہ وہ وقت آگیا کہ وہ کسی شام کو بھی اس کے یہاں جائے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ نثار کو جلد ہی پتہ لگ گیا تھا کہ اس چھوٹی سی ٹکڑی میں کشن حلوائی اور اوصاف علی کو اس کام میں خاصی مہارت حاصل تھی۔ بخشو نے تو ایک روز نثار کو یہاں تک بتایا کہ اوصاف علی کا یہ مکان اس کے دادا کا نہیں بلکہ اوصاف علی کا ہی سٹے کی کمائی سے خریدا ہوا ہے!

ایک روز جب "پرچہ" جا چکا تھا تو کشن حلوائی اور اوصاف علی میں بڑی بحث ہوئی۔ آج ایک خبر کشن لایا تھا اور ایک خبر بخشو کے ہاتھ بھی کسی فقیر سے لگی تھی۔ بخشو کی خبر اوصاف علی کے حساب سے مل گئی تھی مگر کشن آج شرط لگانے کے لئے تیار تھا کہ اُس کا "حرف" آئے گا۔ بہر حال آج سب نے دونوں ہی خبروں کے مطابق کافی کافی پیسے لگا دیئے تھے مگر اوصاف علی اور کشن میں ٹھن گئی۔ کافی بحث کے بعد یہ طے پایا کہ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا جس کا حرف نہ آئے وہ سب کو آدھ آدھ سیر دودھ اور پاؤ پاؤ بھر جلیبی پلوا دے۔ یہ فیصلہ ہوتے ہی کشن کی دکان پر کہلوا دیا گیا کہ کوئی چار سیر دودھ اور دو سیر جلیبی الگ رکھ لی جائے اور نثار کو بھی نتیجے تک ٹھہرنے پر مجبور کیا گیا۔

کوئی ساڑھے دس بجے بخشو اپنی چادر لپیٹے، بیڑی سلگا کر نتیجہ معلوم کرنے کے لئے باہر نکلا سب جاگ رہے تھے اگرچہ کچھ کمر سیدھی کرنے کے لئے لیٹ گئے تھے۔ اوصاف علی اور کشن باری باری حقہ گڑگڑا رہے تھے۔ نثار بھی جاگ رہا تھا مگر وہ اپنی آنکھوں پر نیند کا بوجھ محسوس کرنے لگا تھا۔ کوئی گیارہ بجے کشن نے وقت پوچھا اور لیٹے ہوئے بھی اٹھ کر بیٹھ گئے۔ کوئی سوا گیارہ بجے دروازے کو چور کی طرح آہستہ سے کھولتا ہوا بخشو داخل ہوا۔ اس نے اپنے جوتے اتارے، چادر کو اور کس کر لپیٹا، بیڑی کو بجھا کر جیب میں رکھا اور اوصاف علی کی طرف دیکھتے ہی سر ہلا دیا۔ اوصاف علی کی خبر ٹھیک نکلی تھی نہ کشن کی!

مگر اس کے چند روز بعد کشن اور اوصاف علی کی ایک متفقہ خبر ٹھیک نکلی اور سب کو کافی پیسے ملے۔ اس کے دو روز بعد کی بات ہے۔ اتوار کا دن تھا۔ بخشو نثار کے یہاں آیا اور بولا کہ بابو اوصاف علی نے ابھی بلایا ہے۔ نثار چپل پہن کر ساتھ ہی ہو لیا۔ راستے میں پتہ لگا کہ آج بخشو منت سماجت کر کے مستانہ کو اوصاف علی کے گھر لے آیا تھا اور آج کسی ایسی خبر کے ملنے کی توقع تھی جس کا لوٹنا ناممکن تھا۔ نثار اوصاف علی کے گھر پہنچا تو اس کے گھر بڑی رونق تھی۔ اس کے بچے بھی نئے نئے

کپڑے پہنے پھر رہے تھے۔ بیٹھک میں ایک نیم برہنہ پاگل سا آدمی لیٹا ہوا تھا اور نثار سمجھ گیا کہ یہی مستانہ ہے۔ اس کے سر کے بال اور داڑھی بے حد بڑھی ہوئی تھی اور اس کا تمام چہرہ گرد اور دھول سے اٹا پڑا تھا۔ اس کی آنکھوں میں عقاب کی سی چمک تھی اور اس نے نثار کو کسی شکاری کتے کی طرح گھور کر دیکھا۔ بخشو نے کہا تھا کہ آج سائیں کے لئے ہرن کا گوشت بنا تھا جسے کل اوصاف علی کے ایک دوست شکار کر کے لائے تھے۔ بخشو نے پہنچتے ہی مستانہ کے پاؤں دبانے شروع کر دیئے۔ اوصاف علی بڑا مصروف معلوم ہوتا تھا۔ اندر سے ہوا کی مانند تیزی سے نکلا اور نثار کو بازو سے پکڑ کر باہر لے آیا اور بولا۔

"نثار بابو بس یوں سمجھو آج مراد پوری ہوگئی ہے۔ شام تک اِس کی مہر ہو جائے گی۔ میں نے آپ کو یوں بلوایا تھا کہ آج ہم لوگ تو بس جو کچھ ہمارے پاس ہے سب لگا رہے ہیں۔ اگر تم بھی فائدہ اٹھانا چاہو تو تھوڑے سے لگا دو۔ یہ موقع پھر نہیں آئے گا۔ دس بیس سے ہزار دو ہزار آجائیں گے۔ کیونکہ آج اس سے صحیح نمبر ملنے کی امید ہے۔ اگر پیسے نہ ہوں تو کوئی انتظام کر لو۔ تم دوست ہو اور روز آتے ہو۔ میں نے سوچا آپ کو کہلوا دوں۔"

اور یہ کہہ کر اوصاف علی فوراً اندر چلا گیا اور نثار سوچتا ہوا واپس آگیا۔۔۔ آج سب لوگ جتنا ان کے پاس ہے سب لگا رہے ہیں!۔۔۔ وہ خیالات میں ڈوبا ہوا اپنے کمرے میں جا کر لیٹ گیا۔ مہینے کی دس تاریخ تھی اور اس کے پاس تیس روپے بچے تھے جو بیوی نے مہینے بھر کی سبزی ترکاری کے لئے رکھ لئے تھے۔ اُس کی حالت تو واقعی خراب تھی۔ اس نے دل ہی دل میں حساب لگایا کہ اسے تین چار سو روپے تو دینے ہی تھے۔ اور پھر نہ بیوی کے پاس کپڑا تھا نہ بچوں کے۔۔۔ تیس روپے سے دو تین ہزار روپے آجائیں گے۔۔۔ دو تین ہزار!' اس نے لفظوں کو ذرا پھیلا کر دل میں دہرایا۔ سب قرضے بھی دیئے جائیں گے، کپڑے بھی بن جائیں گے اور حالت سدھر جائے گی۔ بچوں کے لئے اب کے الگ کوئی لحاف نہیں بن سکا تھا اور وہ

اس کے ساتھ سوتے تھے۔

اس نے بیوی سے کہنا مناسب نہیں سمجھا۔ وہ دبے پاؤں اٹھا اور طاق میں پڑی ہوئی بیوی کے ٹرنک کی چابی اٹھا لایا۔ وہ آنگن میں بیٹھی کپڑے دھو رہی تھی۔ اس نے آہستہ سے تالا کھولا اور دس دس روپے کے تین نوٹ کپڑوں کی تہوں میں سے نکال لئے۔ پھر وہ چپ چاپ آکر چارپائی پر لیٹ گیا۔

وہ اوصاف علی کی بیٹھک میں وقت سے ذرا پہلے ہی پہنچ گیا مگر آج سب لوگ ہی ذرا جلد آ گئے تھے۔ وہ اپنی جیب پر ہاتھ رکھتا ہوا ایک کونے میں بیٹھ گیا۔ مستانہ کی جگہ ایسے خالی پڑی تھی جیسے کوئی گدھ کوئی مرا ہوا جانور کھا کر اڑ گیا ہو۔ پتہ لگا کہ مستانہ کوئی پانچ بجے اوصاف علی کے ہاں سے چلا گیا تھا مگر ڈرا بتا گیا تھا۔ نثار نے سب پر ایک نظر ڈالی اور اسے ایسا محسوس ہوا جیسے سب کی ہی جیبیں آج بوجھل تھیں ــــ اوصاف علی بولا۔

"لو بھئی تو پرچہ تیار کر لو۔ احمد تو کتنے لگا رہا ہے؟"

"بیس"

"ابے بیس!"

"ہاں" احمد بولا "آج تو ادھار مانگ کر لایا ہوں۔ یا ادھر یا ادھر۔"

پرچہ لکھا جانے لگا۔ اوصاف علی کے ڈیڑھ سو، کشن حلوائی کے تین سو، مقبول احمد، ممتاز اور رام ناتھ کے پچاس پچاس، موتی اور احمد کے دس اور بجنتو کے تین۔

"نثار بابو" اوصاف علی نے آواز دی اور نثار کانپ سا گیا۔ اس نے آگے بڑھ کر تیس روپے اوصاف علی کے ہاتھ میں تھما دیئے۔

پرچہ وقت سے پہلے چلا گیا کیونکہ اوصاف علی کا خیال تھا کہ شاید آج ایک آدمی اتنا نہ "کھائے" اور دو تین جگہ دینا پڑے۔ آج بجنتو کے ساتھ رام ناتھ کو بھی بھیجا گیا۔

نو بج گئے اور مستانہ کی باتیں کرتے کرتے سب لوگ امید و بیم کی حالت میں

پھسل گئے۔ احمد ایک کونے میں لیٹ کر چھت پر چلتی ہوئی چھپکلی کو دیکھنے لگا۔ کشن حلوائی نے حقہ سنبھال لیا اور اوصاف علی نے پان زیادہ زردہ ڈال کر کھایا۔ مقبول اور ممتاز پاس پڑے ہوئے پلنگ پر لحاف میں گھس گئے۔ تھوڑی دیر میں بجنتو اور رام ناتھ پرچہ دے کر لوٹ آئے۔ نثار بیٹھا ہوا تھا۔ اوصاف علی اور کشن کے حقے کی گڑگڑاہٹ اتنی گہری خاموشی میں اسے بادلوں کی گڑگڑاہٹ لگ رہی تھی۔ بعض مرتبہ اسے محسوس ہوتا تھا کہ کوئی لوہار ہتھوڑے سے چلا رہا ہے اور ضربیں اس کے ذہن پر پڑ رہی ہیں۔ وہ تینوں نوٹ تو وہ دے چکا تھا! اس نے اپنی جیب مسلی اور اپنا سر دونوں گھٹنوں میں دبا کر بیٹھ گیا۔

وقت گزرتا رہا۔ کوئی ساڑھے دس بجے بجنتو نتیجہ لانے روانہ ہو گیا۔ کمرے کی خاموشی زیادہ گہری ہو گئی تھی۔ اوصاف علی حقہ چھوڑ کر لیٹ چکا تھا مگر کشن اس کمرے کی قبر کی سی خاموشی میں کبھی کبھی کش لگا کر ماحول کو خوفناک سا بنا رہا تھا۔ نثار کو ایسا محسوس ہوا جیسے چھت پر سے کوئی بوجھ نیچے اتر رہا ہو اور اس نے ایک جھٹکے کے ساتھ سر اٹھایا مگر پھر جھکا لیا۔

تیس روپے ــــ تیس روپے وہ دے چکا تھا۔ یہ تیس روپے اس کی بیوی شہناز نے مہینے بھر کا خرچ چلانے کے لئے رکھے تھے۔ وہ اب کے اپنی ایک شلوار بنانا چاہتی تھی مگر پھر خود ہی گھر کی ضرورت کے مدنظر اس نے شلوار نہ بنانے کا فیصلہ کیا تھا۔ نثار کے گھٹنوں میں دبا ہوا ذہن تیزی سے سوچ رہا تھا ان تیس روپوں میں بچوں کے ہی کپڑے بن جاتے۔ وہ دفتر پیوند لگی پتلون میں جاتا ہے، ایک پتلون کا کپڑا ہی لے آتا۔ ان تیس روپے میں اس کے کتنے کام بن جاتے!

اوپر سے اُترتا ہوا بوجھ اس کے ذہن کو زیادہ دباتا رہا اور اس نے ایک گناہ، ایک جرم کا احساس کیا۔ بجنتو اب آتا ہی ہو گا ــــ لیکن نہیں، وہ اس کا آنا برداشت نہیں کر سکے گا۔ اسے وہ رات ابھی تک نہیں بھولی تھی جب بجنتو

کی بیڑی کی راکھ جھڑتے ہی بیٹھک میں ایک ماتم سا چھا گیا تھا۔ جیسے جنگل کی کسی جھاڑی میں جگنو اچانک بجھ گئے ہوں اور چاروں طرف گھپ اندھیرا چھا گیا ہو۔ وہ سب اس رات کیسے چھوٹے سے بن کر، کتنے جھکے جھکے، کتنے آہستہ آہستہ اس بیٹھک سے نکلے تھے جیسے کسی قبرستان یا شمشان گھاٹ سے لوٹ رہے ہوں۔

نثار آہستہ سے اٹھا۔ آج جیسے سب ہی سو گئے تھے۔ اس نے چوروں کی طرح آہستہ سے دروازہ کھولا اور باہر نکل گیا۔ ٹھنڈی اور کھلی ہوا میں پہنچ کر ایک گہرا سانس لیا۔ اس نے اوپر ٹھٹھرتے ہوئے چاند اور تاروں کو دیکھا اور اسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ کبھی کوئی بازی ہار گئے تھے۔ اس نے اپنے ذہن کو جھٹکا دیا، جیبوں میں ہاتھ ڈالے اور تیزی سے گھر کی طرف بڑھنے لگا!

یہی زندگی ہے!

میں ریٹائر ہونے کے بعد اس چھوٹے سے شہر میں چلا آیا تھا۔ میرے دونوں لڑکوں کی شادی ہو چکی تھی اور وہ آرام سے زندگی بسر کر رہے تھے۔ ان کی ماں کی یہ بڑی خواہش تھی کہ وہ اپنی زندگی میں ان کی پیاری سی بہوئیں دیکھ لے اور اس کی یہ خواہش پوری ہو گئی تھی۔ مگر چھوٹے لڑکے کی شادی کے ایک سال کے اندر ہی وہ ہمیں چھوڑ جائے گی، اس کا کسی کو گمان تک نہ تھا۔ عمر کی ایک اچھی خاصی منزل پر پہنچ جانے کے باوجود مجھے ایسا محسوس ہوا تھا جیسا میرا سارا گلشن ہی اجڑ گیا ہو۔ جن لڑکوں سے بیحد پیار تھا، جو بیٹے آنکھوں کے تارے تھے، وہی کچھ بیگانے سے لگے اور بڑی شدت سے محسوس ہوا کہ اس پیار بھری پھلواری کا مالی میں نہیں تھا اور گھریلو خوشیوں کا محور میں نہیں بچوں کی ماں ہی تھی، اور اب وہ محور کہاں!

میری زندگی کی شام بہت دھندلی ہو گئی۔ میرے ریٹائر ہونے میں اس وقت صرف چھ ماہ تھے اور میں ایک اطمینان بھری، صاف شفاف زندگی کے خواب دیکھ رہا تھا جس میں کوئی بھی تھکا دینے والی ہماہمی اور دوڑ نہ ہو گی۔ لڑکے اچھی ملازمت میں تھے اور میرے گزارے کے لئے پینشن کافی تھی۔ میں تو یہ سمجھ رہا تھا کہ میری زندگی کا سہانا دور تو اب شروع ہو گا اور میں کئی ایسی انجانی خوشیوں کو پا لوں گا، جن سے میں اب تک محروم رہا تھا اور جو شاید وقت کی اسی منزل پر ملتی ہیں۔ لیکن میرے ان خوابوں اور خوشیوں کے تانے بانے بُنے جانے سے پہلے ہی بکھر گئے۔

میں نے اس شہر میں ایک چھوٹا سا مکان بنا لیا تھا۔ اس مکان کے کنارے

چونے، اینٹ، اینٹ میں مرحومہ کی کتنی ہی معصوم خوشیاں گھلی ملی تھیں یہ میں ہی جانتا تھا۔ جب وہ زندہ ہی تھی تو میں چھٹی لے کر اس مکان کو تعمیر کرانے یہاں آیا تھا تو وہ خوشی سے جھوم سی اٹھی تھی۔ اس کی آنکھوں کی سفیدی میں وہ چمک اُبھر آئی تھی جسے صرف کسی پاکیزہ جذبے کی تکمیل ہی جنم دے سکتی ہے۔ میں اس مکان میں اکیلا ہی رہوں گا، اس کا اس وقت تصوّر بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ مگر میری زندگی کی تو تمام کرنوں کو ماند پڑنا تھا۔ اپنے بچّوں کے رونے دھونے اور اصرار کے باوجود میں وہاں سے چلا آیا تھا۔ زندگی میں کسی بھی دوڑ کی اب مجھ میں ہمّت نہیں تھی۔ اور یہاں میں اپنے باقی سال تنہائی کے گوشے میں گزارنا چاہتا تھا۔

یہاں جلدی ہی میں نے اپنے آپ کو نئے ماحول میں جذب کر لیا۔ دونوں وقت کھانا خود پکاتا اور کافی وقت مذہبی کتابوں کے پڑھنے میں صرف ہو جاتا۔ پڑوس کے کئی ریٹائرڈ آدمیوں سے میری واقفیت ہو گئی اور انہوں نے میرے پاس ہی بیٹھنا شروع کر دیا۔ وقت اِدھر اُدھر کی باتوں اور بحثوں میں کٹ جاتا۔ زندگی یہاں یقیناً زیادہ اطمینان دہ ہوتی جا رہی تھی۔

ایک روز میں ایک صاحب سے باتیں کرتا ہوا شہر سے ذرا دور نکل گیا۔ واپس آ رہا تھا تو راستے میں پیچھے سے کسی نے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ مڑ کر دیکھا تو بھگوان داس تھے انہیں یہاں پا کر مجھے حیرانی بھی ہوئی اور خوشی بھی۔ بھگوان داس کوئی پندرہ برس ہوئے بلول میں میرے ساتھ ڈاک خانے میں کام کرتے تھے۔ اس کے بعد میرا تبادلہ ہو گیا اور پھر ملنے یا اکٹھے ملازمت کرنے کا اتفاق نہ ہوا۔ بلول میں ان سے میرے بہت اچھے تعلقات تھے۔ اس لئے انہیں یہاں دیکھ کر مجھے بے حد خوشی ہوئی اور یہ خوشی انوکھی بھی تھی کیوں کہ میں یہاں تنہا تھا اور کسی دیرینہ دوست کے ملنے کی توقع بالکل نہ تھی۔

بھگوان داس مجھے اپنے گھر لے گئے۔ ان کی زندگی کی کشتی بھی حادثوں کے کئی تند طوفانوں سے گزری تھی اور ان طوفانوں کے نشان بالکل عیاں تھے۔ ان کی

شریک حیات بھی زندگی سے اپنا ناطہ توڑ چکی تھی اور اس کے گزرنے کے دو سال بعد ہی ان کی بڑی لڑکی اوما جس کی شادی بھی طے ہو گئی تھی۔ ٹائیفائڈ میں چل بسی تھی۔ دو لڑکیوں کی وہ شادی کر چکے تھے۔ اس وقت سب سے چھوٹی لڑکی بسنتی ان کے ساتھ تھی۔ ان کی پنشن ملازمت کچھ کم ہونے کی بنا پر بالکل قلیل تھی اور وہ یہاں ایک ہومیو پیتھک ڈاکٹر کے طور پر پریکٹس کر رہے تھے۔ بسنتی بھی اب سترہ سال کی ہونے کو تھی اور وہ ایک سلائی کے اسکول میں سینا پرونا سیکھ رہی تھی

بھگوان داس کی کہانی سُن کر مجھے بہت دُکھ ہوا۔ مجھے محسوس ہوا کہ میری آنکھیں نمناک ہو گئی ہیں اور میری کمر زیادہ جُھک گئی ہے۔ ایک ہی کمرے کے اس بوسیدہ سے مکان اور اس کے سامان کو دیکھ کر یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ یا تو وہ فیس نہیں لیتے اور یا ان کی ڈاکٹری نہیں چل رہی تھی۔

بھگوان داس کا دکھ میرے مقابلے میں بہت زیادہ تھا۔ لیکن جہاں میرے دکھ نے مجھے زیادہ بوڑھا بنا دیا تھا وہاں بھگوان داس ہر طرح سے باہمت آدمی نظر آتے تھے۔ وہ گھر کا سارا کام پھرتی سے کرتے تھے۔ قریباً آٹھ گھنٹے روز دکان پر بیٹھتے۔ ان کی طبیعت میں بلا کی چُستی تھی۔ اگرچہ وہ عمر میں مجھ سے پانچ چھ برس بڑے تھے مگر دیکھنے میں مجھ سے بڑے نہیں لگتے تھے۔ ان کی طبیعت ہر وقت خوش رہتی۔

ایک روز میں ان کی دوکان پر گیا۔ ایک بڑی بساطی کی دوکان کے برابر خالی جگہ پر، پچھواڑے کی طرف، انہوں نے زمین پر ہی ایک میز کرسی لگا رکھی تھی۔ میز پر ان کی دواؤں کا بکس تھا اور سامنے ایک کرسی مریض کے لئے رکھی ہوئی تھی۔ سامنے دیوار پر ایک تختی لٹکی ہوئی تھی جو یہ ظاہر کر رہی تھی کہ یہ ہومیو پیتھی کے ڈاکٹر ہیں اور انہیں پرانی اور پیچیدہ بیماریوں کے علاج کا خاص تجربہ ہے جس وقت میں پہنچا۔ بھگوان داس اخبار پڑھ رہے تھے۔ مریض کی جگہ میں بیٹھ گیا۔ ان کی آنکھوں میں حسب معمول خوشی کی ایک لو تھی۔ میں ہمدردی کے لہجے میں بولا ”یہاں مریض تو کیا آتے ہوں گے۔“

"آتے ہیں" وہ اطمینان سے مسکرا کر بولے "میرا گزارہ ہو جاتا ہے اور پھر اس جگہ کا کرایہ مجھے کچھ نہیں دینا پڑتا۔"

ان کے چہرے کے اطمینان کی اس سرخی اور ان کی زندگی میں خوشی سے جد و جہد کرنے کے جذبے سے میں متاثر ہوتا گیا۔ وہ اپنی لڑکی پر بھی کافی وقت صرف کرتے تھے اور اسے کسی امتحان کی تیاری کرا رہے تھے۔ بسنتی بہت ہی نیک بچی تھی بھگوانداس کی زندگی پر مجھے رشک آنے لگا اور یہ محسوس ہوا کہ میری الگ تھلگ زندگی ان کی جہد آزما زندگی کے مقابلے میں بہت پست تھی۔ مگر شاید اس فرق میں حالات کو دخل تھا۔ جہاں بھگوان داس کی بچی اور اس سے متعلق ذمہ داری ان کی سرگرمیوں کو جنم دیتی تھی وہاں میں اپنی ذمہ داریوں سے فارغ ہو چکا تھا۔ اتفاق سے میرے لڑکوں کے بھی ابھی کوئی اولاد نہ تھی جو میرے پیار کے تاروں کو جھنجھناتی۔

بھگوان داس بسنتی کی شادی کے لئے کوشش کر رہے تھے۔ ایک جگہ بات بنتی نظر آئی تو وہ کچھ دنوں کے لئے باہر گئے اور بسنتی کو میرے پاس چھوڑ گئے۔ کئی آرام ایک دفعہ پھر میری زندگی کے قریب کھسک آئے اور ایسا محسوس ہوا کہ میری وہ پرانی خواہش کہ میرے بھی کوئی لڑکی ہو، ایک دفعہ تو پوری ہو گئی ہے!

بھگوان داس خوش خوش لوٹے۔ شادی طے ہو گئی تھی۔ لڑکا ریلوے میں ملازم تھا جس کے والد کو میں بھی جانتا تھا۔ لڑکے والوں کا ارادہ شادی جون میں کرنے کا تھا اور ابھی پانچ مہینے باقی تھے۔

بھگوان داس میرے یہاں ہی رہنے لگے۔ میں نے ہی انہیں وہ مکان چھوڑ دینے کا مشورہ دیا جسے انہوں نے مان لیا۔ میرے پاس کافی جگہ تھی اور ان کی صحبت میرے لئے دلچسپی کا باعث بن گئی تھی۔ جیسا کہ میرا خیال تھا، انہیں اپنے پاس بلا کر میں زندگی کے زیادہ قریب ہو گیا اور اس قربت میں ہمت اور خوشی کی ننھی مگر مضبوط لہروں کا سنگم تھا۔

ایک اندھیری اور سرد رات، جب بسنتی سو چکی تھی، میں نے بھگوانداس سے بسنتی کی

شادی کا ذکر چھیڑ دیا۔ میرا یقین تھا کہ بھگوان داس کے پاس روپیہ نہیں ہے اور میں چاہتا تھا کہ اُس کی اِس کام میں کچھ مدد کردوں۔ بھگوان داس میری اس خواہش کو جان کر بولے "میرے پاس پیسہ واقعی نہیں ہے۔ اس پنشن میں روٹی بڑی مشکل سے چلتی ہے۔ جو کچھ تھا لڑکیوں کی شادیوں میں لگ گیا تھا۔ لیکن میں نے ہمت ہارنا نہیں سیکھا ہے۔ میں کچھ نہ کچھ کر کے تھوڑا بہت جمع کرتا رہا ہوں۔ میرے پاس کوئی دو ہزار روپے اور کچھ زیور موجود ہے۔ اگر کچھ ضرورت پڑی تو بعد میں دیکھ لیں گے۔"

اور پھر اسکے دو تین روز بعد ہی ایک شام وہ اپنی دکان کی میز، کرسیاں اور بورڈ اٹھوا لائے۔ دکان نہیں چلی تھی اور میونسپل کمیٹی اب اس جگہ کے استعمال کا کافی کرایہ مانگ رہی تھی بھگوان داس بولے "پریکٹس میں یہیں کیا کروں گا اور میں نے ایک اور انتظام بھی کر لیا ہے۔"

"وہ کیا؟" میں نے پوچھا۔

"کل سے یہاں دس بچے پڑھنے آئیں گے۔ ان کے والدین مجھے پانچ پانچ روپے ماہوار دیں گے۔ میں کئی دن سے اس کام میں لگا ہوا تھا۔ مجھے پڑھانے کا بہت شوق ہے اور ہم بوڑھے بچوں کو بہت اچھا پڑھا سکتے ہیں۔ میری تمنّا ہے کہ بچوں کا ایک اسکول قائم کیا جائے جس میں غریبوں کے بچے مفت بھی پڑھ سکیں۔ آپ کو تو کوئی اعتراض نہیں؟"

مجھے کیا اعتراض ہوتا۔ میں تو خود زندگی کی طرف لوٹنا چاہتا تھا۔ بچّوں کو پڑھانے کی خواہش میرے دل میں بھی جاگ اٹھی۔ ہم اس رات بہت دیر تک باتیں کرتے رہے۔ بھگوان داس جوش میں زور زور سے بول رہے تھے اور میرے دل میں ایک سنہرا احساس ہلکورے لے رہا تھا کہ کل اس گھر کا آنگن کتنی ہی ننھی آوازوں سے گونج اُٹھے گا اور زندگی پھر جنم لے گی۔

اگلے روز جب کھڑکیوں کے باہر صبح پھوٹ ہی رہی تھی، ہم سب جاگ گئے۔ بستی کے منع کرنے پر بھی میں اور بھگوان داس بھی جھاڑو لیکر مکان کو صاف کرنے لگے۔ بھگوان داس مسکرا کر بولے "یہی زندگی ہے۔"

اور جیسے ہمت کی کوئی سوئی ہوئی لہر کروٹ لے، میں نے نوجوانوں کی سی تیزی کے ساتھ بسنتی کے دھوئے ہوئے فرش پر دری بچھائی، جیسے نہ جانے کون آنے گا۔ جیسے شاید خود زندگی آنے گی!

آج کا دن بڑا خراب تھا۔ جاڑوں کا موسم اور پھر بارش۔ صبح سے سورج شاید ہی کبھی دو چار لمحوں کے لئے نکلا ہو۔ کالے اودے سے بادلوں نے آسمان میں لوٹ مچا رکھی تھی اور ٹھنڈی ہوا سائیں سائیں کر کے چل رہی تھی۔ ہر چیز میلی میلی، بھیگی بھیگی سی نظر آرہی تھی۔ ایسے میں سات سالہ شامو سکڑا ہوا اسکول کے دروازے کے باہر کھڑا تھا۔ دوسرے بچے اپنے اپنے گھر چلے گئے تھے مگر وہ اپنی ماں کے انتظار میں یہاں کھڑا تھا۔

شامو اور اس کی ماں اس شہر میں نئے نئے آئے تھے۔ اس اسکول اور ان کے گھر کے درمیان کئی سڑکیں اور بازار آتے تھے اور شامو کی ماں شامو کے بارے میں کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتی تھی۔ وہ ہر روز شامو کو اسکول چھوڑتے اور اسکول سے لینے آتی تھی۔ آج اسے کچھ دیر ہو گئی تھی۔

شامو کھڑا کھڑا سامنے والے اسکول کے دروازے پر کھڑی ہوئی کاروں کو دیکھ رہا تھا۔ وہ اسکول اس کا نہیں تھا، کیوں کہ اس میں زیادہ تر وہ بچے پڑھتے تھے جن کے والدین چھٹی ہونے پر انہیں کاروں میں لینے آتے تھے، یا جو اسکول کی بس میں لوٹتے تھے۔ شامو ننگے پاؤں پانی کے ایک چھوٹے سے گڑھے میں کھڑا پاؤں سے چھپ چھپ کر رہا تھا۔ بارش اب تقریباً تھم گئی تھی۔ مگر ٹھنڈی ہوا اس کے جسم میں سوئیاں سی چبھو رہی تھی۔ اس نے گردن موڑ کر اس سڑک میں

جھانکا جدھر سے ماں آتی تھی۔ اور ماں کو آتا ہوا دیکھ کر اس کا بھیگا ہوا چہرہ بھی تمتما اٹھا۔ وہ وہیں سے دوڑا اور جا کر ماں کی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔ ماں نے اس کے بھیگے ہوئے چہرے کو چوم لیا اور اسے اپنی چھتری کے نیچے کر لیا۔ ماں کو دیر اس لئے ہو گئی تھی کیوں کہ چھتری پھٹی ہوئی نکلی اور وہ اسے سینے بیٹھ گئی تھی۔

وہ دونوں ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ کاریں اور بسیں ان کے اوپر پانی اچھالتی ہوئی پاس سے گزر رہی تھیں۔ شامو چپ چاپ چل رہا تھا۔ اس کی ماں کو ایسا محسوس ہوا، شامو کچھ سوچ رہا تھا اور اداس سا تھا۔

"شامو"، ماں نے پوچھا۔ "تو آج اتنا اداس کیوں ہے۔ کیا اسکول میں مار پڑی ہے؟"

"نہیں"، شامو بولا۔ "لیکن ماں مجھے یہ اسکول پسند نہیں ہے۔ ہمارا یہ نیا گھر بھی اچھا نہیں ہے۔ یہاں کوئی ہم سے نہیں بولتا۔ جہاں دادی رہتی ہے وہ گھر کتنا اچھا تھا!"

"شامو ہمارے پڑوسی تو بہت اچھے ہیں لیکن ہم ابھی نئے نئے تو آئے ہیں۔ آہستہ آہستہ واقفیت ہو جائے گی تو سب ہم سے بولیں گے۔ اور اس اسکول کی پڑھائی تو بہت اچھی ہے اور کیا تو یہاں بچوں سے نہیں کھیلتا؟"

"ماں کھیل کے گھنٹے میں سب گیند کھیلتے ہیں۔ مگر مجھے کوئی نہیں کھلاتا۔ کیونکہ میرے پاس جوتے نہیں ہیں۔"

"میں تمہیں جلدی ہی جوتے لا دوں گی اور کپڑے کے جوتوں کی بجائے اب کے چمڑے کے جوتے لا دوں گی۔ بس دو چار دن کی بات ہے۔"

اور یہ کہنے کے بعد شامو کی ماں نے اپنے گالوں کو بھیگا بھیگا سا محسوس کیا۔ اور یہ بھیگا پن بارش کے قطروں کا نہیں تھا۔

وہ جانتی تھی کہ جوتے کے بغیر اس کے بچے کو کتنی تکلیف تھی۔ کپڑے کے جوتے اب کے کچھ بھی نہیں چلے تھے۔ اس نے بڑے دکھ کے ساتھ محسوس کیا کہ پچاس روپے ماہوار میں جو اسے اس نئی جگہ میں ملتے تھے وہ مشکل سے اپنا اور

شامو کا پیٹ پال رہی تھی، اور اگرچہ وہ شامو کی کتابیں اور کاپیاں تو کچھ نہ کچھ کر کے لے لیتی تھی، مگر کپڑوں اور جوتوں کے لئے تو پیسے بالکل نہیں بچتے تھے۔

وہ پھر بولی ـــ "میں سوچ رہی ہوں کہ اب کے تیرے دو جوڑے جوتے خرید لوں۔ ایک چمڑے کا اور ایک کپڑے کا۔ گیند کھیلنے کے لئے کپڑے کے جوتے اچھے رہیں گے۔"

اور شامو نے سر ہلا دیا۔ اُسے بھوک لگ رہی تھی اور وہ اداس بھی تھا۔ اس کی وجہ سے ماں کو کتنی تکلیف ہو رہی تھی۔ دادی کے گھر میں تو اسے پھر بھی کتنا آرام تھا۔ کیوں کہ اس کی چھوٹی چھوٹی چیزیں یعنی پتنگ اور گیند وغیرہ تو دادی ہی لا دیتی تھی۔ لیکن یہاں اس نئے شہر میں اس کی کتنی ہی خواہشیں پوری نہیں ہو رہی تھیں۔

بارش اب بالکل بند ہو گئی تھی، اور سورج بھی بادلوں کی اوٹ سے نکل آیا تھا۔ شامو کی ماں نے چھتری بند کر دی۔ سورج کی کرنوں میں ایک خوش گوار گرمی تھی اور ہوا بھی اب کچھ کم ہو گئی تھی۔ شامو کی ماں ایک ریڑھی والے سے شام کے لئے سبزی لینے لگی۔ جب وہ سبزی خرید کر آگے بڑھ رہے تھے تو شامو کی ماں کو سامنے سے آتی ہوئی ڈاکٹر کی بیوی نظر پڑی۔ یہ ڈاکٹر ان ہی کی کوٹھیوں کی لائین میں آخر میں رہتا تھا اور شامو کی ماں نے آتے جاتے ڈاکٹر اور اسکی بیوی کو کئی مرتبہ دیکھا تھا۔ شاموں کی ماں نے نیچی نظر کر کے گزرنا چاہا۔ مگر ڈاکٹر کی بیوی رک کر بولی۔

" تم سات نمبر میں کام کرتی ہو نا؟ "

" جی ہاں! "

" تمہارا لڑکا سچ مچ بڑا پیارا ہے۔ کیا نام ہے اس کا؟ "

" شامو۔ "

" شامو تو ہوشیار بھی معلوم ہوتا ہے۔ کیا یہ پڑھتا ہے؟ "

" جی ہاں اب اسکول سے ہی آ رہا ہے "

" تم اس سے پہلے کہاں کام کرتی تھیں ؟ "

" میم صاحب ہم تو باہر سے آئے ہیں دھام پور سے۔ میرے پتی ڈاکخانے میں تھے۔ مگر جب شامو بہت چھوٹا ہی تھا۔ وہ چل بسے تھے۔ گھر میں کوئی مددگار نہیں تھا۔ سوچا گھروں میں کام کر کے اپنے پاؤں پر کھڑی ہو جاؤں۔ "

" یہ تو بہت ہی اچھی بات ہے۔ جہاں تم کام کرتی ہو وہ بہت اچھے آدمی ہیں۔ تمہیں وہاں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ " یہ کہہ کر ڈاکٹر کی بیوی چلی گئی۔ شامو کی ماں شامو کو لے کر جلدی سے گھر پہونچی، کیوں کہ اسے تین بجے پھر کام پر جانا تھا اس نے شامو کو روٹی دی اور جلدی سے تیار ہو کر اپنے کام پر چل دی۔ وہ کوئی سات بجے کام سے لوٹی۔

شامو کی وجہ سے شامو کی ماں کو ہر روز سات بجے چھٹی مل جاتی تھی اور صبح بھی وہ روٹی بنا کر اور شامو کو اسکول چھوڑ کر نو بجے تک جا سکتی تھی۔ اُس نے آگ سلگائی اور توا رکھنے ہی والی تھی کہ دروازے پر کسی نے آہستہ سے دستک دی۔ اس نے دروازہ کھولا تو ڈاکٹر کی بیوی کو دروازے پر کھڑا پایا۔ اس کے ہاتھ میں اخبار کے کاغذ میں لپٹا ہوا ایک چھوٹا سا پیکٹ تھا۔ وہ شامو کی ماں کو دیکھ کر مسکرائی اور بولی۔

" میں بیٹھوں گی نہیں، شامو کہاں ہے ؟ "

" میم صاحب اندر ایک منٹ کے لئے تو آئیے نا۔ شامو بھی بیٹھا ہے۔ آپ نے اس ٹھنڈ میں بڑی تکلیف کی۔ "

ڈاکٹر کی بیوی اندر چلی آئی اور چارپائی پر بیٹھ گئی۔ اخبار کا پیکٹ کھولتے ہوئے بولی۔

" میں یہ لائی تھی کہ شاید شامو کے آجائیں۔ یہ نیرج کے چھوٹے ہو گئے ہیں اور مجھے ایسا لگتا ہے کہ شامو کے بالکل ٹھیک آجائیں گے۔ یہ تو ویسے پہننے کے بوٹ ہیں اور یہ فٹ بال کے جوتے ہیں۔ نیرج نے انہیں بہت ہی کم پہنا ہے۔ بچوں کے پاؤں تم جانتی ہو جلدی بڑھ جاتے ہیں۔ مجھے چیز کا پھینکنا اچھا

نہیں لگتا۔"

اچانک شامو کا چہرہ چمک گیا۔ جوتے تقریباً نئے تھے۔ اس نے حیرانی سے ڈاکٹر کی بیوی کی طرف دیکھا اور پوچھا۔

"مگر نیرج مجھے گیند کھلائے گا؟"

"کیوں نہیں وہ تو آج بھی کہہ رہا تھا۔ اُس نے تو اپنی پوری ٹیم بنائی ہوئی ہے۔ کل سے تم بھی کھیلنا۔"

ٹھنڈے فرش سے بیگانہ شامو نے وہیں نیچے بیٹھ کر جوتے پہننے شروع کر دیئے۔ دونوں جوتے اس کے بالکل ٹھیک آ گئے تھے ___ وہ کھڑا ہو گیا وہ کمرے میں دوڑنا چاہتا تھا ___ اور سب سے زیادہ تو وہ کسی گیند کو ٹھوکر مارنا چاہتا تھا۔

اس کی ماں اس میں یہ تبدیلی، یہ تڑپ دیکھ کر خوش ہو رہی تھی۔ اس خوشی میں سورج کی کرنوں سے بھی زیادہ گرمی تھی، اور اس کے دل میں ایک حرارت اور مسرت بھر گئی۔ وہ آہستہ سے بولی۔

"آپ نے میرے بچے کو اور مجھے یہ خوشی دے کر کتنی مہربانی کی ہے۔"

"نہیں بالکل نہیں۔" ڈاکٹر کی بیوی اٹھتے ہوئے اور اپنی شال کو کندھوں کے گرد لپیٹتے ہوئے بولی۔ "اس میں مہربانی کی کیا بات ہے۔ بچوں کی چیزیں چھوٹی ہو جائیں تو دوسروں کو دے ہی دیتے ہیں۔ شامو کے اگر کوئی چیز چھوٹی ہو جائے گی تو تم بھی شاید ایسا ہی کرو گی۔ اچھا اب میں چلتی ہوں۔ نیرج کا ایک چھوٹا کوٹ بھی ہے کل دیکھ کر بھیج دوں گی۔" یہ کہہ کر ڈاکٹر کی بیوی مسکرائی اور آہستہ سے دروازہ بند کرتی ہوئی باہر چلی گئی۔

شامو خوشی اور حیرت کے ملے جلے جذبات میں جکڑا کھڑا تھا۔ وہ یہ خیال بھی نہیں کر سکتا تھا کہ اس کی خواہش اتنی جلدی پوری ہو جائے گی۔ وہ ڈاکٹر کی بیوی کے بارے میں سوچنے لگا۔ مگر پھر اس نے اپنے بوٹوں کو دیکھا ___ وہ

ان میں کتنا چُست لگ رہا تھا ___ وہ ٹھپ ٹھپ کر کے وہیں کودنے لگا۔ کاش یہ اسکول کا وقت ہوتا۔ وہ فٹ بال کے بوٹ پہنے ہوئے تھا۔ اور پورے جوش اور بھروسے کے ساتھ گیند کو ٹھوکر مار سکتا تھا۔

اور شامو کی ماں ابھی تک حیران سی کھڑی دروازے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس نے اُچھلتے کودتے شامو کی طرف دیکھا اور اسے گود میں اٹھا کر چوم لیا۔ پھر وہ دروازے کی طرف بڑھی اور اسے کھول کر باہر برآمدے میں آ گئی۔ وہ خلا میں جھانک رہی تھی۔ باہر اندھیرے کے باوجود محسوس ہوا جیسے کوئی فرشتہ ابھی ابھی آ کر گیا ہے اور راستہ کو منوّر کر گیا ہے۔ اس نے سامنے دیوار کے ساتھ ساتھ کھڑے ہوئے درختوں کے جھنڈ کو دیکھا۔ اور ان کے پیچھے شامو کے اسکول کی سخت اور ٹھنڈی عمارت کو محسوس کیا، آسمان میں بادلوں کا نشان تک نہ تھا اور ایک نیا منہ دھلا چاند نیلی گہرائیوں میں جھول رہا تھا، کل کی صبح کتنی نئی ہوگی۔ کل سورج چمکے گا" اور شامو اپنے بوٹ پہنے ہوئے اکڑ اکڑ کر اسکول جائے گا۔

کہکشاں

جس وقت میں نے ریل کے اسٹیشن سے باہر قدم رکھا۔ میرا بچپن لوٹ آیا اور میں نے دل میں ایک ان جانی سی تھرک محسوس کی۔ میں اسی چھوٹے سے شہر میں پیدا ہوا تھا اور اسی کی مٹی، گرد و غبار اور ہواؤں میں میری زندگی کے اٹھارہ سال بیتے تھے۔ تقریباً اتنے ہی برس ہوئے ہم نے اس شہر کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ دیا تھا اور اب اس کے بعد میرا یہاں آنے کا یہ پہلا اتفاق تھا۔ برسوں بچپن کے دوست اور اپنے گلی محلے یاد آتے رہے اور وقت کی سرد مہری اور بے پناہ مصروف زندگی نے بھی اس یاد کو نہیں بھلایا۔ بلکہ کبھی کبھی تو یہ یاد آنکھوں میں آنسو لے آتی تھی اور بے اختیار جی چاہتا کہ جاؤں اور دیوانہ وار انہی گلیوں میں گھوموں، ان گھروں اور دیواروں کو دیکھوں جنہیں دل کی آنکھ ابھی تک دیکھتی تھی۔ لیکن جہاں یہ جذباتی لمحے بیت جاتے، مصروف زندگی کی چکی پھر چلنے لگتی اور یہاں آنے کی خواہش اس سے پہلے پوری نہ ہو سکی۔ اس بار بھی مجھے ایک کام سے آگے جانا تھا اور چونکہ میرا یہ شہر راستے میں پڑتا تھا میں یہاں اتر پڑا تھا۔

اگرچہ ایک دو دور پار کے رشتے دار یہاں ابھی تک تھے لیکن میرے لئے ان سے ملنے کی کوئی ایسی کشش نہیں تھی۔ میں یہ بھی جانتا تھا کہ بچپن کے

سب ساتھی بھی اِدھر اُدھر چلے گئے تھے اور شاید ہی کسی دوست سے ملاقات ہو مگر میں تو اپنے در و دیوار اور گلی کوچوں سے ملنے آیا تھا۔ میرا یہ عقیدہ تھا کہ ان کی بھی اپنی ایک ہستی، ایک وجود ہے اور وہ بھی ایک دل رکھتے ہیں۔ ابھی کوئی آٹھ بجے تھے اور میں دوپہر کو دو ڈھائی بجے تک لوٹ کر تین بجے کی گاڑی سے آگے چلا جانا چاہتا تھا۔ میں نے اِدھر اُدھر جھانک کر دیکھا، بالکل سب کچھ وہی تھا، سب کچھ ویسا ہی۔ میں اپنے جانے پہچانے راستے پر پیدل ہی چل دیا کیونکہ شہر ہی کتنا بڑا تھا اور تانگے پر بیٹھ کر میں ان لمحوں کو تیزی سے گزارنا نہیں چاہتا تھا۔ ایک ٹھنڈی خوشگوار ہوا چل رہی تھی اور میں بچپن کے ذہن اور سبک قدموں کے ساتھ دونوں طرف سب کچھ دیکھتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔ کچھ نئے مکان اور دکانیں بن گئی تھیں مگر راستے اور بازار وہی تھے، لوگوں کی بھیڑ نئی تھی مگر اس سے کیا، میں تو انہی راستوں سے ملنے آیا تھا۔

بازاروں اور سڑکوں پر سے ہوتا ہوا، ہر چیز کو دیکھتا اور پہچانتا ہوا میں اپنے محلے میں پہنچ گیا اور ایک ان جانی خوشی اور جوش نے مجھے جکڑ لیا۔ ہاں یہی وہ پُل تھا، اور اب بھی اسی طرح ٹوٹا ہوا، جس پر بیٹھ کر اور کھیل کر نہ جانے زندگی کے کتنے پل، کتنی گھڑیاں بیت گئی تھیں۔ وہ سامنے نل، اب بھی وہیں تھا اور آج بھی اسی طرح اس پر برتن ایک لمبی قطار میں رکھے ہوئے تھے اور ویسی ہی بھیڑ تھی۔ مگر میں نے غور سے دیکھا اس بھیڑ میں میں کسی کو نہیں پہچانتا تھا۔ میں ایک ان جانے جذبے کے تحت اس پل پر بیٹھ گیا اور میرے تصوّر میں اس پُل پر میرے ساتھ میرے بچپن کے ساتھی رہتو، چندر اور مول چند بیٹھ گئے۔ میں چند منٹ اس پُل پر بیٹھا اور پھر اس کے نیچے نالے میں سے ہوتا ہوا باہر نکل آیا۔ جیسا کہ میں بچپن میں اکثر کیا کرتا تھا۔

اس محلے کی ساری گلیاں، مکان وغیرہ ویسے ہی تھے مگر ان میں بسنے والے بدل گئے تھے۔ کچھ پرانے رہنے والے ابھی تھے مگر انہیں بھی وقت کے بے رحم ہاتھ نے بدل دیا تھا۔ جو چھوٹے تھے وہ بڑے ہو گئے تھے، جو بڑے تھے وہ

بوڑھے ہو گئے تھے اور کچھ مجھے پہچانتے تھے اور کچھ نہیں۔ جو جانتے تھے انہوں نے بڑی محبت کا اظہار کیا اور مجھے کھلایا پلایا۔ وقت سب کچھ مٹا دیتا ہے مگر محبت کے جذبے کو فنا نہیں کر سکتا اور یہ بات مجھے اپنے محلّے میں گھوم پھر کر اور سب سے مل کر زیادہ شدّت سے محسوس ہوئی۔ مجھے سب سے مل کر بے حد مسرّت ہو رہی تھی مگر دکھ یہ تھا کہ بچپن کے دوست ملازمت اور کام کے سلسلے میں یہاں سے چلے گئے تھے۔ ایک آدمی سے بات چیت کر کے یہ پتہ لگا کہ ہمارا ایک ساتھی اختر یہاں ہی ہے، اور اس نے کوتوالی کے پاس چائے کی دکان کر رکھی ہے۔ اختر بھی ہمارے بچپن کے ساتھیوں میں سے تھا اور میرے دل میں اس سے ملنے کی خواہش بھڑک اٹھی۔

پہلے میں اپنی گلی میں گیا اور دیر تک اپنے مکان کے آگے کھڑا رہا۔ اس مکان میں اب کوئی اور رہتا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر غیر ارادی طور پر اپنا ہاتھ بند دروازے پر رکھ دیا اور مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے بچپن کی بچھڑی دودھیں مل گئی ہوں۔ میری آنکھیں نم ناک سی ہو گئیں اور میں نے مڑ کر اپنے ارد گرد دیکھا۔ ہمارے سامنے اٹھارہ برس پہلے جو ایک ٹوٹے ہوئے مکان کا کھنڈر تھا، جس میں ہم آنکھ مچولی کھیلتے ہوئے چھپا کرتے تھے آج بھی موجود تھا۔ میں اس کھنڈر میں سے ہوتا ہوا دوسری گلی میں نکل آیا اور اس میں سے گزر کر پیچھے کی طرف سڑک پر آ گیا۔ یہاں وہ دو دکانیں تھیں جن پر میں اکثر آیا کرتا تھا۔ ایک برجو حلوائی کی، جس سے میں برفی خریدتا تھا اور دوسری بالی پرچون والے کی، جس کے گڑ کے شکر پارے بڑے مزے دار ہوتے تھے۔ برجو کی دکان اب وہاں نہیں تھی اور مجھے پتہ لگا کہ وہ مر گیا تھا۔ بالی جو اب بوڑھا ہو گیا تھا، بدستور بیٹھا تھا اور اس کی دکان بالکل ویسی ہی تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر دو آنے کے شکر پارے مانگے اور اس نے بغیر مجھے پہچانے اسی کونے میں سے اور شاید اسی ڈبے میں سے نکال کر دے دئے۔ میں سوچنے لگا کہ زندگی کہیں جوں کی توں موجود ہے اور کہیں اس طرح مٹ جاتی ہے جیسے برجو کی دکان۔

میں یہاں سے سیدھا کوتوالی کی طرف اختر سے ملنے چلا گیا۔ اختر ایک غریب لڑکا تھا اور بچپن میں وہ انگریزوں کی کوٹھیوں میں بوٹ بوائے یعنی بوٹ وغیرہ صاف کرنے اور بہرے کی مدد کرنے کا کام کیا کرتا تھا۔ مگر بچپن میں امیری غریبی اور اونچ نیچ کا تصور کسے ہوتا ہے۔ اختر ہمارے اچھے دوستوں میں سے تھا۔ مجھے اس کی دکان آسانی سے مل گئی۔ وہ مجھے دیکھتے ہی پہچان گیا اور دوڑ کر اور میرا بچپن کا نام لے کر مجھ سے لپٹ گیا۔ میری مسرت کا ٹھکانہ نہ رہا اور ہم کچھ لمحوں کے لئے ایک دوسرے سے لپٹے رہے۔ کتنی گرمی اور پیار اس ملاپ میں تھا، اِسے صرف محسوس کیا جاسکتا ہے۔ میں دکان میں بیٹھ گیا اور چائے پینے کے بعد ہم کافی دیر تک ایک دوسرے سے بات کرتے رہے۔ میں نے اُسے کلکتہ آنے کے لئے کہا۔ بچپن کی باتوں اور ساتھیوں کے ذکر نے مجھے ایک اور ہی دنیا میں پہنچا دیا۔

اختر اپنی دکان بند کرنے لگا اور بضد ہوا کہ میں اس کے ساتھ اس کے گھر چلوں اور کھانا کھاؤں۔ مجھے ڈر تھا کہ اگر اختر کے گھر گیا اور کھانا وغیرہ کھایا تو تین بجے کی گاڑی نہ پکڑ سکوں گا، مگر اس کے گھر جانے کی خواہش کی بھی مزاحمت نہ کر سکا۔

اختر کی بیوی اور بچوں سے مل کر مجھے بے حد خوشی ہوئی۔ میں اس کے گھر کوئی دو گھنٹے رہا اور اس اثنا میں ہم نے اپنے سب دوستوں کی باتیں کیں۔ اب میں چھ بجے کی گاڑی سے ہی جا سکتا تھا، اس لئے کوئی ایسی جلدی بھی نہیں تھی۔ باتوں ہی باتوں میں اختر نے ایک اور دوست مُنّا کا ذکر کیا اور بتایا کہ وہ تو اب اس شہر کا ایک بڑا بزنس مین ہے اور بہت امیر ہو گیا ہے۔ میں نے اس سے بھی ملنے کی خواہش ظاہر کی اور اختر فوراً میرے ساتھ چل پڑا۔ ہم دونوں مُنّا کے محل کی طرح لمبے چوڑے مکان میں جھجکتے ہوئے داخل ہوئے۔ مُنّا موجود تھا اور مجھے دیکھتے ہوئے مجھ سے بغل گیر ہو گیا۔ اس نے بڑی پُر تکلف چائے پلائی اور ہم تینوں نے ہنس ہنس کر بچپن کے بہت سے لمحات ایک دفعہ پھر گزار دئے۔

جس وقت ہم مُنّا کے مکان سے لوٹ رہے تھے تو ایک بڑے پکّے

مکان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اختر بولا۔

"یہ چندا کا مکان ہے۔ یاد ہے کچھ؟"

"کون چندا؟"

"وہی جیون کی لڑکی۔"

"ارے وہ چندا۔ شادی ہوگئی تھی اس کی؟"

"ہاں اس کے تو اب کئی بچے ہیں اور شوہر بھی اتنا خوبصورت ملا ہے کہ کسی کو کیا ملے گا۔ یہ مکان انہوں نے ابھی بنوایا ہے۔"

میں وہیں کھڑا ہوگیا۔ چندا ہماری گلی کی لڑکی تھی اور ہم سب اسے جانتے تھے۔ دس برس کی عمر تک تو وہ ہمارے ساتھ ہی کھیلتی رہی تھی۔ پرماتما نے اسے بڑا بدصورت بنایا تھا اور اس کی ایک آنکھ میں بھی نقص تھا۔ اس کے ماں باپ نے اس کی شادی کی بڑی کوشش کی تھی لیکن ہمارے ہوتے ہوئے تو ان کی یہ کوشش کامیاب نہیں ہوئی تھی، اگرچہ ان دنوں لڑکی کو دیکھنے دکھانے کا بھی کوئی خاص رواج نہیں تھا۔ میری نظروں کے سامنے وہ دن گھوم گیا جب چندا اور اس کی ماں ہمارے گھر آئے ہوئے تھے اور میری ماں نے ایک پنڈت کو بلوا رکھا تھا جسے سب عورتیں اپنا ہاتھ دکھا رہی تھیں۔ چندا کی ماں نے چندا کو آگے دھکیل کر اس کا ہاتھ بھی پنڈت جی کے آگے کر دیا تھا۔ اور پنڈت جی نے اس کا ہاتھ دیکھتے ہی کہا تھا کہ اس کی قسمت کا ستارہ تو بہت اونچا ہے۔ اور پنڈت جی کی بات سنتے ہی ساری عورتیں کھل کھلا کر ہنس پڑی تھیں۔ چندا جیسی بدصورت لڑکی کا جس کے ساتھ کوئی بھی شادی کرنے کو تیار نہیں تھا، قسمت کا ستارہ کیسے اونچا ہو سکتا تھا؟ مگر ان ہنسنے والی عورتوں میں میری ماں اور چندا کی ماں شامل نہیں تھیں اور انہوں نے پنڈت جی کی بات پر یقین سا کر لیا تھا۔ میں نے چندا سے ملنا چاہا اور ہم دونوں اس کے گھر کی طرف بڑھے۔ اختر نے دروازہ کھٹکھٹایا جو چندا نے ہی کھولا۔ وہ مجھے فوراً پہچان گئی اور بڑی خوش ہوئی۔ وہ ہمیں اندر لے گئی اور ہمارے منع کرنے پر بھی اس نے چائے کا پانی چڑھا دیا۔ جب وہ ہمارے پاس

بیٹھی تو مجھے یہ محسوس کرنے میں دیر نہیں لگی کہ اس کی زندگی واقعی خوشی سے بھرپور تھی۔ اس نے اپنے الھڑ سے انداز میں میرا نام لے کر پوچھا۔

" تمہاری شادی ہو گئی ؟ "

میں ہنس پڑا اور بولا۔

" ہم سب ایک ہی عمر کے ہیں۔ سب کی شادی ہو گئی تو میری کیسے نہ ہوتی۔ میرے تو اب تین بچّے ہیں۔ "

وہ مسکرادی اور بولی۔

" بالکل ویسے ہی لگتے ہو جیسے چھوٹے سے تھے۔ تم بہت کم بدلے ہو۔ "

ہم چندا کے یہاں کچھ دیر بیٹھے۔ چندا کے پتی سے میری ملاقات نہ ہو سکی کیونکہ وہ اپنے کام پر گیا ہوا تھا مگر چندا سے مل کر جو خوشی ہوئی تھی وہ بیان نہیں کر سکتا۔ پرماتما نے ایک بدصورت لیکن دل کی نیک لڑکی کو اس کی تمام خوشیاں دے دی تھیں۔

اختر اور اس کا چھوٹا بھائی شکیل مجھے اسٹیشن تک چھوڑنے آئے۔ میری ٹرین روانہ ہوئی تو اختر دیر تک اپنا رومال ہلاتا رہا اور میں کھڑکی میں سے گردن نکال کر اور ہاتھ ہلا کر اپنے بچپن کو الوداع کہہ رہا تھا۔ میری آنکھیں ایک دفعہ پھر نمناک ہو گئی تھیں اور میں سوچ رہا تھا کہ یہ زندگی اس ٹرین کی طرح تیزی سے گزرتے اور بہنے والی ہے۔ در و دیوار اور گلی کوچے انسانی زندگی سے زیادہ پائیدار ہیں، لیکن محبّت اور خلوص کا جذبہ لافانی ہے۔ یہی جذبہ زندگی کی دھند میں چمکنے والا روشن ستارہ ہے اور ایسے ان گنت ستاروں کی کہکشاں اس دھرتی پر بھی جھلملاتی ہے !

اس دنیا میں بعض مرتبہ دوسرے بھی ایسے اپنے بن جاتے ہیں کہ یہ خیال ہونے لگتا ہے کہ پیار کا رشتہ شاید جنم جنم سے چلا آتا ہے۔ ایسا ہی پیار کا رشتہ میرے بچے ڈمپی اور اس چھوٹی سی لڑکی توشی کے درمیان تھا۔ جس سے ہمارا کوئی خون کا رشتہ نہیں تھا۔ توشی اور ڈمپی کو ایک دوسرے کو دیکھے ہوئے تقریباً ایک سال ہو گیا ہے۔ مگر چھوٹا سا بچہ ہوتے ہوئے بھی ڈمپی ابھی اپنی آنٹی توشی کو نہیں بھولا ہے۔ کئی سو میل کے فاصلے نے انہیں نظروں سے تو دور کر دیا ہے، مگر دل کی آنکھوں سے وہ ایک دوسرے کو ضرور دیکھ لیتے ہیں۔ ڈمپی کے بارے میں تو میں جانتا ہوں کہ اس نے اپنی ماں کی گود میں سوتے ہوئے بھی اچانک جاگ کر اپنی آنٹی کو پکارا ہے ـــــ اور اس کی چھوٹی سی آنٹی کی تڑپ ان پوسٹ کارڈوں سے ظاہر ہے جو ہر ہفتے آتے رہتے ہیں اور اس ڈمپی کے نام ہوتے ہیں، جو انہیں پڑھ بھی نہیں سکتا۔

توشی اب چودہ برس کی ہو گی۔ لیکن پہلی بار میں نے اسے، کوئی نو سال ہوئے اپنی شادی کے موقعے پر دیکھا تھا۔ وہ محلے کی ایک لڑکی تھی اور شادی کی بھیڑ میں گلی محلے کے پچاسوں بچوں میں، جو اس موقعے پر اُمڈ آتے ہیں وہ بھی شامل تھی۔ مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ ایک تقریب میں ایک خوب صورت بھولی بھالی سی بچی میرے بہت قریب آکر

کھڑی ہو گئی تھی اور مجھے اور میرے دولہا والے کپڑوں کو حیرت سے دیکھ رہی تھی۔ مجھے وہ اتنی اچھی لگی تھی کہ میں نے اسے پکڑنا چاہا تھا، مگر وہ بھاگ گئی تھی۔ اس کے بعد شادی کے ان دو دنوں میں وہ بیسیوں مرتبہ آئی ہو گی۔ اور ایک دو دفعہ میں نے چند بچوں کے درمیان اس سے بات بھی کی اور اس کا نام پوچھا۔ اس وقت وہ کوئی پانچ سال کی ذہین مگر شرمیلی بچّی تھی۔

یہ شادی کے ہنگامے کی بات تھی، میں بھول بھی گیا۔ شادی کے بعد میں اپنی سسرال جاتا رہا۔ لیکن گھر میں آنے والے بچّوں میں توشی نظر نہ آئی، اور نہ میں نے اُس کے بارے میں پوچھا۔ لیکن ایک ایسے ہی موقعے پر جب گھر میں کچھ چھوٹے بچّے ناچ اور گا رہے تھے، مجھے یکایک توشی کا خیال آیا، اور میں نے فوراً پوچھا کہ وہ چھوٹی سی بچی توشی کہاں ہے۔ پتہ لگا کہ شادی کے دو ماہ بعد ہی ان لوگوں کا تبادلہ کسی اور جگہ ہو گیا تھا اور انہیں گئے ہوئے دو تین سال ہو گئے تھے۔

اس کے بھی کئی سال بعد کی بات ہے۔ میں دفتر سے گھر آیا تو اپنی بیوی کو ایک دس گیارہ سال کی لڑکی سے بات کرتے ہوئے پایا۔ میری بیوی میرے داخل ہوتے ہی بولی۔ "آپ اسے پہچانتے ہیں؟"

"نہیں تو۔" میں سوچتے ہوئے بولا۔

"یہ توشی ہے، وہی چھوٹی سی لڑکی، جو شادی کے وقت آپ کے پاس بہت آتی تھی اور جس کے بارے میں آپ نے ایک دفعہ پوچھا بھی تھا۔"

میں نے نظر اٹھا کر دیکھا، بچپن کی اُس بھولی توشی اور اب ذرا بڑی توشی میں کوئی فرق نہیں تھا۔ بس جیسے کسی چھوٹی سی تصویر کو کسی نے بڑا بنا دیا تھا۔ ویسی ہی خوبصورت دبلی پتلی، شرمیلی اور بھولی بھالی۔

میری بیوی بولی۔ "ان کا تبادلہ یہیں کا ہو گیا ہے اور یہ پرسوں ہی یہاں آئے ہیں۔ ہمارے پیچھے کی گلی میں جو کونے کا مکان خالی تھا، اسی میں آئے ہیں۔ ان کے پتاجی بھی ابھی آئے تھے۔ ان کے کوئی دوست آ گئے تھے تو وہ چلے گئے۔ میں نے توشی کو روک لیا

ٹھہر کر چلی جائے گی۔ دیکھا آپ نے، اب تو یہ بڑی ہو گئی ہے۔ چھٹی میں پڑھتی ہے، کیسی گڑیا سی تھی چھوٹی سی مجھے بازار میں اِدھر اُدھر مل جاتی تو شاید پہچان بھی نہ سکتی۔"

یہ ڈمپی کی پیدائش سے پانچ چھ مہینے پہلے کی بات ہے۔ توشی میری بیوی سے کافی گھل مل گئی تھی اور وہ اپنا کافی وقت ہمارے یہاں ہی گزارتی تھی۔ وہ اپنی کتابیں لے کر میری بیوی کے پاس ہی چلی آتی اور وہیں بیٹھی پڑھتی رہتی ہمارا اور ان کا آپس میں بڑا ہی میل ہو گیا۔ بلکہ ڈمپی کے ہونے کا وقت آیا تو توشی کی ماں نے پوری مدد کرنے کا وعدہ کیا اور اس وعدے کو توشی کی ماں اور توشی نے اس طرح نبھایا جیسے صرف اپنی ماں اور بہن ہی نبھا سکتی ہے۔

ڈمپی ہماری شادی کے کئی سال بعد ہوا تھا۔ اس لئے قدرتی طور پہ ہماری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ اس خوشی میں توشی اور اس کی ماں بھی شریک تھیں۔ توشی بھی اپنے گھر میں اکیلی ہی تھی، اور ڈمپی کے ہونے پر اس نے بالکل ایک بھائی کے ہونے کی خوشی محسوس کی۔ مجھے آج بھی وہ دن یاد ہیں جب اس نے اپنی پڑھائی کا حرج کر کے دن رات ہمارے گھر میں بے حد کام کیا تھا۔ چھوٹی سی لڑکی ہوتے ہوئے بھی اس نے بڑی عورتوں کی طرح تقریباً سارا گھر ہی سنبھال لیا تھا۔ وہ دن رات ڈمپی کو لئے بیٹھی رہتی ۔۔ اس گڑیا سے بچّے کے ساتھ جس کی آنکھیں بھی شاید اسے پورا نہیں دیکھ سکتی تھیں، وہ گھنٹوں کچھ نہ کچھ بولتی رہتی تھی۔ پھر ایک روز توشی نے ڈمپی کو اس کا یہ نام دے دیا۔ وہ کہنے لگی کہ جب یہ ہنستا ہے تو اس کے ننھے سے گال میں ایک گڑھا پڑ جاتا ہے اور مجھے اس کا نام ڈمپی پسند ہے۔ توشی کی پسند ہم سب کی پسند ہو گئی اور سندیپ کا دوسرا نام ڈمپی ہو گیا۔

وقت ہنسی اور خوشی کی بھرپور چھلانگیں مارتا گزر رہا تھا۔ توشی کی گود میں اُچھلتا کودتا اور ہنستا چیختا ڈمپی بھی بڑھتا رہا جوں جوں وہ بڑھتا رہا وہ بہت ہی خوبصورت بچّہ بنتا گیا۔ اور ایک روز میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ توشی اور ڈمپی کے چہرے کے خدوخال بہت حد تک ایک دوسرے سے ملتے تھے۔ نہ جانے قدرت کے

کون سے اصول نے ڈمپی کو توشی کے چہرے کی گولائی اس کے نقش، خوب صورتی اور بھولاپن دے دیا تھا۔ پھر مشابہت کا یہ خیال زیادہ مضبوط ہوتا گیا۔ اور توشی اور ڈمپی بالکل بھائی، بہن لگنے لگے اور یہ خیال ہمارا ہی نہیں تھا بلکہ توشی اسے گود میں لئے باہر کھلاتی ہوتی تو باہر والے بھی ایسا ہی سمجھتے اور وہ بعض مرتبہ توشی سے کہہ بھی دیتے تھے۔

پھر وہ منزل آئی جب ڈمپی ڈیڑھ سال کا ہو گیا اور کچھ بولنے لگا۔ وہ توشی کو کبھی توج اور کبھی آنٹی کہنے لگا۔ یہ دونوں لفظ اس نے گھر میں ہی سنے تھے کیوں کہ توشی میری بیوی کو آنٹی کہتی تھی اور ہم دونوں اسے توشی کہتے ہی تھے اس طرح چھوٹی سی توشی ڈمپی کی آنٹی بن گئی۔ ڈمپی توشی کے ساتھ بہت زیادہ ہل گیا۔ وہ بے چاری اسکول جانے سے پہلے بھی ایک دفعہ آتی اور اسکول سے واپس آکر تقریباً فوراً ہی پھر آجاتی۔ ڈمپی بے تابی سے اپنی آنٹی کی راہ دیکھتا اور صبح، شام جب توشی جانے لگتی تو وہ اس کے جانے کے لئے مچلتا اور زمین پر لوٹ پوٹ ہو کر رونے لگتا۔ کئی دفعہ ایسا ہوا کہ توشی سے اس کا رونا برداشت نہ ہوا اور وہ اسے ساتھ ہی لے گئی اور پھر اسے خود دے گئی یا ہم میں سے کوئی جا کر لے آیا۔ ایک روز اسی طرح توشی کے ساتھ ڈمپی شام کو چلا گیا مگر دو گھنٹے گزر گئے اور اسے کوئی دینے نہیں آیا۔ اس کے سونے کا وقت ہو گیا تھا، اس لئے میں اسے لینے چلا گیا۔ میں وہاں گیا تو نہ توشی نظر آئی اور نہ ڈمپی۔ توشی کی ماں نے پلنگ کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ وہ لیٹے ہیں۔ میں نے لحاف اٹھا کر دیکھا تو توشی سوئی پڑی تھی اور اس کی گود میں مڑا ہوا ڈمپی بھی آرام سے سو رہا تھا۔ توشی نے اپنا ایک ہاتھ اس پر رکھا ہوا تھا۔ اور میں نے دیکھا کہ اس ہاتھ اور گود کی آنچ میں وہ ماں کی سی گرمی پا کے آرام سے سو رہا تھا۔ میں نے آہستہ سے توشی کا ہاتھ ہٹایا اور ڈمپی کو گود میں اٹھا لیا۔ میں نے توشی کی ماں سے کہا۔ "توشی آج آٹھ بجے ہی سو گئی۔"

"ہاں کل دیر تک پڑھتی رہی تھی۔ بچہ ہے۔ ڈمپی کو سلاتے سلاتے خود بھی سو گئی۔"

دو سال کا ڈمپی بہت ہی نٹ کھٹ اور شرارتی ڈمپی تھا۔ ماں باپ اور اپنی آنٹی کے لاڈ پیار میں پلا ہوا ڈمپی کافی شریر ہو گیا تھا۔ اس کا اور توشی کا آپس کا پیار، بڑھتے

چاند کی طرح ہر روز بڑھ رہا تھا۔ اب وہ توشی کے گھر جانے کے لئے کسی کی گود کا محتاج نہیں تھا اور توشی کے اسکول سے آنے سے پہلے ہی وہ اپنی ٹانگوں سے گرتا پڑتا توشی کے گھر پہنچ جاتا۔ توشی کو اسکول کے لئے گھر سے ایک آنہ روز ملتا تھا اور وہ بیچاری اس میں سے ہر روز ڈمپی کے لئے ایک ٹافی یا ایک گولی لیتی آتی، اسے لیتے ہی ڈمپی کے گالوں کے گلاب کھل جاتے اور وہ اپنی ننھی سی ہتھیلی پر اسے ایسے دیکھتا جیسے کسی ننھی منّی پری نے اسے جادو کی ٹافی دی ہو!

ایک چھوٹی بچّی ماں کا پیار بھی دے سکتی ہے، یا پھر بڑی بہن کا پیار بھی ماں کا پیا ہے یہ بات توشی کے برتاؤ سے ظاہر تھی۔ ڈمپی کے ساتھ اس کی والہانہ محبت نے اسے ڈمپی کی بہن اور ماں دونوں بنا دیا تھا۔ دن کے وقت ڈمپی کی ماں توشی تھی اور رات کے وقت اس کی اپنی ماں۔ جیسے توشی میں کوئی مقناطیس لگا تھا، ڈمپی دن بھر توشی کے گھر کی طرف چکّر لگاتا رہتا اور گھر پہنچ کر جب اِسے یہ پتہ لگتا کہ آنٹی اسکول گئی ہوئی ہے تو مونہہ لٹکائے ہوئے اداس واپس آجاتا۔ حالاں کہ توشی ہر روز اسکول جاتی تھی مگر ڈمپی کے ننھّے سے ذہن میں یہ بات نہیں آتی تھی اور وہ تیار ہو کر سب سے پہلے سیدھا توشی کے گھر جاتا اور یہ سُن کر لوٹ آتا کہ توشی اسکول گئی ہے مگر اس کے اسکول جانے سے پہلے صبح کا ایک چکّر اور دوپہر کے بعد کئی چکّر ڈمپی کی زندگی کا جزو بن گئے تھے اور وہ اپنی ماں کے روکنے سے بھی نہیں رُکتا تھا۔

آہستہ آہستہ میری بیوی کو یہ بُرا لگنے لگا کہ توشی کے بغیر ڈمپی کو چین نہیں آتا۔ کئی بار اس نے ڈمپی کو توشی کے گھر یا اس کے ساتھ جانے سے روکا بھی۔ اس میں کسی حسد کے جذبے کو دخل نہیں تھا اور شاید ہر ماں ان حالات میں ایسا ہی کرتی۔ اسکے علاوہ توشی کو گھر کا کام اور پڑھائی بھی کرنی ہوتی تھی، اور ہمیں یہ بُرا لگتا تھا کہ ڈمپی توشی کے ساتھ اس طرح چپٹا رہ کر اُس کا وقت ضائع کرے۔ مگر توشی میں نہ جانے پیار اور شفقت کی کون سی کشش تھی اور ڈمپی کا اور اس کا کون سے جنم کا ساتھ تھا کہ ڈمپی اور توشی ایک دوسرے کے ساتھ زیادہ وابستہ ہوتے گئے۔

ایک روز بڑی ٹھنڈ تھی۔ میں، میری بیوی اور توشی کچے کوئلوں کی ایک انگیٹھی کے گرد بیٹھے ہوئے تھے۔ شام کے سات بجے ہوں گے میری بیوی ڈمپی کو گود میں لٹا کر سُلانے کی کوشش کر رہی تھی، مگر وہ سو نہیں رہا تھا۔ حالانکہ وہ آج دوپہر میں بھی نہیں سویا تھا۔ جب توشی جانے کے لئے اٹھی تو وہ ماں کی گود سے اُتر کر توشی کی گود میں چڑھ گیا۔ میری بیوی کو بُرا لگا کیوں کر توشی کو پہلے ہی دیر ہو گئی تھی۔ اس نے ڈمپی کو آگے بڑھ کر کھینچ لیا اور اس پر خفا ہونے لگی۔ لیکن ڈمپی مچلتا رہا۔ توشی بولی۔ "لاؤ میں لے لوں، سلا کر چلی جاؤں گی۔" ڈمپی توشی کی گود میں لیٹ گیا۔ لیکن سونے کی بجائے اس سے کھیلنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں نیند نہیں تھی مگر وہ توشی کی گود میں سے اُترنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ ساڑھے سات بجے توشی گئی۔ مگر ڈمپی اس وقت تک نہیں سویا تھا، توشی جانے لگی تو وہ اس کے ساتھ جانے کی ضد کرنے لگا۔ لیکن اس کی ماں نے اسے زبردستی روک لیا۔ توشی کے جاتے ہی غصے میں میری بیوی نے ڈمپی کے دو تین تھپڑ مار دیے اور اسے لے کر پلنگ پر لیٹ گئی اور زبردستی سلانے لگی۔

مار کھا کر اور سسکیاں لیتا ہوا ڈمپی سو گیا اور اس کے ساتھ ہی اس کی ماں بھی تھوڑی دیر میں مجھے بھی نیند آنے لگی اور میں بتی بجھا کر سو گیا۔ کوئی شاید نو بجے ہوں گے، میری اچانک آنکھ کھلی۔ ڈمپی نیند میں بڑبڑا رہا تھا کہ آنٹی کے پاس سوؤں گا۔ میں نے اسے اٹھا کر اور تھپک کر اپنے پاس سُلا لیا۔ میری پھر آنکھ لگ گئی مگر تھوڑی دیر میں ہی کھل گئی کیوں کہ مجھے احساس ہوا کہ ڈمپی میرے بستر پر نہیں ہے۔ میں نے اٹھ کر بتی جلائی تو دیکھا کہ ڈمپی دروازے سے لگا کھڑا ہے میں نے اسے گود میں لیا تو وہ لبسورتے ہوئے بولا کہ میں آنٹی کے پاس سوؤں گا میرا دل رحم سے بھر گیا۔ میں نے گھڑی کی طرف دیکھا، دس بجے تھے۔ میں نے کمبل لیا، ڈمپی کو اور اپنے آپ کو اس میں لپیٹا اور آہستہ سے دروازہ کھول کر باہر چلا گیا۔ توشی کے کمرے میں ابھی تک روشنی تھی۔ میں نے کھڑکی کے شیشوں میں سے دیکھا، توشی ابھی تک پڑھ رہی تھی۔ میں نے شیشے پر کھٹ کھٹ کی اور توشی نے مجھے دیکھتے ہی لپک کر دروازہ کھول دیا۔ جیسے وہ میرا مطلب جانتی تھی

یا جیسے جو کچھ ڈمپی پر گزری تھی، وہ اسے دیکھتی رہی تھی۔ اس نے فوراً کمبل میں سے ڈمپی کو لے لیا اور اسے اپنے سینے سے چمٹاتی ہوئی چارپائی پر لیٹ گئی۔

وہ پہلا دن تھا جب ڈمپی رات بھر گھر سے باہر سویا۔ میں گھر لوٹا تو بیوی دروازے میں کھڑی تھی اور پریشان تھی۔ مجھے خالی ہاتھ دیکھ کر گھبرائی۔ میں نے سب کچھ بتا دیا تو وہ بولی "یہ آپ نے ٹھیک نہیں کیا، ڈمپی کو آپ نے ہی خراب کیا ہے۔ ڈمپی کا توشی کے ساتھ اتنا لگاؤ میں پسند نہیں کرتی، وہ پھر پرائی لڑکی ہے۔"

میں نے کہا "تم خواہ مخواہ ایسا سوچتی ہو۔ اس میں اپنے پرائے کی کیا بات ہے یہ دو بچوں کا پیار ہے اور کوئی ایسا غیر قدرتی بھی نہیں۔ وقت کے دو چار سال شاید اس پیار کے بلبلے کو توڑ دیں گے۔ ڈمپی دو ایک سال میں اسکول جانے لگے گا اور توشی کون سی سدا یہیں رہے گی۔"

لیکن وہ ایک سال سے بہت پہلے ہی پیار کا یہ ننھا سا بلبلا پھوٹ گیا اور دو ننھی ننھی معصوم دھارائیں الگ ہو گئیں۔ ہمارے دفتر کی ایک شاخ شیلانگ میں کھل گئی اور مجھے وہاں جانے کا حکم ہو گیا، میں نے بڑی کوشش کی کہ وہاں نہ جاؤں مگر کامیاب نہ ہوا تو توشی نے جب یہ سنا کہ ہم اتنی دور آسام جا رہے ہیں تو وہ دھک سے رہ گئی۔ اس کا معصوم گلابی چہرہ ایک دم سفید سا ہو گیا اور اس کی آنکھوں میں تیرتے ہوئے سیاہ دھبے ٹھہر سے گئے۔ وہ ایک دو روز ہمارے یہاں آئی بھی نہیں۔ ڈمپی یہ جان کر کہ اب ہم جا رہے ہیں بڑا خوش ہوا اور کہتا رہا کہ ہمارے ساتھ آنٹی بھی جائے گی، جو بھی اس سے پوچھتا کہ کون کون جائے گا تو وہ ہم سب کے ساتھ توشی آنٹی کا نام بھی لے دیتا اور توشی یہ سنتی تو اس کا کلیجہ مونہہ کو آ جاتا۔ وہ شاید اس بات کو برداشت نہیں کر سکتی تھی اور فوراً اس جگہ سے اٹھ کر بھاگ جاتی۔ شاید وہ کہیں جا کر تنہائی میں روتی یا اپنے آنسوؤں کی امڈتی ہوئی ندی کو اپنی آنکھوں میں ہی پی جاتی۔

اور پھر وہ دن بھی آ گیا جب دو معصوم دلوں کے آبگینے چور چور ہو گئے ہمارا سامان لد رہا تھا اور ہم جانے والے تھے۔ توشی اپنے گھر کے کسی کونے میں

بیٹھی ہوئی آنسو بہا رہی تھی اور ڈمپی اپنے نئے نئے کپڑے پہن کر توشی آنٹی کو بلانے کے لئے چلا گیا تھا، لیکن آنے کی بجائے توشی نے اسے اپنے سینے سے کھینچ لیا تھا اور توشی کو روتا دیکھ کر ڈمپی بھی رونے لگا تھا۔ ہم دونوں توشی کے گھر گئے تو ڈمپی روتا ہوا توشی کا دامن کھینچ کر چلنے کو کہہ رہا تھا۔ ہم بڑی مشکل سے توشی کو ٹیکسی تک لائے۔ ہم نے روتے چیختے ڈمپی کو زبردستی ٹیکسی میں بٹھایا۔ وہ آنٹی آنٹی چلاّ رہا تھا، مگر اس کی آنٹی کی آنکھوں میں تو آنسوؤں کے اتنے بڑے بادل جھوم آئے تھے کہ اس کی آنکھوں کے سورج بھی اوجھل ہو گئے تھے اور وہ اپنے ڈمپی کو دیکھ بھی نہیں سکتی تھی!

جب تک ہم اسٹیشن پر نہیں پہنچے ڈمپی روتا رہا اور توشی کو پکارتا رہا۔ ریل میں بیٹھتے ہی جیسے اس کے ننھے سے دل کو بھی توشی کی مجبوری کا پتہ لگ گیا تھا، وہ میرے گھٹنوں پر سو گیا۔ اس کے گرم گال سوجے ہوئے سے تھے اور اُن کی اداس سُرخی کو آنسوؤں کی ننھی سی لکیریں کاٹ رہی تھیں۔ میں نے اس کے گال پر ہاتھ رکھ کر اسے سینے سے چمٹا لیا۔ مگر اچانک میرا دل تڑپ اٹھا کیوں کہ ڈمپی کے غم کو تو تھوڑی دیر کے لئے نیند نے ڈس لیا تھا۔ مگر ریل کے ڈبے کی کھڑکی کی ان سخت اور ٹھنڈی سلاخوں کے پرے، اسی ٹھنڈی اور سخت دنیا میں، ایک پرائی لڑکی کسی کونے میں بیٹھی ابھی تک رو رہی ہوگی!

سُرخ ساڑھی

وہ اپنی ستاروں بھری سُرخ ساڑھی پہنے ہوئے تھی۔ اس کے ماتھے پر سہاگ کی بندی جگ مگ کر رہی تھی آنکھوں میں خوشی کے لہراتے ہوئے ڈورے تھے اور گال دمک رہے تھے۔

آج بڑی لڑکی کانتا کا جنم دن تھا۔ ماں، باپ اور بچے سب ایک کمرے میں اکٹھے تھے اور آج روشن ایک کامیاب خاوند اور باپ نظر آرہا تھا۔ یہ ستاروں بھری ساڑھی ان اچھے سالوں کی یاد تھی جب روشن ایک کتابوں کی دکان کا محنتی مالک تھا۔ اتنے سالوں کے باوجود، لکشمی نے اس ساڑھی کو اتنی حفاظت اور پیار سے رکھا تھا کہ وہ آج بھی نئی ہی معلوم ہوتی تھی وہ اسے صرف خاص خاص موقعوں پر ہی پہنتی تھی اور اس ساڑھی کے پہنتے ہی وہ اپنے آپ کو گھر کی لکشمی سمجھتی اور ایک عجیب جذبے کے تحت اس کا پیار اپنے خاوند کے لئے امڈ آتا۔

کانتا کا جنم دن منانا گھر کی ایک روایت تھی۔ اس روز لکشمی اپنے بہت سے غموں کو بھول جاتی اور اس کی جدوجہد کی زندگی میں یہ روایت بڑی سہانی تھی۔ لکشمی ہی کیا اس روز تو جیسے سارے گھر کو کوئی خوشی کا چمکیلا لباس پہنا جاتا۔ اس موقعے پر لکشمی اپنی سرخ ساڑھی پہنتی اور اس کی تہوں سے اتر کر خوشیوں اور پیار کی کتنی ہی یادیں اِدھر اُدھر بکھر جاتیں۔ وہ اس ساڑی کو ایک انجانے اعتقاد کے طور پر پہنتی

اور اس روز اس کے دل میں ایک تھرک ہوتی اور پاؤں میں ایک ناچ!

سرخ ساڑی کے پس منظر میں اس کی چمکتی ہوئی آنکھیں بار بار روشن کی خشک آنکھوں میں جھانک رہی تھیں۔ ایکا ایکی اس کی نظر سامنے ٹنگی ہوئی فوٹو کی طرف اُٹھ گئی۔ اس کے دل میں ایک درد آمیز جذبے نے چٹکی لی یہ فوٹو روشن کی تھی جو شادی کے وقت تقریباً تیس سال کا خوش شکل اور صحت مند آدمی تھا۔ اس فوٹو میں روشن کے ساتھ لکشمی بھی تھی، بیس سال کی شرمیلی لڑکی جس کی آنکھوں میں ایک پاک ضیا تھی اور گالوں میں گلاب کھلے تھے، لکشمی کی توجہ فوٹو کی طرف کھنچ گئی اور وہ کچھ لمحوں کے لئے اس میں روشن کو دیکھتی رہی پھر اس نے روشن کی طرف دیکھا جو جھکا ہوا میٹھے چاول کھا رہا تھا۔ وہ توانائی، وہ رونق، وہ ہمت اب کہاں! اس کے گال ہڈیوں سے چپک گئے تھے اور کھال سیاہی مائل ہو گئی تھی جس سر پر گھنے بالوں کا گنجان جنگل سا تھا وہاں صرف کناروں پر ایک کالا سا فیتا رہ گیا تھا۔ اس کی آنکھیں تیزی سے جھپک رہی تھیں اور اس کے چہرے کی نوکیلی ٹھوڑی ایک طرف کو زیادہ جھکی ہوئی تھی۔

لکشمی ایک لمحے کے لئے سوچ میں غرق ہو گئی روشن کتنا کمزور ہوتا جا رہا تھا کچھ عرصے سے تو وہ زیادہ ہی چُپ چاپ رہتا اور دیکھنے میں بالکل بیمار لگتا لکشمی کے دل میں محبّت کی ایک کرن پھوٹی اور اس نے پوچھا۔

"تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟"

روشن نے نظر اٹھائی اور ایک پھیکی سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں کو کاٹ گئی۔ اس کی طبیعت ٹھیک تھی، اس نے آہستہ سے بتایا اور وہ اپنے چھوٹے لڑکے سے کھیلنے لگا جو اس کی ٹانگوں میں چمٹ رہا تھا۔ جس وقت لکشمی کا بیاہ ہوا تھا، روشن کی کتابوں کی دکان اچھی چل رہی تھی۔ لکشمی کے گھر والوں نے اس کا بیاہ پوچھ تاچھ چھان بین کر کے ہی کیا تھا اور اس وقت یہ کسے گمان تھا کہ روشن سٹّے، جوئے اور شراب میں پڑ کر اپنا گھر بار بالکل کھو دے گا۔ اور اسے سُدھارنے کی ہر کوشش

ناکام ہوگی۔ شروع کے چند سال تو لکشمی کے بہت ہی اچھے گزرے تھے اوران میں زندگی کا آرام، رومان کی میٹھی تھپکی، مستقبل کے سنہری سپنے، سب کچھ تھا لیکن پھر جیسے قدرت کو ان کا یہ آرام ناگوار گزرا ہو، روشن کو سٹے کی لت پڑ گئی اور پھر ___ ایک رات وہ شراب پی کر بھی آیا!

جیسے پہلے کتابیں، کاپیاں اور پنسلیں روشن کی زندگی کا ریل پیل تھیں، ویسے ہی اب سٹہ اور شراب اس کی زندگی کے باجے بن گئے! بری باتوں میں کتنی کشش ہوتی ہے، لکشمی دیکھ کر حیران ہوگئی اور اس کی خوب صورتی، اس کا نیک پن، بچوں کی پھلواری کچھ بھی تو روشن کو اس کی نئی پریوں سے دور نہ کھینچ سکا۔ وہ بچوں اور بیوی سے بے گانہ سا ہوگیا۔ دکان کئی کئی دن نہ کھولتا اور اپنی ہی قسم کے چند آدمیوں کے ساتھ دن بھر نہ جانے کس فراق میں گھومتا رہتا سارے گھر کا محور ہی آہستہ آہستہ ٹوٹ گیا اور روشن ایک نکھٹو اور آوارہ خاوند بن کر رہ گیا۔ اور جب گھر میں رکھی ہوئی سلائی کی مشین لکشمی کا خاوند بنی تو بھی روشن کی بے حس رگوں میں خون نہیں دوڑا اور جب وہ ایک چھوٹے سے پرائیویٹ اسکول میں استانی بن گئی تو روشن اور بھی نکھٹو ہو کر بیٹھ گیا!

وقت گزرتا گیا اور پھر ایسی منزل آئی جب لکشمی گھر میں خاوند بن گئی اور روشن ایک ناقابلِ رشک بیوی! ان کے بیاہ کو اب پندرہ برس ہو چکے تھے اور اس لمبے عرصے کی گود میں اس گھر کے لئے ایک چھوٹے سے میٹھی یادوں کے تودے پر، ناخوش گوار یادوں کا ایک بڑا ڈھیر تھا۔ روشن اب پینتالیس سال کا ہونے کو آیا تھا اور گھر میں صرف ایک بے کار بوڑھا تھا۔ وہ کوئی دس سال سے بالکل نہیں کما رہا تھا اور وقت سے پہلے بوڑھا ہو گیا تھا۔ اس کی سٹے اور شراب کی عادت اگرچہ اب بہت کم ہو چکی تھی مگر ایک پٹی ہوئی لکیر کی طرح اس کی زندگی سے چمٹی ہوئی تھی۔ اسے جب کبھی گھر میں سے کچھ پیسے ہاتھ آجاتے یا وہ کوئی ایسی چیز بیچ سکتا جس کا آسانی سے کسی کو پتہ نہ لگے تو وہ سٹہ لگا آتا یا تھوڑی سی پی لیتا۔

کام کاج کے لحاظ سے روشن گھر کی اچھی بیوی تھا لکشمی کی غیر حاضری میں وہ

بچّوں کو رکھتا، ان کے مونہہ دھلاتا، کپڑے پہناتا اور دھوتا۔ کبھی کبھی وہ کھانا تک بناتا۔ زندگی میں جیسے بہت سی غلطیوں اور گناہوں کی خاک اس پر سے جھڑ چکی ہو، وہ کچھ پشیمان سا تھا لیکن اب وہ شاید ایک ایسی منزل پر پہنچ چکا تھا جہاں توبہ اور سوچ میں نکھار اسے آگے نہیں دھکیل سکتے تھے۔

لکشمی اس صورتِ حال پر دل ہی دل میں کڑھتی رہتی۔ وہ تو شروع سے ہی گھر کی رانی بننے کی آرزو مند تھی اور گھر کے سنہرے اور خوش گوار ماحول میں جھولنا ہی اس کا سپنا رہا تھا۔ اس کا قدم باہر مجبوری سے ہی نکلا تھا اور وہ اپنی ہمت سے زیادہ بوجھ اٹھائے پھر رہی تھی۔ گھریلو پیار اور خوشی کی کرنیں کتنی ماند پڑ چکی تھیں وہ جانتی تھی اور ان باتوں کو سوچ سوچ کر وہ کئی دفعہ چپکے سے رو لیتی تھی۔

اگرچہ لکشمی کی زندگی آرام اور رونق سے دور ہوتی گئی مگر اپنے لئے ایک راستہ بنا چکی تھی۔ اس کے تینوں بچّے اب خاصے بڑے ہو گئے تھے اور بڑی لڑکی کانتا تو گیارہ سال کی ہونے کو آئی تھی۔ وہ چھوٹے دونوں بچّوں کو سنبھالے رکھنے کے علاوہ اپنی پڑھائی اور گھر کا کام کاج بھی کر لیتی تھی۔ وہ بالکل ماں پر جا رہی تھی، ویسی ہی ہوشیار اور حسّاس۔ گھر کی ایک ایک بات میں دلچسپی لیتی اور بہت سی ایسی باتیں محسوس کرتی جو عموماً اس عمر کی لڑکی کی سوچ سے باہر ہوتی ہیں۔ اسے پورا احساس تھا کہ باپ کے ہوتے ہوئے بھی اس کی ماں کا نوکری کرنا اور گھر کو پالنا اس کی ماں کے لئے ایک بڑا بوجھ بھی تھا اور ایک عجیب بات بھی۔

لکشمی کی زندگی اگرچہ اپنے راستے پر ڈگ مگ ڈگ مگ چل تو رہی تھی، لیکن وہ مالی طور پر کچھ زیادہ ہی تنگ رہتی۔ اسکول کے ستّر روپے اور سلائی کے کچھ روپے کھانے شراب کو اکثر ہرا دیتے اور اگر کسی مہینے کسی کی بیماری وغیرہ کا خرچ آپڑتا تو نوبت ادھار لینے پر آجاتی۔ ان تنگیوں نے لکشمی کا مزاج کافی چڑچڑا بنا دیا اور وہ بعض مرتبہ بچّوں کو ذرا ذرا سی بات پر مارتی اور روشن پر جھنجھلاتی۔ ایک روز وہ اسکول جاتے ہوئے روشن کو پانچ روپے کوئلے والے کو دینے کے لئے دی گئی دو تین روز بعد جب وہ اسکول

سے لوٹتے ہوئے کوئلے والے کی طرف اُسے کوئلہ بھجوانے کے لئے کہنے گئی تو اسے پتہ لگا کہ روشن اسے روپے نہیں دے گیا۔

وہ تیزی سے گھر کی طرف بڑھی۔ اسے بے حد غصہ آرہا تھا۔ اس نے ضرور وہ روپے جوئے میں ہار دئیے ہوں گے کیوں کہ ان دنوں لکشمی نے اسے پئے ہوئے تو نہیں پایا تھا۔ لکشمی اپنے آپ پر بھی جھنجھلا رہی تھی کہ اس نے روپے کیوں دئے اس قسم کی بات پہلی نہیں تھی اور اس سے بیشتر بھی وہ روشن پر اعتبار نہ کرنے کا فیصلہ کر چکی تھی لیکن نہ جانے کیوں وہ پچھلی باتوں کو بعض مرتبہ بھول جاتی تھی مگر اس کا یہ مطلب تو نہیں تھا کہ روشن گھر کی حالت کا احساس نہ کرے۔ اب وہ یہ پانچ روپے اس مہینے کہاں سے ادا کرے گی۔ اس مہینے خود روشن کی دو تین مرتبہ دوا آئی تھی اور ڈاکٹر کے پیسے ابھی دینے تھے۔ اس کے دماغ میں اس طرح سوچ کا لاوا ابلتا رہا اور وہ غصے سے بھنتی ہوئی تیزی سے گھر میں داخل ہوئی۔

روشن اندر کمرے میں اپنی چارپائی پر پڑا تھا اور کانتا اس کا سر دبا رہی تھی۔ وہ کڑک کر بولی۔

" وہ کوئلے والے کے روپے کہاں ہیں، شراب پی یا جوا کھیلا؟ "

" وہ روپے میں ایک دو روز میں کوئلے والے کو خود دے دوں گا۔" روشن آہستہ سے بولا۔

" لیکن یہ بے شرمی کب تک رکھو گے؟ " وہ چلائی ـــــ " ساری عمر دھیلا نہیں کمایا اور مجھے اس حالت پر پہنچا دیا ـــــ بے شرم، کمینے ـــــ "

اور وہ باہر نکل گئی اور آنگن میں زور زور سے بولنے لگی۔ چھوٹا بچہ رونے لگا تو اس نے اس کے بھی ایک تھپڑ جا دیا۔ وہ بہت دیر تک کچھ کچھ بولتی رہی پھر وہ اپنے کمرے میں گھس گئی۔ کمرے کے کونوں سے اندھیرا اپنی زبانیں نکال رہا تھا اور وہ ایک کونے میں زمین پر بیٹھ گئی۔ چند لمحوں میں اس کے دماغ کا بگولہ بیٹھ گیا اور وہ ایک لمبی سوچ میں غوطہ لگا گئی۔ اس نے شاید زیادتی کی تھی ـــــ بے شرم،

کمینے؟ ـــــ نہیں نہیں یہ لفظ تو وہ نہیں ہیں جو ایک بیوی اپنے خاوند کے لئے استعمال کرنا چاہیے وہ کتنا بھی برا کیوں نہ ہو، یہ سوچ کر اس کا دل کچھ بیٹھ سا گیا اور وہ اندھیرے میں ہی لیٹ گئی۔ جب کانتا نے آہستہ سے گھس کر اپنے چھوٹے سے ہاتھ رکھے تو اس نے کانتا کو بھینچ لیا اور دھیرے دھیرے رونے لگی۔

ایک دو سال اور گزر گئے ان سالوں نے بھی لکشمی کے گھر کی تکلیفیں اور جھگڑے دیکھے۔ روشن اس عرصے میں زیادہ کمزور ہو گیا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اسے کوئی مہلک بیماری ہے جو اسے اندر ہی اندر کھائے جا رہی ہے۔ روشن کی بیماری نے گھر کی تکلیفوں کو زیادہ کر دیا ان دو سالوں میں خوشیوں کے بہت ہی کم موقعے میسّر آئے اور کانتا کے جنم دن بھی اتنی خوشی نہ لائے جتنی اس گھر کا اب تک حصہ رہی تھی۔

ایک روز کانتا نے اسکول پہنچ کر باپ کی حالت خراب ہونے کی خبر دی تو لکشمی دوڑی دوڑی گھر پہنچی روشن کچھ بڑبڑا رہا تھا۔ اس نے ہاتھ لگا کر دیکھا، بخار تو نہیں تھا مگر اس کی آنکھیں بند تھیں اور وہ کبھی کبھی ہاتھ پاؤں پٹکا رہا تھا۔ لکشمی ڈاکٹر کو بلا لائی ڈاکٹر دیکھ کر چلا گیا اور اس نے دوا بھجوا دی۔ مگر روشن کی حالت زیادہ ہی خراب ہو گئی اور ایک دو پڑوسیوں نے ہسپتال لے جانے کی صلاح دی۔ دو آدمیوں کی مدد سے لکشمی تانگے میں روشن کو ہسپتال لے گئی۔

ہسپتال میں روشن کو داخل کر لیا گیا اور لکشمی کافی رات گئے گھر لوٹی۔ ہسپتال میں اسے پتہ لگا کہ صبح روشن کا ایکسرے ہو گا۔ اگلے روز گھر میں بڑی اداس بکھری بکھری، پھیکی سی صبح پھوٹی۔ سارے گھر میں ایک عجیب سا منظر تھا اور بچے بہت گھبرائے ہوئے تھے۔ اس روز لکشمی اسکول کے بجائے ہسپتال گئی۔ وہاں جا کر اسے پتہ لگا کہ اس کے خاوند کے بچنے کی کوئی امید نہیں تھی اور وہ صرف چند گھنٹوں کا مہمان تھا وہ ایک لمبی بیماری میں مبتلا رہا تھا اور اس کی ہڈیوں میں گھن لگتا رہا تھا۔ لکشمی کی آنکھوں میں کوئی شے ہلی اور اس نے ڈاکٹر سے پوچھا کہ کیا کوئی آپریشن یا قیمتی دوا اس کے خاوند کو بچا سکتی تھی

مگر ڈاکٹر سر ہلا کر آگے بڑھ گیا

——— اسی رات، ہسپتال کے بے حس سونے اور ٹھنڈے برآمدے میں لکشمی اور اس کے گرد جڑوں کی طرح پھیلے ہوئے بچّوں کو پتہ لگ گیا کہ روشن مر گیا ہے!

——— اور اس سال کانتا کا جنم دن آیا تو لکشمی نے اپنی ستاروں بھری سُرخ ساڑھی نہیں پہنی، اور اس کے ماتھے کے چاند پر بندی نہیں جگمگائی ___ وہ ساڑھی کو بھول سی چکی تھی مگر یہ دن ایک کرب آمیز یاد لایا۔ اس نے صبح سویرے ہی ساڑھی نکال لی اور قینچی سے اسے کئی جگہ سے کاٹ ڈالا۔ وہ اس میں سے کانتا اور چھوٹے بچّوں کے فراک کاٹ رہی تھی اور ساڑھی کے ستاروں سے ملتے جلتے ستارے اس کی آنکھوں میں جھل مِل کر رہے تھے!

بیٹوں کی طرح

بنسی نو دس بجے بھینسوں کا کام کرنے کے بعد چارپائی باہر ڈال لیتا اور دن بھر اسی پر بیٹھا رہتا حتیٰ کہ چار یا پانچ بج جاتے اور پھر بھینسوں کی سانی وغیرہ پر لگ جاتا۔ وہ ہمیشہ اپنے سلیٹی رنگ کے کرتے اور میلی دھوتی میں نظر آتا۔ اگرچہ اس کی عمر پچاس کے لگ بھگ تھی مگر وہ بلا کا محنتی تھا اور بھینسوں کو نہلانے ان کی سانی کرنے دودھ دہنے اور گاہکوں کو دودھ ناپنے میں وہ ماہر تھا۔ وہ دن میں بالکل نہیں سوتا تھا اور گرمی ہو یا سردی وہ اپنی ڈیری کے باہر چارپائی ڈالے بیٹھا رہتا اور ہاتھ میں چلم لئے صافی کو بھگو اور الٹا پلٹتا رہتا۔ سوائے تمبا کو لینے جانے اور روٹی کھانے کے وہ اپنی جگہ کو نہ چھوڑتا تھا۔ اس چارپائی پر اس کا ساتھ اکثر اس کی چلم دیتی یا گلی کا کتا موتی جس کا یہ نام اس نے خود ہی رکھا تھا اور جسے وہ کبھی کبھی روٹی کا ٹکڑا ڈال دیا کرتا تھا۔

بنسی بیس برس سے اس ڈیری پر نوکر تھا۔ یہ ڈیری شرنارتھیوں کے ادھر آ جانے یا آبادی بہت زیادہ بڑھ جانے کی وجہ سے وجود میں نہیں آئی تھی۔ یہ اس وقت سے یہاں موجود تھی جب یہاں آبادی برائے نام تھی اور یہ صرف ایک ہی بھینس کی ڈیری تھی اور اس کے گاہک صرف دو تین تھے۔ بنسی کی آنکھوں کی پتلیوں میں اس وقت سے لے کر اب تک کا سارا زمانہ موجود تھا۔ وہ جب بھو کا مرتا گاؤں سے ایک گائے چرا کر یہاں آیا تھا تو اس وقت وہ صرف تیس سال کا تھا اور اس نے وہ گائے صرف

بارہ روپے میں ایک بنئے کو بیچ دی تھی۔ گائے بڑی اچھی تھی مگر چوری کی تھی اور
ان دنوں پچیس تیس روپے میں اچھی گائے مل جاتی تھی۔ اس لئے بارہ روپے
میں اس نے بلا چون وچرا کئے گائے بیچ دی تھی کیونکہ بنئے نے بغیر پوچھ تاچھ کئے
صرف گائے کو کھلا کر اور اس کا دودھ نکال کر گائے اپنے گھر باندھ لی تھی وہ واقعہ
اس کو ابھی تک یاد تھا۔ کچھ دن تو اس کے بارہ روپے سے کٹ گئے تھے مگر جب وہ
ختم ہو گئے تو وہ یہاں لالی کے پاس آیا تھا۔ لالی نے اسے چار آنے روز اور روٹی پر
بھینس کی سانی کرنے، اسے نہلانے، دودھ دوہنے اور گاہکوں کو دودھ دینے پر ملازم
رکھا تھا۔ اس روز سے آج تک وہ اسی ڈیری پر ملازم تھا اور یہ ایک لمبا بیس برس
کا عرصہ تھا۔ اس روز کے بعد اس نے کوئی چوری نہیں کی تھی کیوں کہ اسے روٹی، تمباکو
وغیرہ کسی چیز کی تنگی نہ تھی۔ ان دنوں دو پیسے کا تمباکو دن بھر کے لئے کافی ہوتا تھا اور
لالی روٹی سے تنگ نہ رکھتی تھی اور کبھی کبھار اس کو کرتہ اور دھوتی بھی بنوا دیتی تھی
جوتا اس نے آج تک نہیں پہنا تھا اور جب کبھی اسے کوئی اس بارے میں کہہ
دیتا تو وہ عجیب انداز میں کہتا کہ میں بابو تھیں ہوں۔

بنسی کے آگے پیچھے کوئی نہیں تھا اور جب وہ گیارہ برس کا تھا تو اس دنیا میں
اس کا آخری رشتے دار ایک بھائی مر چکا تھا۔ جب تک وہ اس شہر میں نہیں آیا تھا اس کی
زندگی گاؤں میں فصل کاٹنے اور ڈھونے میں گزری تھی حتّٰی کہ وہ تنگ آکر ایک روز اپنے
مالک کی گائے کھول لایا تھا۔ لالی ایک بنئے کی بیوہ تھی اور بنسی سے عمر میں دس برس
بڑی تھی۔ اس کا خاوند تین چار ہزار روپے چھوڑ کر مرا تھا اور جب بنسی لالی کے پاس
آیا تھا تو اسے بیوہ ہوئے چار پانچ مہینے ہی ہوئے تھے اور وہ اپنے اور اپنے تین
چار بچّوں کے گزارے کی ترکیبیں کر رہی تھی۔ کوئی ہزار ایک روپیہ تو اس کے خاوند کا
ہی دیا ہوا گلی محلّے میں سود پر چڑھ رہا تھا جو اس نے واپس نہیں لیا اور ہزار روپے
کی یہ دو سو پچیس گز زمین اسے مل گئی تھی جس کا بھاؤ اس وقت پچاس روپے گز
ہو گیا تھا۔ اس زمین پر لالی کی ڈیری شروع ہو گئی تھی۔ اس ڈیری میں آج بارہ بھینسیں

تھیں اور اگرچہ اس کے اردگرد عالی شان عمارتیں ابھر آئی تھیں مگر لالی کی ڈیری لالی اور بنسی کے ساتھ جوں کی توں موجود تھی۔ لالی کی زمین کے بہت اچھے دام ملتے رہے مگر اس نے اپنے کام کو ختم نہیں کیا تھا اور آج تو یہ ڈیری اس کی، اس کے بیٹے کی بہو کی اور بنسی کی سب سے زیادہ سرگرمی کا مرکز تھی۔ اگرچہ لالی ساٹھ برس کے لگ بھگ تھی مگر اس کی صحت غضب کی تھی اور اس بڑھاپے کے باوجود ڈیری میں دونوں وقت بالٹی اِدھر اُدھر اٹھاتی، دودھ ناپتی اور بنسی کو بُرا بھلا کہتی نظر آتی۔

آج لالی بڑی امیر تھی اور اس نے دو مکان بنوا لئے تھے اور اپنے بیٹے کو پرچون کی ایک بڑی دکان بھی کرا دی تھی ان بیس برسوں میں لالی کی بھینسوں کے دودھ نے اسے بڑا روپیہ دیا تھا اور اس کا سود کا کام بھی خوب چلتا رہا۔ لالی کی امیری کے لئے بہت حد تک بنسی کی محنت اور اس کے دل میں لالی کے فائدے کا خیال بھی ذمے دار تھا وہ ڈیری میں بالکل ایسے کام کرتا جیسے وہ نوکر نہیں مالک ہے وہ بھینسوں کا دودھ دُہتا بھی اور گاہکوں کو ناپ کر بھی دیتا۔ اس کی کسی نہ کسی گاہک سے ہر روز جھڑپ رہتی کیوں کہ اس کی کوشش زیادہ سے زیادہ جھاگ ڈالنے پر ہوتی اور وہ ناپ کا برتن کچھ اس انداز سے بھرتا کہ دودھ صرف گردن تک آتا۔ وہ گاہکوں کی باتیں سُنتا بحث کرتا مگر اس نے جھاگ ڈالنا چھوڑا نہ کم تولنا!

اگرچہ لالی نے ان بیس برسوں میں خوش حالی کے میدان میں چھلانگیں لگائی تھیں مگر بنسی بالکل کچھوے کی چال چلا تھا۔ وہ دو آنے روز اور روٹی پر ملازم ہوا تھا اور بیس برس بعد آٹھ آنے روز اور روٹی پر تھا اسے ماہوار تنخواہ نہیں ملتی تھی۔ لالی کے اگرچہ بیشتر گاہک ماہانہ تھے مگر کچھ لوگ ہر روز نقد بھی لے جاتے تھے اس نقدی میں سے ہر روز شام کو لالی آٹھ آنے بنسی کی ہتھیلی پر رکھ دیتی تھی۔ بنسی کا کوئی صندوق نہیں تھا اور اس کی دھوتی کا پلّہ اس کے پیسوں کا بٹوا تھا۔ یہ پلّہ کبھی بوجھل نہیں ہوا تھا اور شاید ہی کبھی اس کے پاس دو تین روپے سے زیادہ اکٹھے ہوئے ہوں۔ اب اس کا تمباکو کا خرچ دو آنے روز تھا اگرچہ اس کی تمباکو نوشی میں اضافہ نہیں ہوا تھا۔

دو آنے روز کا خرچ موتی کا بندھ چکا تھا جسے وہ ہر روز حلوائی سے لے کر دودھ پلواتا تھا۔ موتی عموماً دوپہر کو اس کے پاس آتا اور بنسی اسے ضرور دودھ پلواتا وہ فخریہ ہر شخص سے موتی کو دودھ پلوانے کا ذکر کرتا اور یہ بات اڑ گئی تھی کہ بنسی ایسا کسی فقیر کے کہنے سے کر رہا ہے۔ مگر یہ بات نہیں تھی۔ بنسی کے سینے میں رحم تھا اور وہ موتی کو دودھ پلانا چاہتا تھا۔ ان مستقل خرچوں کے علاوہ بنسی کے کئی وقتی خرچ بھی تھے۔ اس کے سر میں سخت درد ہوتا یا بخار آتا تو وید سے دو چار آنے کی دوا بھی ان ہی پیسوں میں سے آتی۔ کبھی وہ کوئی چیز بھی کھا لیتا اور کبھی کبھار حلوائی سے دودھ بھی پیتا۔ اس نے آج تک ڈیری سے ایک قطرہ دودھ بھی نہیں لیا تھا۔

اس ڈیری سے کچھ دور پر ایک اور ڈیری بھی کھل گئی تھی۔ جس میں ایک دودھ دہنے والے نوکر موجی کو بنسی بھی جانتا تھا۔ یہ ڈیری بھی کافی بڑی تھی اور اس میں موجی کو بغیر کھانے کے چالیس روپے ملا کرتے تھے۔ موجی اپنا کھانا خود بناتا تھا اور اس کا کھانے کا خرچ دس بارہ روپے مہینے سے زیادہ نہیں آتا تھا۔ کئی روز سے موجی بنسی کے کان میں یہ بات ڈال رہا تھا کہ وہ لالی کے یہاں بہت کام کرتا تھا اور لالی اسے بہت کم تنخواہ دے رہی تھی۔ جس قسم کا کھانا لالی اسے دے رہی تھی، اس کی لاگت دس روپے مہینے سے زیادہ نہ تھی اور اسے بنسی کو کم سے کم پچیس روپے مہینے دینا چاہئے۔ بنسی نے شروع میں تو اس بات پر دھیان نہیں دیا۔ مگر اب جب کبھی لالی سے نوک جھونک ہوتی تو وہ یہ صاف سنا دیا کرتا کہ اس کی تنخواہ بڑی کم تھی اور اس کی محنت کو دیکھتے ہوئے لالی کو اسے ایک روپیہ روز دینا چاہیئے اور وہ جھٹ موجی کی مثال دے دیتا کہ اسے چالیس روپے مہینہ مل رہا تھا۔

اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ بنسی کا لالی کو بڑا آرام تھا۔ بارہ بھینسوں کو ہر روز نہلانا، ان کی سانی کرنا اور دہنا اور گاہکوں کو دودھ ناپ کر بھی دینا کوئی معمولی کام نہیں تھا۔ مگر بیس سال تک اس قسم کا کام کرتا کرتا بنسی ایک مشین بن چکا تھا اور اس کے بوڑھے اعضا ایک غیر معمولی کام کرتے تھے لالی اور اس کی بہو بھی

ضرور کام کرتی مگر لالی ایک آدھ بھینس کا دودھ دوہ کر تھک جاتی اور گاہکوں کو دودھ دینے لگتی۔ اس کی بہو صرف ایک کاٹھ کے تخت پر بیٹھی پیسے لیتی رہتی یا لالی اور بنسی مصروف ہوتے ۔ دودھ گاہکوں کے برتن میں ڈال دیتی۔ بنسی کے اتنے فائدے کے باوجود اور اس کی لمبی ملازمت کے ہوتے ہوئے بھی پیسے کے معاملہ میں لالی کا رویہ بالکل مالک کا سا تھا اور سخت مالک کا۔ وہ اس کو ٹوکتی بھی رہتی اور اسے ایک بھی پیسہ فالتو کبھی نہ دیتی۔ جوں جوں لالی کے پاس پیسہ زیادہ ہوتا جا رہا تھا توں توں وہ زیادہ کنجوس اور سخت ہوتی جا رہی تھی بنسی کے دو آنے سے آٹھ آنے روز بھی ان بیس برسوں میں دو تین دفعہ کی تکرار سے ہی بڑھے تھے۔

بنسی کو کچھ عرصے سے کھانسی زیادہ رہنے لگی تھی اور وہ کچھ تنگ رہتا تھا۔ وید کا خرچ بھی ایک مستقل خرچ میں تبدیل ہوتا جا رہا تھا۔ ساتھ ہی اس کا یہ احساس بھی مضبوط ہو گیا تھا کہ وہ زیادہ تنخواہ کا مستحق ہے۔ ایک روز جب لالی ابھی نہیں آئی تھی، اس نے بہو سے اس بات کا ذکر کیا اور جب لالی آئی تو اسے بھی کہہ دیا کہ لالی اب بارہ آنے روز کر دے لالی اس بات پر بڑی تلملائی اس نے صاف کہہ دیا کہ صرف صبح شام کے کام کے وہ اس سے زیادہ نہیں دے سکتی۔ لالی کچھ تیز ہو گئی اور اس نے بیس برس پہلے اس دن کا بھی ذکر کیا جب وہ بھوکا مرتا آیا تھا اور اس نے ترس کھا کر رکھ لیا تھا!

بنسی کام بدستور کر رہا تھا مگر اب وہ کافی سوچتا تھا اس کو آٹھ آنے سے زیادہ کی ضرورت تھی اور لالی نے اسے صاف نا کر دی تھی۔ اس کے شوق اور جوش کو دھکا لگا اور اس نے فیصلہ کیا کہ وہ بھی اتنی جان کیوں مارے۔ چنانچہ اس نے بھینسوں کو دونوں وقت نہلانے کی بجائے ایک وقت نہلانا شروع کر دیا اور ایک وقت میں ایک کام کرتا اور سنی ان سنی کر دیتا۔ اس نے دودھ بھی گاہکوں کو پورا تولنا شروع کر دیا بلکہ اوپر سے بھی کافی ڈال دیتا تھا۔ اس کی سستی بے دلی اور ناراضگی صاف ظاہر تھی اور جب اس نے ایک روز بہت زیادہ کام کی شکایت

کرتے ہوئے ایک اور نوکر رکھنے کو کہا تو لالی جھنجلا گئی اور زور سے بولی۔

" بالٹی یہیں چھوڑ دے۔ اگر تجھ سے کام نہیں ہوتا تو جا اپنا رستہ دیکھ۔ میں کئی دن سے دیکھ رہی ہوں۔ تیرے اب بڑے پر لگ گئے ہیں۔ کھانے کو ملنے لگا ہے نا۔"

اور لالی نے اٹھ کر بالٹی اس کے ہاتھ سے چھین لی اور پھر بولی۔

" چل یہاں سے۔ جا جہاں تیری مرضی ہو۔ میرے پاس آدمیوں کا کال نہیں ہے"

بنسی بھی غصے میں آگیا اور ہاتھ دھوتا ہوا بولا۔

" تو تجھے کوئی اور ملتا ہے تو لگا لے۔ میرے پاس بھی نوکری کا کال نہیں۔"

بھو نے بنسی کو کچھ کہنا چاہا تو لالی نے روک دیا۔ اور بولی

" جانے دے اس کو۔ مت کر بات اس سے۔ کل سے بھورا آجائے گا۔"

اور بنسی باہر نکل گیا۔ سڑک پر پہنچتے ہی اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ موتی کھمبے کے پاس بیٹھا تھا۔ بنسی کو دیکھتے ہی لپکا اور دُم ہلانے لگا۔ بنسی ایک طرف کو چلتا گیا اور موتی کو پچکارتا ہوا اپنے پیچھے لے آیا۔ موتی تھوڑی دور تک تو چلا مگر بازار پہنچتے ہی بھاگ کر واپس آگیا۔ بنسی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا اور ان بیس سالوں تک یہی ڈیری اور اس کی دہلیز اس کا گھونسلہ رہی تھی۔ اس کے ذہن میں خیالات گڈمڈ ہوئے تھے جن میں اداسی کا عنصر سب سے زیادہ تھا۔ وہ بازار کا ایک چکر لگا کر موجی کی ڈیری کی طرف مڑ گیا اور وہ رات اس نے وہیں کاٹی۔

اگلے روز اسے نوکری کی فکر ہوئی۔ موجی کی ڈیری میں کسی اور آدمی کے رکھنے کی گنجائش نہیں تھی وہ ایک دو اور ڈیریوں میں گھوما مگر سب جگہ ان کے اپنے آدمی لگے ہوئے تھے۔ ایک ڈیری میں رات کو گائے بھینسوں کی رکھوالی کے لئے آدمی کی ضرورت تھی بھی مگر اس نے بغیر کسی واقفیت کے گائے بھینسوں کے معاملے میں بنسی جیسے انجان آدمی کو رکھنے سے صاف انکار کر دیا اور بنسی لالی کا حوالہ دینا نہیں چاہتا تھا۔ دو تین روز گزر گئے اور وہ گھبرا گیا کہ بغیر نوکری کے وہ کیا

کرے گا۔ وہ صرف بھینسوں کا دودھ دُوہ سکتا تھا، ان کی سانی کر سکتا تھا اور انہیں نہلا سکتا تھا۔ لالی کے یہاں اسے بڑا نخرہ تھا اور وہ اپنے آپ کو ایک اہم آدمی سمجھتا تھا مگر یہ جان کر وہ حیران رہ گیا کہ اس کی دست کاری کی مانگ بہت کم تھی۔!

اس کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔ ایک روز جب وہ بے گار میں موجی کی بجائے اس کی سانی کر رہا تھا تو لالی کا لڑکا آیا اور بنسی سے بولا۔

"بنسی جس بڑھیا نے بیس سال سے تجھے بیٹوں کی طرح رکھا، اُسی کو چھوڑ آیا۔ شرم نہیں آئی تجھے؟ وہ بیچاری دن رات ہاتھ توڑ رہی ہے بھینسیں کھورا کے ہاتھ نہیں لگتیں اور وہ تیرے والی بھینس نے تو جب سے دودھ ہی نہیں دیا چل یہاں سے۔ سیانا بن۔ بڑھیا کل تیرا ذکر کر کے رو رہی تھی اور تو ایسے یہاں پڑا ہوا ہے۔ جیسے اس گھر میں کبھی رہا ہی نہیں۔"

بنسی نے اپنے ہاتھ روک دیئے اور ٹکٹکی باندھ کر لڑکے کی طرف دیکھتا رہا۔ اس کی نظروں کے سامنے وہ دن گھوم گیا جب وہ پہلے پہل لالی کے گھر آیا تھا اور اس نے ڈیری کی دہلیز کی چھاؤں میں بیٹھ کر اپنے بھوکے پیٹ کو بھرا تھا۔ کتنا عرصہ ہو گیا تھا اس بات کو، لالی کے گھر میں وہ جوان سے بوڑھا ہو گیا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھ دھوئے اور لالی کے لڑکے کے ساتھ ہی ہو لیا۔ وہ ڈیری میں ایک مجرم کی مانند داخل ہوا۔ لالی دودھ کی بھری بالٹی اٹھائے کھڑی تھی، بنسی کو دیکھ کر مسکرا کر بولی۔

"آ گیا دھکے کھا کر۔ چل کر کام اور آئندہ سے میرے سے پیسوں کی تکرار کری تو خبردار"

اور بنسی نے بالٹی اٹھائی، اسے مٹی سے رگڑ کر دھویا اور دو بھینسوں کو جو بغیر نہلائی کھڑی تھیں ہاتھ سے مل مل کر نہلانے لگا۔ انہیں نہلا چکا تو وہ ایک خالی بالٹی اٹھا کر ایک بھینس کے نیچے بیٹھ گیا۔ اس کے ہاتھ تھنوں پر مشین کی طرح چل رہے تھے!

ستاروں کی روشنی

اگرچہ میں اب موت کے بھیانک غار کے منہ پر تقریباً پہنچ چکی ہوں اور میری زندگی کا ٹمٹماتا ہوا دیا کسی وقت بھی بجھ سکتا ہے۔ لیکن مجھے بارہ برس پہلے کئے ہوئے اُس فیصلے پر آج بھی کوئی افسوس نہیں ہے۔ میں تو یہ دعویٰ نہیں کرسکتی کہ مجھے رشید سے پیار نہیں۔ یا اپنی پھول جیسی بچیوں کے لئے میرے سینے میں ماں کا دل نہیں۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود اپنے گرد اِس پھلواڑی کو سجا کر بھی میں ہمّت کے ساتھ موت سے بغلگیر ہونا چاہتی ہوں۔

جہاں تک مجھے یاد ہے میری صحت شروع ہی سے اچھّی تھی۔ میں اپنے اسکول اور کالج میں نہایت صحت مند لڑکیوں میں شمار کی جاتی تھی۔ مجھے خود اپنی بڑی بڑی آنکھوں کی شفاف چمک اور اپنے گالوں کی گولائی اور گلابی پن پر ناز تھا۔ اِس لئے جب شادی سے تقریباً چھ ماہ پہلے میری گردن پر عجیب سی گٹھلیاں نمودار ہوئیں تو اِس سے صرف میں ہی پریشان نہیں ہوئی۔ ابّا اور امّی تو بہت ہی گھبرا گئے۔ یہ گھبراہٹ قدرتی تھی۔ کیونکہ رشید سے میری شادی طے ہو چکی تھی۔ اور شادی کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ مجھے ابھی تک یاد ہے کہ ابّا جان کے پاؤں میں تو ایک چکّر سا بندھ گیا تھا۔ اور وہ حواس باختہ مجھے لے کر ڈاکٹروں کے پاس مارے مارے پھر رہے تھے۔ ڈاکٹروں نے اس بیماری

گے مختلف نام لیکر ہمیں بے حد ڈرایا تھا۔ اُن کا یہ کہنا تھا کہ یہ بیماری خطرناک ہے اور میری شادی نہیں ہونی چاہیئے ۔ دونوں باتیں والدین کے لئے کتنی پریشانی کا سبب ہوسکتی ہیں اِسے محسوس کرنا مشکل نہیں۔ میرے ابّا اور امّی کتنی ہی مرتبہ روئے تھے۔ اور جوں جوں وقت گزرتا جاتا تھا، ان کے چہروں پر غم کے سائے گہرے ہوتے جاتے تھے۔ میرے گالوں کے گلاب بھی مرجھا گئے اور چہرے پر ایک عجیب زردی سی چھا گئی۔ مجھے اپنی شکل سے خود ہی نفرت ہونے لگی۔ قدرت کے اس ستم پر میں روتی بھی تھی اور حیران بھی تھی۔ کہ خدا نے نہ جانے کون سے گناہ کی مجھے یہ سزا دی ہے۔ ابّا امّی سے اور مجھ سے بعض وہ باتیں جو ڈاکٹر میرے بارے میں بتاتے تھے چھپانے کی کوشش کرتے تھے۔ لیکن یہ بات مجھے معلوم ہو گئی تھی کہ میری بیماری لاعلاج ہے اور میرا جلد یا بدیر مرنا یقینی ہے۔

نہ جانے کیوں اِس سنگم پر جب میں زندگی اور موت کے درمیان لٹکی ہوئی معلوم ہو رہی تھی رشید مجھے بار بار یاد آتا تھا۔ رشید کا گھر میں تذکرہ ایک قدرتی بات تھی کیونکہ وہ میرا ہونے والا شریکِ حیات تھا۔ رشید کے ابّا اور میرے ابّا ایک ہی دفتر میں ملازم تھے۔ اور ہم ایک ہی محلّے میں رہتے تھے۔ رشید ہمارے ہاں شروع ہی سے آتا تھا۔ لیکن ہمارے پیار کا آغاز اُس وقت ہوا جب میں اُسی کالج میں داخل ہوئی جہاں رشید بھی پڑھتا تھا۔ ہم نے ایک معیاری محبّت کو اپنا مطمحِ نظر سمجھا تھا۔ اور ہماری یہی کوشش رہی کہ ہم کسی غلط رَو میں نہ بہہ جائیں۔ ہماری شادی ہونا کوئی مشکل بات نہیں تھی۔ اور ہمارے والدین ہمارے پیار کو جانتے تھے۔ جب ابّا نے پہل کی تو رشید کے ابّا نے شادی کی تجویز کو خوشی سے قبول کر لیا۔ اُس دن سے میری امّی شادی کی کیا کیا تیاریاں کرتی رہی ہیں یہ میں جانتی ہوں۔ میری اِس اچانک اور غیر متوقع بیماری نے سب کی امیدوں پر اوس ڈال دی! ابّا اور امّی نے میری بیماری کو پوشیدہ رکھنے کی بہت کوشش کی۔ لیکن ایسی باتیں بھلا کب چھُپتی ہیں۔ میری بہت سی سہیلیوں کو اس کا پتہ لگ گیا اور اُن میں سے کئی تو مجھ سے ملنا جُلنا بھی چھوڑ چکی تھیں۔ میں نے کالج چھوڑ

دیا۔ اور آخر رشید کے گھر والوں کو بھی اس کا علم ہو گیا۔ رشید چھ ماہ کے لئے لکھنؤ کوئی کورس کرنے گیا ہوا تھا اور ہم ایک دوسرے کو خط لکھتے تھے۔ لیکن میں نے اُن خطوں کی رنگینی کو کم نہیں ہونے دیا تھا اور اپنی بیماری اور پریشانی کی کوئی بھی جھلکی اُن میں آنے نہیں دی تھی۔ رشید کے گھر والوں کی پریشانی بھی لازمی تھی اور رشید کی والدہ تو ایک روز آکر صاف یہ اشارہ کر گئیں کہ اگر میں ایک دو مہینے میں اچھی نہیں ہوئی اور ڈاکٹروں نے اسے غدود کی ٹی۔ بی بتایا تو یہ شادی نہیں ہوگی۔

رشید کی والدہ بھی ٹھیک ہی کہتی تھیں۔ بھلا جہاں زندگی ہی کے لالے پڑ گئے ہوں وہاں شادی کا خیال کیسا؟ اپنے لئے کسی کی زندگی کو کیسے برباد کیا جا سکتا ہے۔ اور پھر اُس کی زندگی کو جسے میں بے حد چاہتی تھی۔ جس کی روشن زندگی کے چاند کے ارد گرد میں ان گنت خوشیوں کے ہالے دیکھنا چاہتی تھی۔ جس کی زندگی میں میں خود خوشی کی ایک کرن بننا چاہتی تھی۔ اب جب کہ وہ کرن ہی ماند پڑنے لگی تھی تو اس شادی کا سوال ہی کیا پیدا ہو سکتا تھا۔

میری یہ بیماری بھی بہت عجیب تھی۔ بس گلے میں پانچ چھ گلٹیوں کی ایک مالا سی جو کبھی غائب ہو جاتی اور کبھی اُبھر آتی۔ میری گردن کا دودھ سا رنگ بھی زردی مائل ہو گیا تھا اور نہ جانے کون سی چیز میرے چہرے کے خون کو چوس رہی تھی۔ کسی ڈاکٹر سے بھی اس کی صحیح تشخیص نہ ہو سکی اور کئی ڈاکٹروں کے خیال میں یہ غدود کی ٹی۔ بی نہیں تھی۔ بلکہ کوئی اور ہی عجیب بیماری تھی۔ گٹھلیوں کا کچھ عرصے غائب رہ کر پھر اُبھر آنا تو اُن کے لئے ایک بہت ہی پیچیدہ بات تھی۔ اور یہی بات آپریشن میں رکاوٹ بنتی تھی۔ ایک نئے ڈاکٹر سرکاری ہسپتال میں ولایت سے آئے تھے۔ انہیں بھی دکھایا۔ لیکن انھوں نے بھی مایوسی ظاہر کی اور آپریشن کی رائے بھی نہ دی۔

ابّا کی پریشانی روز بروز بڑھتی گئی۔ اور وہ دفتر سے سیدھے ہی ڈاکٹروں کی طرف چلے جاتے۔ اور رات گئے لوٹتے۔ امّی کا بھی غم کے مارے بُرا حال تھا۔ میں اکلوتی بچی تھی۔ اس لئے ابّا اور امّی کی آنکھوں کا تارا تھی۔ اور وہ طرح طرح کے علاجوں میں روپیہ پانی کی

طرح بہائے تھے لیکن اگرچہ میرے چہرے کا رنگ کچھ عود کر آیا تھا۔ لیکن میرے گلے کو کوئی فائدہ نہیں ہوا۔

میری شادی تین ماہ کے لئے ملتوی ہو گئی۔ رشید کو بھی شاید اس کی وجہ نہیں بتائی گئی۔ کیونکہ اُس نے خود مجھ سے خط میں دریافت کیا۔ رشید کے ابا بہت ہی نیک تھے اور انہوں نے ابا کی یہ بات مان لی تھی کہ میں اچھی ہو رہی ہوں۔ لیکن مکمل صحت کیلئے اگر شادی کی تاریخ کچھ بڑھا دی جائے تو بہتر ہو گا۔ شاید رشید کو صحیح وجہ سے یوں آگاہ نہیں کیا گیا کہ وہ مجھ سے بے حد پیار کرتا تھا اور اُسے میری بیماری کے بارے میں جان کر بہت مایوسی ہوتی۔ اگرچہ یہ سب باتیں میرے مفاد میں تھیں۔ لیکن میں جانتی تھی کہ میں کبھی اچھی نہیں ہو سکوں گی۔ اور بد قسمتی نے میری خوشیوں کو ہمیشہ کے لئے ڈس لیا ہے۔ کئی بار تو چاہا کہ میں خود رشید کو لکھ دوں۔ لیکن یہ سوچ کر کہ جس بات کو میرے اور رشید کے ابا چھپا رہے ہیں مجھے اس منزل پر بتانی نہیں چاہیئے۔ میں چپ ہو گئی۔

اور وہ تاریخ آئی جسے میری بیماری نے آگے بڑھا دیا تھا۔ اور گزر گئی۔ اُس وجہ سے میں بے حد اُداس تھی۔ اور امی اور ابا تو اداسی کی مجسّم تصویر تھے۔ وقت کچھ اور گزرا، اور امی اور ابا کا نظریہ بھی بدل گیا۔ وہ اِس بات کو قبول سا کر چکے تھے کہ میں اچھی نہیں ہوں گی اور یہ قسمت کا ایسا وار ہے جس پر صبر کے آنسو ہی بہائے جا سکتے ہیں۔ لیکن وہ یہ چاہتے تھے کہ کسی طریقے سے میری شادی ہو جائے۔ تاکہ میں اپنے گھر بار کی تو ہو جاؤں۔ اب اُن کی توجہ میرے علاج سے زیادہ اِس بات کی طرف تھی کہ رشید کے ساتھ میری شادی کا سلسلہ منقطع نہ ہو۔ اور وہ رشید کے گھر والوں کو یہ یقین دلانے کی کوشش کر رہے تھے کہ میں کافی ٹھیک ہو گئی ہوں۔ اور بہت جلد بالکل ٹھیک ہو جاؤنگی خدا جانتا ہے اُن کی اس بات میں دھوکے کا شائبہ بھی نہ تھا۔ اُس میں صرف وہ پیار تھا جو والدین کو بچوں سے ہوتا ہے۔

ایک روز امی نے مجھے بتایا کہ ابا مجھے کانپور لے جائیں گے۔ وہاں سول ہسپتال میں کوئی ڈاکٹر عمر حیات جرمنی سے طب کی اعلیٰ تعلیم پا کر آئے تھے۔ اور گلے اور سینے کے

امراض کے ماہر تھے۔ میں نے امی کو سمجھایا کہ میری قسمت میں اگر اچھا نہ ہونا ہی لکھا ہے تو علاج پر اتنا روپیہ ضائع کرنا ٹھیک نہیں۔ لیکن وہ یہ بات سُن کر صرف رو دیں۔ اور اُسی شام کو ابّا مجھے لے کر کانپور روانہ ہو گئے۔

ڈاکٹر عمر حیات کوئی پچپن سال کے بزرگ تھے۔ وہ ہسپتال کی سروس ہی میں سرکاری خرچ پر جرمنی گئے تھے۔ اور وہاں انہوں نے اعلیٰ ٹریننگ کے علاوہ کچھ ریسرچ بھی کی تھی۔ انہوں نے غور سے میرا معائنہ کیا اور گلے اور سینے کا ایکسرے لیا۔ ہمیں تین روز کانپور ٹھہرنا پڑا اور اس دوران میں ڈاکٹر عمر حیات نے میرے کیس کا معائنہ مکمل کر لیا۔ انہوں نے شام کو ہمیں اپنے گھر بُلایا۔ جس وقت ہم پہنچے تو وہ باہر ہی ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ وہ ہمیں اندر کے ایک چھوٹے سے کمرے میں لے گئے اور ابّا سے مخاطب ہو کر بولے۔

" میں نے اس بچّی کو جان کر آپ کے ساتھ بُلایا ہے۔ میری زندگی کا یہ تجربہ ہے کہ مریض کو صاف بات بتا دینے میں کوئی حرج نہیں۔ آپ شاید بچّی کو یہ بات خود نہ بتاتے بدقسمتی سے یہ بیماری مہلک ہے۔ اور ابھی میڈیکل سائنس میں اس کا علاج دریافت نہیں ہوا آپریشن اس میں بالکل ہلاکت ثابت ہوتا ہے۔ اس بیماری میں مریض ایک دم ختم نہیں ہوتا۔ لیکن دس سے پندرہ برس کے اندر اُس کا مرنا یقینی ہوتا ہے۔ یہ گٹھلیاں اسی طرح غائب ہوتی رہیں گی اور ظاہر ہوں گی۔ یہاں تک آخر میں ایک ایسی منزل آئے گی جب یہ دو تین سال تک نہ اُبھریں گی۔ لیکن پھر نمودار ہوتی ہیں اور اُس کے ایک سال کے اندر مریض ختم ہو جاتا ہے۔ یہ اس بیماری کا یقینی کورس ہے۔ یہ اور بات ہے کہ کوئی مریض دس سال میں مرے اور کوئی پندرہ سال میں ــــ یہ انتہائی بدقسمتی ہے کہ یہ لڑکی بھی اس بیماری کا شکار ہو گئی۔ "

ڈاکٹر عمر حیات کچھ دیر کے لئے چپ ہو گئے۔ ہم اس بیماری کے مہلک ہونے کے بارے میں پہلے ہی کافی سُن چکے تھے۔ اِس لئے ڈاکٹر کی باتوں نے میرے دل پر کوئی زیادہ خوفناک اثر نہیں ڈالا۔ ڈاکٹر صاحب پھر بولے۔

" دس پندرہ سال کا عرصہ بھی انسان کی زندگی میں کافی بڑا عرصہ ہوتا ہے۔ مریض کا

یہ عرصہ اگر خوشی میں گزر جائے تو اس سے بڑی بات کیا ہو سکتی ہے۔ شروع کے سال کے سو اس مرض میں مریض کی عام حالت خراب نہیں ہوتی۔ جب تک آخر میں معدہ پارہ گلٹیاں نہ نکل آئیں عام طور پر مریض بالکل تندرست نظر آتا ہے۔ کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ یہ لڑکی باقی زندگی نہایت خوشی میں گزارے ؟"

" مگر ڈاکٹر صاحب! اس کی تو خوشی ہی مٹ گئی۔ اس کی شادی اس کی مرضی کے مطابق طے ہو گئی تھی۔ لیکن وہ بھی ختم سمجھئے۔ اس کی تو باقی عمر نہ جانے کتنے دکھ میں گزرے گی۔"

" میں جانتا ہوں ہمارے ملک میں ایسی لڑکی کی شادی تقریباً ناممکن ہے۔ لیکن کاش اس لڑکی کی شادی ہو سکتی۔ جرمنی میں میری ملاقات ایک ایسے شادی شدہ جوڑے سے ہوئی تھی۔ اس لڑکی کو بھی یہی بیماری تھی۔ وہ اب دو تین سال اور جیئے گی۔ لیکن وہ جوڑا بہت ہی خوش و خرم تھا۔ انہوں نے پیار اور خوشی کے دس سال گزار لئے ہیں۔ اور وہ دونوں جانتے ہیں کہ انہیں جلد ہی ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے سے جدا ہونا ہے۔ لیکن وہ بڑے خوش تھے۔ مگر یہ تصور، خیال کی اتنی بلندی ہم لوگوں میں بہت مشکل بات ہے۔ کاش ہم جینے کا وہ طریقہ بھی جانیں۔ کیا اس لڑکی نے اپنے ہونے والے شوہر کو دیکھا ہے ؟"

" ہاں، بچپن ہی سے یہ ساتھ کھیلے ہیں۔ اور انہیں ایک دوسرے سے بہت پیار ہے۔ لیکن اُسے ابھی اس بیماری کا علم نہیں ہوا۔ کیونکہ وہ باہر ہے۔ اس بیماری کے ہوتے ہوئے یہ شادی کیسے ہو سکتی ہے ؟"

" سنئے، کیا آپ دس پندرہ منٹ مجھے اس بچی سے تنہا بات چیت کرنے کی اجازت دیں گے ؟ یہ آپ کے سامنے شرمائے گی۔ اور مجھے کئی ایسی باتیں نہیں بتائے گی جو میں جاننا چاہتا ہوں۔ میں اُس نوجوان کے بارے میں کچھ پوچھوں گا۔ آپ ذرا برآمدے میں بیٹھ جائیے یا باغ میں ٹہل لیں۔"

ابا اٹھ کر باہر چلے گئے۔ اُن کی آنکھوں میں شفاف پانی جھلمل کر رہا تھا۔ اُن کے جانے کے بعد ڈاکٹر عرحیات بولے ۔

" بیٹی اُس نوجوان کا کیا نام ہے ؟ "

" رشید "

" کیا وہ تمہیں بے حد پیار کرتا ہے ؟ "

" جی ہاں ۔۔۔ ہم دونوں ہی ایک دوسرے کو بہت چاہتے ہیں "

" سنو، میں تم سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔ اِس بیماری میں شادی ٹھیک تو نہیں لیکن میں تمہیں اس کی رائے دیتا ہوں۔ دس بارہ سال کی ہنسی خوشی کی شادی شدہ زندگی بڑی بات ہے۔ اگرچہ وہ بے بچوں کی ہوگی۔ اس بیماری میں بچوں کی پیدائش ٹھیک نہیں جہاں تک بچے کے سوال پر احتیاطوں کا تعلق ہے، میں تمہاری رہنمائی کروں گا۔ کیا تم شادی کے لئے اُسے رضامند کر سکتی ہو ؟ "

" میں نہیں کہہ سکتی۔ لیکن کیا اپنے لئے کسی کی زندگی کو برباد کرنا گناہ نہیں ہوگا؟ "

" نہیں، بالکل نہیں۔ یہ اپنا اپنا نظریہ ہے۔ دس پندرہ برس ایک بڑا عرصہ ہوتا ہے۔ لوگوں کی ایک بڑی تعداد ایسی ہے جن کی بیویاں پانچ دس برس بھی زندہ نہیں رہتیں۔ ہاں اِس میں لڑکے کی جانب سے بڑی قربانی کی ضرورت ہے۔ میں نہیں جانتا وہ لڑکا کیسا ہے۔ لیکن اگر وہ تم سے واقعی پیار کرتا ہے تو وہ کسی اور کے ساتھ بیس پچیس یا زیادہ سال گزارنے کی بجائے تمہارے ساتھ خوشی اور اطمینان کے دس سال گزارنا زیادہ پسند کرے گا۔ میرا کہا مانو اور تم رشید سے خود مِل لو۔ "

" لیکن رشید کی والدہ اور دوسرے گھر والے یہ شادی نہیں ہونے دیں گے۔ "

" تم رشید سے مل تو لو۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ اُس کا ماننا کوئی غیر معمولی بات نہیں ہوگی۔ اور وہ والدین کو بھی منا لے گا۔ لیکن سُنو ! "

" فرمائیے ؟ "

" لڑکے سے کچھ بھی نہ چھپانا اُسے میرے پاس لا سکو تو بہت ہی اچھا ہوگا۔ میں اُسے سب کچھ بتا دوں گا۔ اور اُسے فیصلہ کرنے میں مدد دوں گا۔ اگر وہ مان گیا تو میں تمہاری شادی میں بھی شریک ہوں گا۔ لو اب تم ذرا باہر بیٹھو اور ابا کو بھیج دو "

ڈاکٹر عمر حیات نے ابّا سے بھی دس پندرہ منٹ بات کی۔ جب ہم گھر لوٹے تو امّی بے حد خوش ہوئیں اور انہوں نے بے تابی سے پوچھنا شروع کر دیا۔ میں الگ ہو گئی اور کمرے میں جا بیٹھی۔ شاید ابّا نے امّی کو کوئی اچھی ہی بات بتائی ہو گی۔ کیونکہ وہ جب میرے پاس آئیں تو بے حد خوش تھیں۔

اور میں ایک تذبذب میں پڑ گئی۔ نہیں میں نے فیصلہ کیا، میں ہرگز رشید کی زندگی برباد نہیں کروں گی۔ میں اُسے صاف بتا دوں گی کہ میں ایک خطرناک بیماری میں مبتلا ہوں اور میں نہیں چاہتی کہ یہ شادی ہو۔ میں اپنے پانچ دس برس ہنسی خوشی میں گزار کر اُسے تباہ کرنے کی خود غرضی کا شکار نہیں ہو سکتی۔ میں نے رشید کو چٹھی لکھ دی کہ میری طبیعت بہت خراب ہے۔ اور وہ ایک دو روز کے لئے چلا آئے ویسے اس کا کورس بھی اب ختم ہونے والا تھا۔

رشید چلا آیا۔ اور ایک مرتبہ پھر میرے پیار کے لمحوں نے جنم لیا۔ جس دن وہ ہمارے گھر آیا امّی نے اتنی بلائیں لیں، اُس کی اتنی خاطر تواضع کی کہ وہ شرمندہ ہوا جاتا تھا۔ ابّا کچھ دیر کے لئے باہر چلے گئے۔ اور امّی اوپر اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ میں جانتی تھی مجھے جان کر رشید کے ساتھ تنہا چھوڑا گیا ہے۔ میرا دل بھر آیا اور میں اپنا سر گھٹنوں میں ڈال کر رونے لگی۔ رشید نے میرا سر اٹھایا اور بولا۔

" سکینہ تمہیں ہوا کیا ہے۔ مجھے سب کچھ پتہ لگ گیا ہے۔ لیکن تم پریشان کیوں ہوتی ہو۔ میرا تمہارا پیار اٹوٹ ہے۔ تمہیں تپ دق ہی کیوں نہ ہو میرا عہد نہیں ٹوٹ سکتا تم میری ہو چکی ہو۔ اور اگر ڈاکٹری مشورہ اِس کے خلاف نہیں تو یہ شادی ضرور ہو گی میں نے ابّا کو بھی کہہ دیا ہے۔"

" آپ کے اِن خیالوں کی مجھے بے حد قدر ہے۔ میں آپ کے پیار کو جانتی ہوں لیکن میں آپ کی زندگی برباد کرنا نہیں چاہتی۔ آپ شادی کہیں اور کر لیجئے۔ اور مجھے بھول جائیے۔"

" یہ تو کبھی بھی نہیں ہو سکتا۔ اگر شادی کے بعد تمہیں یہ بیماری ہو جاتی تو کیا میں

تمہیں چھوڑ دیتا ؟"

اور اس کے بعد رشید دوڑ کر اُوپر گیا۔ اور اس نے امّی سے کہہ دیا کہ وہ شادی کی تیاری کریں۔ امّی نے جوں ہی یہ سُنا اُن کی آنکھوں میں خوشی کی لَو لپک اٹھی۔ اور اس دن آبا اور امّی بے حد خوش رہے۔ اور میں خود بھی ایک مرتبہ تو اپنی بیماری کے بارے میں سب کچھ بھول گئی۔ میں اور رشید ڈاکٹر عمر حیات کے پاس کانپور بھی گئے۔ اُن کی شخصیت سے میں بے حد متاثر ہوئی تھی اور میں اُنہیں اپنے ہر فیصلے میں شریک کرنا چاہتی تھی۔ وہ رشید سے مل کر بے حد خوش ہوئے۔ اور اُسے اُنہوں نے ساری بات صاف صاف بتادی۔ لیکن رشید نے ذرا بھی فکر کا اظہار نہیں کیا اور ڈاکٹر عمر حیات نے اُس کے اِس فیصلے کو بہت سراہا۔

اور وہ تاریخ آہی گئی جب میرے ہاتھوں میں مہندی رچی۔ گھر کے آنگن میں میلہ لگا اور دروازے پر شہنائیاں بجیں۔ قدرت کو مجھے دُلہن بنانا تھا۔ اور میں دُلہن بنی۔ ڈاکٹر عمر حیات بھی شریک ہوئے جس سے ہماری خوشی میں اور بھی اضافہ ہوگیا۔

شادی کے بعد میں کچھ عرصے رشید کے ساتھ یہیں رہی۔ اور پھر جب رشید کو لکھنؤ میں ملازمت مل گئی تو ہم لکھنؤ چلے آئے۔ میں نے اپنے شوہر کی خدمت کرنے میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی۔ جس شخص نے اپنی محبّت اور اپنے عہد کو قائم رکھنے کے لئے اپنی زندگی کی بازی لگادی ہو۔ اور ایسی جس میں ہار یقینی ہو۔ اُس سے زیادہ میرے نزدیک کون ہوسکتا تھا۔ وہ مستقبل سے بے خبر میرے ساتھ اتنی ہنسی خوشی سے زندگی گزار رہا تھا جیسے میں کبھی اُس سے جُدا نہ ہوں گی۔ میرا شوہر کتنا سادہ اور شریف ہے، یہ سوچ کر میں فخر سے جھوم اُٹھتی۔ اور مجھے ڈاکٹر عمر حیات کی اِس بات میں بہت صداقت نظر آتی کہ محبت کے چند سال ایک لمبی کھوکھلی زندگی سے بہتر ہیں۔

ہم دونوں خوشی کی زندگی گزار رہے تھے۔ اتنی خوشی تھی ہماری زندگی میں کہ میں اُسے بیان نہیں کرسکتی۔ مہینے اور سال تیزی سے لپک رہے تھے۔ اور تین چار

سال دوڑ کر گزر گئے۔ ہمارے کوئی بچہ نہیں ہوا تھا اور ڈاکٹر عمر حیات کے مشورے اس بارے میں ہمارے مددگار تھے۔ لیکن جب تقریباً پانچ برس گزر گئے تو ہم دونوں یہ محسوس کر کے حیران رہ گئے کہ بچّے کے بغیر ہماری خوشی پوری نہیں تھی۔ لیکن کوئی بھی لغزش ہمیں بہت مہنگی پڑ سکتی تھی۔ اِس لئے بچّے کی بے حد خواہش ہوتے ہوئے بھی ہم نے صبر کرنا ہی مناسب سمجھا۔ لیکن رشید نے ایک دن ڈاکٹر عمر حیات کو چٹھی لکھ ہی دی۔ لیکن اُن کا وہی جواب آیا کہ بچہ ہمارے لئے ٹھیک نہیں اور اِس سے آنے والی زندگی کی تلخی بڑھ سکتی ہے۔ رشید خاموش ہو گیا۔

پھر اتفاق سے ڈاکٹر عمر حیات کا تبادلہ بھی لکھنؤ سول ہسپتال ہو گیا اور وہ لکھنؤ میں آ گئے۔ وہ ہمارے اتنے قریب ہو گئے۔ اِس کی ہمیں بے حد خوشی ہوئی۔ ہم اپنی شامیں اکثر اُن کے ہاں ہی گزارتے۔ ایک دن رشید نے پھر بچّے کا ذکر چھیڑ دیا۔ تو وہ بولے ــــ

"میں جانتا ہوں بچّے کی خواہش قدرتی ہے۔ میں اس بارے میں سوچتا رہا ہوں میں دو باتوں کی بنا پر اِس کے خلاف ہوں۔ ایک تو بچّے تمہارے لئے بعد میں بوجھ ثابت ہو سکتے ہیں۔ اور دوسرے وہ سکینہ کی عمر بھی کم کریں گے۔"

"لیکن کیا ہم اپنی خوشی کو بڑھا کر عمر کو کم نہیں کر سکتے؟ اس میں میری اور سکینہ دونوں کی ہی خوشی ہے۔" رشید بولا۔

"ہاں اس بات میں جان ہے۔" ڈاکٹر عمر حیات سوچ کر بولے۔ "زیادہ خوشی کے بارہ تیرہ سال کم خوشی کے پندرہ سال کے برابر ہو سکتے ہیں۔ بشرطیکہ اتنا وسیع نظریہ کوئی رکھے اور میرا خیال ہے کہ آپ دونوں کی شادی شدہ زندگی اتنی مسرور ہے کہ شاید بچّے سکینہ کی باقی زندگی پر اثر نہ ڈالیں۔"

اور پھر ہمارے بچّے ہو گئے۔ پہلے نجمہ اور پھر شبیر۔ دونوں کھلتے ہوئے معصوم پھول جنہوں نے ہماری خوشیوں میں بے حد اضافہ کر دیا۔ جُوں جُوں یہ بڑے ہوتی گئیں ہماری آنکھوں میں خوشی کے دیئے زیادہ روشن ہوتے گئے۔ اور بچّوں کی معصوم چہک کمروں میں

آنگن میں، کچن میں اور کونے کونے میں زندگی بھر دیتی ہے۔ اِس احساس کو ہم نے جی بھر سمیٹ لیا۔

اب جب میں اِن سب خوشیوں کو لُوٹ چکی ہوں۔ اور نجمہ چار سال اور شیریں دو سال کی ہے اور شادی کو تقریباً بارہ برس ہو گئے ہیں تو وہ گُتھلیاں پھر ابھر آئی ہیں۔ میرا چہرہ پھر زرد پڑ گیا ہے۔ اور میں بستر سے لگ گئی ہوں۔ ڈاکٹر عمر حیات مجھے ہر روز دیکھنے آتے ہیں۔ لیکن وہ جھوٹ نہیں بولتے اور کہنا نہیں چاہتے کہ میں بچ جاؤں گی۔ لیکن وہ میری ہمت بندھا دیتے ہیں کہ میں اور رشید دونوں بہادر ہیں اور ہم نے ہمّت سے خوشی اور محبت کے چند سال گزارے ہیں۔ رشید کی خوشی میں اگرچہ اُداسی گھُل گئی ہے لیکن اُس نے ہمّت ابھی نہیں ہاری ہے۔ وہ نہ محض میری خدمت کرتا ہے، بلکہ بچیوں کا سارا کام بھی خود ہی کر رہا ہے۔ لیکن میرا اور رشید کا کیا مقابلہ؟ میرے نزدیک اُس میں اور خدا میں اُتنا ہی فرق ہے جتنا ایک مکمل انسان اور خدا میں ہوتا ہے۔ میں پھر عورت ہوں اور میرا دل کئی مرتبہ بچیوں کے پیار اور محبت میں پھنس کر ڈوبنے لگتا ہے۔

میں اکثر سوچتی ہوں، کاش اِن لڑکیوں کے بجائے لڑکے ہو جاتے تو رشید کی پریشانیاں کم ہو جاتیں۔ کبھی میں سوچتی ہوں میں نے گناہ کیا ہے، اور میں نے رشید کی زندگی جان بوجھ کر برباد کی ہے۔ کبھی یہ خیال آتا ہے کہ ڈاکٹر عمر حیات گناہ گار ہیں۔ لیکن پھر اِن پریشان کن خیالات کے بہاؤ میں کہیں سے غبار کی چادر سی پھٹتی ہے اور ستاروں کی روشنی کوندجاتی ہے!

خوشی اور محبت کے چند سال، بھرپور اطمینان کے چند برس جو ہم نے جئے ہیں جنہیں رشید نے میرے ساتھ گزارا ہے، وقت کی دُھند میں بہت ہی چمکدار ستارے نظر آتے ہیں جس کی روشنی سے کون زندگی نہیں پائے گا؟

محبّت کا جادو

رام پرشاد نے گھر میں گھستے ہی سنہری کی ماں کو آواز دی۔ وہ آئی تو اس نے اس کے کان میں کچھ کھسر پھسر کی۔ پھر وہ چولہے پر بیٹھی ہوئی سنہری کی طرف بڑھا اور کڑک کر بولا "سنہری، دیکھ اگر میں نے پھر کبھی تجھے شیرا سے بات کرتے دیکھا تو مجھ سے بُرا کوئی نہ ہوگا۔ ان کے گھر کا کوئی بھی آدمی میری گلی میں قدم نہیں رکھ سکتا۔ اپنے آپ کو ٹھیک کر لے، ورنہ اس کا انجام بُرا ہوگا۔"

رام پرشاد کا غصہ سارے گاؤں میں مشہور تھا، اور اگرچہ اب وہ باسٹھ سال کا تھا مگر اس کی آواز میں ابھی تک بڑی کڑک تھی۔ سنہری اس کی پہلی بیوی سے اُس کی اکلوتی لڑکی تھی اور شادی کے بائیس سال بعد، جب وہ بیالیس سال کا تھا، ہوئی تھی۔ مگر اس کے پیدا ہونے کے ایک سال بعد ہی سنہری کی ماں گزر گئی تھی اور رام پرشاد نے کہنے سننے سے دوسری شادی ایک بیوہ بنتو سے کر لی تھی۔ بنتو نے سنہری کو اتنے پیار محبت سے پالا تھا جیسے وہ اس کی کوکھ سے ہی پیدا ہوئی ہو۔ سنہری کو بڑا ہونے پر جب کسی نے یہ بتایا تھا کہ بنتو اس کی سوتیلی ماں ہے تو وہ بڑی حیران ہوئی تھی، کیونکہ بنتو نے اسے ہمیشہ حقیقی ماں کا پیار دیا تھا۔

رام پرشاد سنار تھا، مگر یہ کام اس نے اپنی پہلی بیوی کے مرنے کے بعد چھوڑ دیا تھا۔ گھر میں گزارے کے لئے پیسہ کافی تھا اور اس کی اپنی زمین بھی تھی۔ شیرا اس گاؤں میں مدت سے بسنے والے ایک ٹھاکر راجپوت گھرانے کا نوجوان تھا، جن کی گاؤں میں کافی زمین تھی۔ شیرا کے پیدا ہونے سے بہت پہلے اس کے دادا بلبیر سنگھ اور رام پرشاد کے باپ رام دھن میں زمین کے لئے پانی کی تقسیم کے معاملہ پر کافی جھگڑا ہو گیا تھا اور اس وقت سے ان دونوں خاندانوں میں دشمنی چلی آ رہی تھی۔ جھگڑا کرنے والے تو کب کے اس دنیا سے چلے گئے تھے، مگر شیرا کے باپ شمشیر سنگھ اور رام پرشاد کے دلوں میں دشمنی کی آگ ابھی سرد نہیں ہوئی تھی۔ لیکن سنہری اور شیرا تو نئی پیڑھی کے تھے اور دونوں کو اس خاندانی دشمنی کا احساس تک نہیں تھا۔

سنہری تقریباً اٹھارہ سال کی الھڑ سی لڑکی تھی۔ وہ گیہوں کی کچی بالی کی طرح نرم و نازک، تازہ اور رس بھری تھی۔ اس کے جسم کی رنگت میں صبح کے سورج کی کرنوں کی سی چمک ملی ہوئی تھی اور رخساروں پر جنگلی گلاب کی سی شگفتگی اور شادابی تھی۔ اس کی بڑی بڑی معصوم شفاف آنکھیں کسی بے تاب ہرنی کی آنکھوں کی طرح ہر وقت کچھ ڈھونڈتی سی رہتی تھیں۔ ہونٹوں کی پنکھڑیاں اور دانتوں کی لڑیاں بڑی خوبصورت تھیں اور وہ ہنستی تھی تو کسی مہتابی کے چھوٹنے کا گمان ہوتا تھا۔ شیرا کوئی بیس اکیس سال کا گبرو نوجوان تھا، بہادر اور فراخ دل، جو اپنے حقوق کے لئے لڑنا جانتا تھا، مگر اپنے دشمن سے لڑائی کے بعد بغل گیر ہونے کے لئے بھی تیار رہتا تھا۔ وہ خاندانی دشمنی کے خیال سے بے گانہ اپنے کھیتوں پر رام پرشاد کی گلی میں سے گزر کر جاتا تھا، اور اس کی اصل وجہ بلاشبہ سنہری تھی، جسے اس نے بچپن سے دیکھا تھا۔ وہ سنہری سے بے پناہ محبت کرتا تھا اور دونوں چوری چھپے ایک دوسرے سے ملتے تھے ــــــ

رام پرشاد جب سنہری پر برس کر اور اپنا حقہ لے کر باہر ڈیوڑھی میں بیٹھ گیا تو سنہری اٹھی اور اندر جا کر چارپائی پر لیٹ گئی اور دھیرے دھیرے رونے لگی۔ اس

کی ماں بنتو اس کے پاس آکر بیٹھ گئی اور اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر دلاسہ دینے لگی۔ سنہری جانتی تھی کہ اس کا باپ بڑا غصیلا اور ضدی ہے۔ وہ کبھی اس کا ہاتھ شیرا کے ہاتھ میں دینے کے لئے تیار نہ ہوگا اور شیرا کے بغیر سنہری زندگی کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔

رام پرشاد نے سنہری پر زیادہ نگرانی رکھنی شروع کر دی۔ وہ یہی کوشش کرتا کہ باہر کے کام کے لئے سنہری کو بھیجنے کی بجائے خود ہی چلا جائے یا بنتو کو بھیج دے، گھر میں کسی اور آدمی کے نہ ہونے کی وجہ سے وہ اس معاملے میں کافی بے بس تھا اور کبھی کبھی کسی کام کے لئے سنہری کو باہر بھیجنا ناگزیر ہی ہو جاتا تھا۔ ان دنوں اسے ایک دن کے لئے اپنے بڑے بھائی کے یہاں بھی جانا تھا، جو پچاس میل دور فیض آباد کے پاس ایک گاؤں میں رہتا تھا۔ مگر سنہری اور شیرا کی وجہ سے وہ ایک دن کے لئے بھی گاؤں سے باہر جانا نہیں چاہتا تھا، کیوں کہ بنتو سیدھی تھی اور اُسے چکمہ دینا مشکل نہیں تھا۔ لیکن ایک روز اسے معلوم ہوا کہ شیرا کسی کام سے ایک ہفتے کے لئے گاؤں سے باہر چلا گیا ہے تو وہ اسی روز گاؤں سے اگلے روز آنے کے لئے کہہ کر چل پڑا اور بنتو کو کافی احتیاط رکھنے کی ہدایت کرتا گیا۔

سنہری جتنا شیرا کے بارے میں سوچتی اتنا ہی اس نتیجے پر پہنچتی کہ وہ شیرا کے بغیر نہیں رہ سکے گی۔ وہ اسی سوچ میں ڈوبی ہوئی آنگن میں آلو چھیل رہی تھی کہ بنتو اس کے پاس آکر بیٹھ گئی اور کہنے لگی۔ "سنہری، یوں اپنا جی ہلکان نہ کر۔ میں نے تیرے بارے میں بہت سوچا ہے اور تیرے باپو کے آنے سے پہلے میں تجھے اپنے من کی بات بتا دینا چاہتی ہوں۔ شیرا ہر طرح سے اچھا لڑکا ہے اور تیرے لئے بالکل ٹھیک ہے۔ میں اس بات کو نہیں مانتی کہ تیرے اور اس کے پُرکھوں کے درمیان کبھی جھگڑا ہوا تھا تو تیرا اور اس کا بیاہ نہیں ہو سکتا۔ مگر تیرا باپو ضد کا بڑا پکا ہے اور اس کو منانا میرے بس کی بات نہیں۔"

سنہری ماں کی بات سن کر حیران سی ہو گئی۔ کیوں کہ اُسے یہ اُمید نہیں تھی کہ ماں

کی ہمدردی اس کے ساتھ ہوگی۔ اس نے آلو چھیلنے چھوڑ دیئے اور ماں سے لپٹ گئی۔ موٹے موٹے گرم آنسو اس کی آنکھوں سے گرنے لگے۔ ماں نے اُسے پچکار کر اور دلاسہ دے کر الگ کر دیا۔ سنہری پھر آلو چھیلنے لگی۔ رام پرشاد اگلے دن دوپہر تک آنے کو کہہ گیا تھا، مگر نہ آیا۔ ماں بیٹی دن بھر انتظار دیکھتی رہیں۔ رات کو بھی انہوں نے روٹی بڑی دیر سے کھائی مگر رام پرشاد نہیں آیا۔ بات یہ ہوئی کہ رام پرشاد اپنے بھائی کے گھر چھت پر سے اُتر رہا تھا کہ سیڑھیوں پر لڑھک کر گر گیا۔ اور اس کی دائیں ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ پہلے اس کے علاج کے لئے ایک پہلوان کو بلوایا گیا، مگر اس نے ہڈی کو جوڑنے کی بجائے شاید اور زیادہ توڑ دیا کیوں کہ رام پرشاد بری طرح تڑپا اور چلایا تھا۔ شام کو انہوں نے ایک دوسرے گاؤں سے وید کو بلوایا۔ اس نے تمام ٹانگ پر مرہم کی پٹیاں کس کر باندھ دیں۔ کھانے کے لئے بہت سی زہر مار گولیاں دیں اور ایک ہفتے تک بستر پر لیٹنے کی ہدایت کی۔ مگر رام پرشاد کے لئے تو ٹھہرنا ناممکن تھا کیوں کہ شیرا کا پتہ نہیں تھا کہ کب لوٹ آئے اور گھر پر سنہری اور بنتو اکیلی تھیں۔ اس نے بڑی مشکل سے رات کاٹی اور اگلی صبح سب لوگوں کی نصیحت کو رد کرتا ہوا وہاں سے چل پڑا۔ اس کا بھائی اور دو آدمی اُسے تقریباً گود میں اٹھا کر اور اس کے ہاتھ میں ایک لاٹھی تھما کر بس میں بٹھا گئے۔ وہ دو بجے دوپہر کو بس کے اڈے سے دو آدمیوں کی مدد سے ایک ایکے میں سوار ہو کر گھر پہنچ گیا۔ گھبرائی ہوئی بنتو اور سنہری نے پڑوس کے دو آدمیوں کو بلوا کر اُسے ایکے سے اتروایا اور اندر لے آئیں۔

شام کو رام پرشاد کو بخار ہو گیا۔ ماں اور بیٹی کافی رات تک اس کے پاس بیٹھی رہیں۔ سنہری یہاں کے وید سے بھی بخار اور چوٹ کی دوا لے آئی تھی۔ رام پرشاد اُن آدمیوں میں سے تھا جن میں غضب کی قوتِ برداشت اور حوصلہ ہوتا ہے اور جو جلد ہی اپنی اس قسم کی چوٹوں پر قابو پا لیتے ہیں۔ چنانچہ صرف تین چار دن کی تکلیف، بے چینی اور خود پر اور گھر والوں پر بات بات پر غصہ ہونے کے بعد اس نے اپنے آپ کو ٹھیک کر لیا اور ایک دفعہ پھر اپنے گھر پر حکومت کرنے لگا۔ ابھی وہ

لنگڑا کر صرف لاٹھی کے سہارے چل سکتا تھا، مگر بڑی بات یہ تھی کہ وہ کھڑا ہو گیا تھا جب کہ وید کا یہ کہنا تھا کہ بستر پر دو مہینے لیٹنا ہوگا۔ گھر پر جتنے لوگ اس کی خیرِ عافیت پوچھنے آتے، وہ ان سے شیرا کے لوٹنے کے بارے میں بھی پوچھتا۔ جب اُسے پتہ لگا کہ وہ کل آجائے گا تو وہ کچھ فکر مند ہو گیا۔ اس نے اب دوا کی بھی ضرورت محسوس نہیں کی اور سنہری کو باہر بھیجنا تقریباً بند کر دیا۔

شیرا لوٹ آیا۔ رام پرشاد کے گھر کے پچھواڑے کی طرف، جہاں سنہری دن میں بیٹھا کرتی اور رات کو سوتی تھی، وہ سیٹیاں پھر بجنے لگیں جن کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ سنہری باہر آسکتی ہے تو آجائے کیوں کہ شیرا باہر انتظار کر رہا ہے۔ لیکن اکثر سنہری کے لئے باہر جانا بڑا مشکل ہوتا اور یہ سیٹیاں کوئل کی کوک کی طرح بجتی رہتیں اور پھر ٹیلے کی طرف لوٹ جاتیں۔

ایک روز گرمی بہت تھی۔ رام پرشاد نے اپنی چارپائی ہوا کی وجہ سے آنگن کی بجائے ڈیوڑھی کے باہر بچھوالی۔ آنگن میں سنہری اور بنتو لیٹی تھیں۔ بنتو آج دن بھر اناج صاف کر کے بوریوں میں بھرتی رہی تھی اور اتنی تھک گئی تھی کہ لیٹتے ہی سو گئی۔ رات کے ساڑھے نو بجے ہوں گے، اگرچہ گرمیوں میں یہ وقت کچھ بھی نہیں ہوتا مگر یہ ایک چھوٹا سا گاؤں تھا اور اس وقت ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ سنہری جاگی ہوئی تھی۔ وہ رام پرشاد کی آخری چلم بھر کر اس کے حقّے پر رکھ آئی تھی اور دن کا یہ آخری کام بھی ختم ہو گیا تھا۔ اچانک باہر سے شیرا کی سیٹی کی آواز آئی۔ آج وہ اپنی سیٹی بار بار دُہرا رہا تھا۔ سنہری اپنے اوپر قابو نہ پا سکی۔ اُس نے دبے پاؤں اُٹھ کر ماں کو دیکھا اور یہ اطمینان کر لیا کہ وہ گہری نیند میں تھی۔ پھر وہ باہر ڈیوڑھی میں آئی اور دروازے سے لگ کر باپو سے پوچھا کہ اُسے پانی تو نہیں چاہیئے، مگر جواب میں اس کے خرّاٹے سن کر لوٹ آئی۔ اُس نے آنگن کا دروازہ آہستہ سے کھولا اور تاروں بھری رات میں باہر نکل آئی۔ تھوڑی ہی دور پر شیرا ایک درخت سے لگا کھڑا تھا۔ وہ دوڑ کر اس کے پاس پہنچ گئی۔ شیرا نے اُسے اپنی

بانہوں میں بھر لیا اور دونوں ٹیلے کی طرف چل پڑے۔

اِس ڈر سے کہیں باپو کی آنکھ نہ کھل جائے وہ جلد ہی واپس آ گئی، مگر وہ رات اس نے بڑے تذبذب میں کاٹی، کیوں کہ شیرا نے آج ایک اور ہی تجویز اس کے سامنے رکھ دی تھی۔ اس نے اعلان کر دیا تھا کہ اس نے اس کے ساتھ بیاہ کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے اور اس کے گھر والے اس کا ہر طرح ساتھ دینے کو تیار ہیں۔ شیرا کی تجویز یہ تھی کہ سنہری اس کے ساتھ اس کے گھر چلی چلے۔ اگلے دن وہ اس کے ساتھ مندر میں بیاہ کرے گا اور گاؤں والے کچھ بھی کہیں وہ ہر ایک بات کا مقابلہ کرے گا۔ گھر سے اس طرح بھاگ جانے کا سنہری نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا اور وہ بہت گھبرا گئی تھی۔ مگر سوچ سوچ کر وہ اس نتیجے پر پہنچی کہ اس کی زندگی چاہے برباد ہو جائے مگر وہ کوئی ایسا کام نہ کرے گی جس سے ماں باپ کی عزت خاک میں مل جائے۔

دو دن کی بات ہے۔ کوئی نو بجے ہوں گے۔ آسمان پر گھنگھور گھٹا چھائی ہوئی تھی اور تاریکی سے اس میں روپوش ہو گئے تھے۔ کبھی کبھی بجلی چمک جاتی تھی اور بادلوں کی خوف ناک گڑگڑاہٹ دل کو دہلا رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا بارش آج ٹوٹ کر برسے گی۔ سنہری اور بنتو گھر کے کام سے فارغ ہو کر پچھلے کمرے میں لیٹ گئی تھیں۔ رام پرشاد کی ٹانگ کا درد آج کچھ زیادہ بڑھ گیا تھا۔ وہ وقت سے پہلے ہی ڈیوڑھی کا دروازہ بند کر کے وہیں لیٹ گیا تھا اور اس نے بنتو کو ہدایت کر دی تھی کہ اگر گائے بولے یا بارش ہو جائے تو جا کر گائے کو اندر کھیرل میں باندھ دے کہ موسم خوش گوار تھا۔ بنتو سنہری کو بتا رہی تھی کہ اس نے اس کے بیاہ کے لئے کیا کیا سامان تیار کر لیا ہے، مگر سنہری اس ذکر پر رونے لگی تھی۔ اتنے میں گائے کے زور زور سے بولنے کی آواز آئی۔ ماں نے سنہری سے باہر جا کر گائے اندر باندھ آنے کو کہا اور سنہری کھڑکی میں سے ہی باہر نکل گئی۔

سنہری گائے کو باندھ کر نکلی ہی تھی کہ شیرا نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا وہ تھوڑی دیر

پہلے سے باہر کی کھپریل کے پیچھے کھڑا تھا اور اس نے ایک دو سیٹیاں بھی بجائی تھیں جنہیں تیز ہواؤں کی چیخوں نے جذب کر لیا تھا۔ سنہری نے فوراً ہی جانے کی ضد کی، کیوں کہ ماں جاگ رہی تھی اور اس کا انتظار کر رہی ہوگی۔ مگر شیرا نے یہ کہہ کر اسے نہیں جانے دیا کہ ماں کو تو سب بات کا پتہ ہی ہے اور اس کی ہمدردی ان کے ساتھ تھی اور اگر وہ کچھ دیر بعد میں بھی پہنچ گئی تو ماں کچھ نہیں کہے گی۔ محبت میں ڈوبی سنہری شیرا کے سامنے بے بس ہو جاتی تھی، اس لئے وہ اس کے ساتھ ٹیلے کی طرف چلی گئی۔

جب سنہری کچھ دیر تک نہیں آئی تو بنتو لالٹین لے کر باہر کی کھپریل تک خود گئی۔ سنہری کو وہاں نہ پاکر وہ بات سمجھ گئی اور چُپ چاپ لوٹ آئی۔ سنہری کافی دیر تک نہیں لوٹی، کیوں کہ شیرا ضد کر رہا تھا کہ وہ اس کی تجویز پر عمل کرلے۔ مگر سنہری نہیں مان رہی تھی۔ اتنے میں آسمان کے چھاج سے چھما چھم بوندیں برسنے لگیں۔ رام پرشاد لنگڑاتا ہوا اور کراہتا ہوا آیا اور سنہری کو نہ پاکر بنتو سے پوچھنے لگا "سنہری کہاں ہے؟"

بنتو ڈر گئی، مگر ہمت کر کے بولی، "ابھی گیا باندھنے گئی ہے۔ آتی ہوگی۔ تم چلو، پھر وہیں اور جاکر سو جاؤ۔"

رام پرشاد نے کھڑکی میں سے گردن نکال کر سنہری کو آوازیں دیں مگر جواب نہ پاکر اس نے کھڑکی بند کر دی اور چٹخنی لگا دی۔ کوئی دس منٹ بعد سنہری نے "ماں! ماں!" کہہ کر کھڑکی کو کھٹکھٹایا۔ بنتو کھڑکی کھولنے کے لئے بڑھی مگر رام پرشاد نے اسے ایک طرف دھکیل دیا اور کھڑکی کے پاس سر کر کے زور سے بولا، "اس گھر میں اب تیرے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ جہاں سے آئی ہے وہیں چلی جا۔"

"بابو کیا کہہ رہے ہو۔ میں تو گیا باندھنے گئی تھی۔ جلدی کھڑکی کھولو۔ میں بری طرح بھیگ گئی ہوں۔"

"مجھے زیادہ غصہ نہ دلا۔ جہاں تو گئی تھی مجھے پتہ ہے۔ اب وہیں چلی جا اور اپنی شکل مجھے کبھی نہ دکھانا۔" یہ کہہ کر رام پرشاد پیچھے ہٹ گیا اور وہیں لیٹ گیا۔ سنہری

چند منٹ تک کھڑکی پیٹتی رہی مگر جب کسی نے کھڑکی نہیں کھولی تو وہ لوٹ گئی اور باہر کی کھپریل میں گانے کی بوری گھسیٹ کر اس پر ہی پڑ رہی۔

جب کافی دیر ہو گئی تو بنتو اٹھی اور رام پرشاد کے پاس بیٹھ کر بولی "تم تو غصے میں پاگل ہو رہے ہو۔ لڑکی سے ہاتھ دھو بیٹھو گے اور گاؤں بھر میں بدنامی الگ ہوگی۔ تم خاندانوں کی دشمنی دیکھو گے یا اپنی عزت رکھو گے؟ جب دونوں بیاہ کرنے کے لئے تیار ہیں اور شیرا کے گھر والے بھی مان رہے ہیں تو تمہیں کیا اعتراض ہے؟ آخر اس کا کہیں تو بیاہ کرو گے۔"

"مگر شیرا کے ساتھ نہیں۔" رام پرشاد نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

بنتو اس کے پاؤں دباتے ہوئے بولی، "شیرا میں کون سی کمی ہے۔ ہے اُس جیسا کوئی لڑکا گاؤں میں؟ تم تو پچاس برس پہلے کے جھگڑے کو سینے سے لگا کر بیٹھ گئے ہو اور اپنی لڑکی کے بیری بن گئے ہو۔ ان کے گھر میں دس بارہ آدمی ہیں اور تم اکیلی ذات۔ کل کو چھوکری نے کچھ کر لیا تو پچھتاؤ گے۔ میری مانو تو اس بیاہ ہی سے دونوں خاندانوں میں میل ملاپ کر لو۔"

"تو تو پگلی ہے یہ ساکھ اور عزت کا سوال ہے۔"

مگر بنتو اپنی ہی بات کہتی رہی اور رام پرشاد بھی سوچتا رہا ——— جس روز بھائی کے گھر سے آکر اُسے بخار ہو گیا تھا تو سنہری نے اس کی کتنی خدمت کی تھی، ساری رات بنتو اور سنہری نے آنکھوں میں کاٹ دی تھی۔ بنتو ٹھیک ہی کہہ رہی تھی، اس کے کون سا کوئی لڑکا ہے جو یہ دشمنی یا ساکھ اور عزت کا معاملہ آگے چلے گا۔ جس طرح گرم لوہا چوٹیں کھا کر نرم ہو جاتا ہے، رام پرشاد امید کے خلاف ڈھیلا پڑ گیا۔ یکایک اُسے سنہری کا خیال آیا اور وہ بنتو کا ہاتھ اپنے پاؤں پر سے ہٹاتے ہوئے بولا "تیرا کیا خیال ہے ——— سنہری اب رات کو شیرا کے گھر چلی گئی ہوگی؟"

"میری سنہری ایسی نہیں ہے۔ وہ دیوی کے جوہڑ میں ڈوب کر مر جائے گی مگر ہماری عزت پر آنچ نہ آنے دے گی۔ گیا کی کھپریل میں پڑی ہوگی۔"

" مگر میں کس مونہہ سے شمشیر سنگھ سے بات کروں گا؟"

" یہ بات مجھ پر چھوڑ دو۔ میں پنڈتائن کو بلوا کر کل صبح ان کے گھر بھیج دوں گی۔"

" اچھا تو کر لیو جو کرنا ہے۔ جا سنہری کو لے آ۔" یہ کہہ کر رام پرشاد اٹھ کر ڈیوڑھی میں چلا گیا۔

بنتو اٹھی، اس نے سر پر ایک بوری اوڑھی اور کھڑکی کھول کر باہر کی کھپریل کی طرف لپکی۔ سنہری کو وہاں پا کر اس کی جان میں جان آئی اور وہ روتی اور کانپتی ہوئی سنہری کو گھر لے آئی۔

اگلے روز موسم بے حد سہانا تھا۔ بنتو نے صبح ہی پڑوسن کے لڑکے کو بھیج کر پنڈتائن کو بلوا لیا اور اسے سب کچھ سمجھا کر شیرا کے گھر بھیج دیا۔ پنڈتائن گھنٹے بھر میں ہی خوش خوش لوٹ آئی۔ اُس کے پلّے میں اُن کے گھر سے ملا ہوا گڑ اور تل بندھے تھے۔ پنڈتائن نے ہاتھ نچا نچا کر سب کو بدھائی دی۔ رام پرشاد خود آنگن میں اپنی لاٹھی کے سہارے کھڑا مسکرا مسکرا سب کچھ سن رہا تھا کہ اچانک وہی مانوس سیٹی دروازے کے باہر بجی۔ آج اس سیٹی کی آواز میں کوئل کی کوک سے بھی زیادہ مٹھاس تھی اور اُسے سن کر سب مسکرا دیئے۔ مگر سنہری شرمائی ہوئی، گٹھری سی بنی اندر ہی بیٹھی رہی۔ شیرا کتنا بے تاب تھا کہ پنڈتائن ابھی آ کر ہی بیٹھی تھی کہ پیچھے پیچھے وہ بھی چلا آیا! مگر آج کے بعد تو وہ اس سے ملنا ہی بند کر دے گی، شاید شیرا کو اس بات کا پتہ نہیں تھا۔ سنہری یہ باتیں سوچ ہی رہی تھی کہ باپو کی آواز کان میں آئی۔ آج تو باپو کا انداز ہی بدلا ہوا تھا۔ وہ مسکرا کر کہہ رہا تھا، "بڑا نٹ کھٹ ہے یہ شیرا۔ اندر ہی بلا لو اُسے۔ میں باہر جا کر بیٹھ رہا ہوں۔ اب اسے سیٹی بجا کر سنہری کو بلانے کی کیا ضرورت ہے؟ یہ گھر تو اب اس کا اپنا ہے۔"

روشنی، سکون اور زندگی

من بھری نوجوان لڑکی تھی لیکن اس کا دل ودماغ دھرم کی طرف بہت مائل تھا۔ اُس کے ماتا پتا اُس کے بچپن ہی میں گزر گئے تھے۔ اور اُسے اُس کے ماما نے پالا تھا۔ ماما نے اپنا فرض تو پورا کیا تھا لیکن اُس نے من بھری کو جھڑکا اور مارا پیٹا زیادہ اور پیار کم کیا تھا۔ لیکن اِس میں اُس کا کوئی خاص قصور نہیں تھا کیونکہ اُس کے بھی اپنے بچّے تھے۔ اُس کے بجائے کوئی اور رشتے دار بھی ہوتا تو وہ بھی من بھری کے ساتھ شاید ایسا ہی سلوک کرتا۔ ماما کے بچّوں نے من بھری کو کبھی اپنی بہن نہیں سمجھا تھا۔ اور نہ مامی نے اپنی لڑکی۔ ماما کے دل میں من بھری کے لئے پیار اور درد تھا۔ لیکن وہ گھر میں چوبیس گھنٹے تھوڑا ہی رہتا تھا۔ اور پھر وہ یہ بھی جان گیا تھا کہ بہن کی لڑکی پر اپنے بچّوں کی طرح خرچ کرنا اور اُس کا اِتنا ہی دھیان رکھنا عملی طور پر مشکل تھا۔ اِس لئے من بھری کی زندگی اپنے ماما کے گھر میں بھی ایک خادمہ کی طرح گزری تھی۔ وہ ہر وقت میلے کچیلے کپڑے پہنے کام میں لگی رہتی۔ مامی بھی کام لینے میں بہت سخت تھی۔ اُس نے من بھری کے ماما کو پہلے ہی سے سمجھا دیا تھا کہ بے ماں باپ کی لڑکی ہے اِسے پڑھانا ٹھیک نہیں ہے۔ کیونکہ زمانہ بُرا ہے۔ بہت مشکل سے کسی طرح وہ پانچ جماعت تک پڑھ پائی تھی۔ اور پھر اُسے اسکول سے اٹھا لیا گیا تھا۔ وہ پڑھنے میں ہوشیار تھی اور ہندی اچھی طرح پڑھ لیتی تھی۔ اُس نے ماما کی کتابوں میں رکھی ہوئی ہندی

کی رامائن بھی پڑھ لی۔ پھر ایک کتاب ہندی دوہوں کی پڑھ ڈالی۔ وہ دھارمک کتابوں میں دلچسپی لینے لگی۔ اُسے یہ کتابیں پڑھنے میں عجیب شانتی ملتی اور گھر کے کام کاج سے فارغ ہوکر وہ دھارمک کتابیں پڑھنے بیٹھ جاتی۔ وہ دھرم کے کئی مسئلوں پر اپنے ماما سے بھی بحث کرنے لگی۔ اُسے دھارمک کتابیں کھنیچتی گئیں۔ اور اُسے محسوس بھی نہیں ہوا کہ وہ جوان ہوگئی ہے۔ وہ اڑوس پڑوس میں کیرتن میں جانے لگی۔ یہ موسم، یا شاید یہ رُیگ ہی کیرتن کا تھا۔ جدھر دیکھو کیرتن منڈلیاں بنی ہوئی تھیں۔ اور گھر گھر میں کیرتن ہو رہا تھا۔ من بھری بھی کیرتن میں جاتی اور اُس کی مامی بھی۔ جلد ہی من بھری کیرتن کی شوقین عورتوں میں مقبول ہوگئی۔ کیونکہ اُس کی آواز بھی اچھی تھی اور وہ ڈھولکی بھی اچھی بجاتی تھی۔ چونکہ وہ دھارمک خیالوں کی تھی۔ اس لئے وہ ان دھارمک گیتوں کے کیف وسرور میں سرشار ہو جاتی۔ وہ گردو پیش کی دُنیا سے بے خبر دیوانہ وار لہک لہک کر گاتی۔ زیادہ گیتوں اور بھجنوں کی دُھنیں فلمی تھیں لیکن اُس نے تو اب تک اپنی زندگی میں صرف دو فلمیں دیکھی تھیں۔ اور اُس کی یہ سرشاری دُھنوں پر نہیں، اُس کے پاکیزہ خیالوں پر مبنی تھی۔

اِدھر من بھری پر جہاں تک عمر کا تعلق تھا جوانی تیزی سے آرہی تھی۔ لیکن اُس کا دِل زیادہ سے زیادہ دھرم کی طرف مائل ہو رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دھرم میں اُس کی دِلچسپی اُس کی جوانی کی طغیانی کو ایک مضبوط باندھ بن کر روکے ہوئے تھی۔ کیوں کہ اُس کے چہرے پر ایک آتشی لپک کی بجائے ایک سایہ، ایک سکون تھا۔ اُس کی آنکھوں میں ابھی تک ضرورت سے زیادہ حیا تھی۔ اُس کے سِن نے اُس میں کوئی مستی کوئی خمار، کوئی نشہ پیدا نہیں کیا تھا۔ اِسی طرح اُس کے ہونٹ بے جان سی پنکھڑیاں تھیں۔ اور جلتے سُلگتے انگارے نہیں بنے تھے۔ ماما نے ایک دن شام کو بتایا کہ باہر بھیروں کے مندر میں ایک بہت بڑے مہاتما آئے ہیں۔ جو دس پندرہ دن ٹھہریں گے۔ وہ ایک گدّی دار سنت تھے اور اُن کے چیلے اُنہیں عزت سے پتاجی کہا کرتے تھے۔ اُن کے ساتھ ایک سنت مہیلا بھی تھیں۔ جنہیں سب ماتاجی کہتے تھے۔ اُن کا مٹھ بہار میں گیا کے پاس تھا۔ اُن کا مٹھ ایک پورا نگر تھا۔ جہاں ہزاروں

چیلے، مرد اور عورتیں رہتے تھے۔ اور نام سمرن، بھجن اور گورو سیوا میں وقت گزارتے تھے۔ مٹھ کی آمدنی بہت زیادہ تھی اور مٹھ کا سارا خرچ گورو دکشنا ہی سے چلتا تھا۔

ماما، مامی اور من بھری اگلے روز ہی شام کو بھیروں کے مندر گئے۔ وہاں سینکڑوں آدمی پہلے ہی سے جمع تھے۔ کوئی ڈھائی گھنٹے بعد اُن کی باری آئی۔ من بھری نے ماتاجی اور پتاجی دونوں سے بات کی۔ من بھری نے ماتاجی کو بتایا کہ شروع ہی سے اُس کا من دھرم کی طرف لگا ہوا ہے۔ اور وہ اپنی ساری زندگی دھرم کے لئے ارپن کرنا چاہتی ہے۔ ماتاجی نے من بھری کو آشیرواد دی اور اُس سے چند منٹ باتیں کیں من بھری بے حد متاثر ہوئی۔ اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے اُس کے ماتا پتا اُسے پھر مل گئے۔ ماتاجی کے چہرے پر کتنا جلال تھا۔ کتنی روشنی اور کتنی شانتی تھی من بھری صبح شام دونوں وقت بھیروں کے مندر جانے لگی۔ اُس نے کیرتن میں جانا بھی چھوڑ دیا۔ گھر کا کام کرنے کے بعد وہ مندر چلی جاتی اور اُس وقت لوٹتی جب پھر کام کرنا ہوتا۔ اور کام کر کے وہ پھر آجاتی۔ مامی حیران تھی کہ من بھری کو کیا ہو گیا ہے۔ لیکن من بھری ایک چھوٹے سے لوہے کے ٹکڑے کی مانند ایک بڑے مقناطیس کی طرف کھنچی جا رہی تھی۔ مامی نے ماما سے ذکر کیا تو ماما نے کہا۔ اِس لڑکی کا دھیان ہی دھرم کی طرف ہے۔ اور پتاجی اور ماتاجی کی سنگت تو بڑے سوبھاگیہ کی بات ہے۔

کوئی دس گیارہ دن کے بعد ایک شام جب من بھری نے مندر سے آکر اپنی مامی کو بتایا کہ وہ ساری دُنیا داری کو چھوڑ کر اپنی باقی زندگی ماتاجی کے ساتھ مٹھ میں گزارنے جا رہی ہے تو مامی کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ وہ من بھری کی طرف آنکھیں پھاڑ کر دیکھتی رہی۔ لیکن من بھری کے چہرے پر ایک غیر معمولی اہمیت، ایک معروفیت اور ایک اطمینان کے نشان تھے۔ ایک بے پایاں سمندر کی وسعت اور گہرائی صاف عیاں تھی۔ ماما آیا تو مامی نے اُسے بیٹھنے بھی نہ دیا اور ساری بات کہہ سُنائی۔ ماما نے من بھری کو بُلایا۔ بہت سمجھایا۔ لیکن من بھری کا فیصلہ اٹل تھا۔ ماما نے اُسے اور سوچنے کو کہا اور یہ بھی بتایا کہ وہ تو اُس کے لئے شادی کی بات چیت بھی کر رہا ہے۔

اور لڑکے والے تقریباً مان گئے ہیں۔ لیکن من بھری پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ ماما نے اگلے روز بھی من بھری کو سمجھایا مگر بے سود۔ بات بر لگا کر اڑ گئی تھی اور کچھ رشتے دار اور پڑوسی بھی سمجھانے آ گئے۔ لیکن من بھری ٹس سے مس نہ ہوئی۔ اُس نے یہاں تک کہہ دیا کہ وہ بیس سال کی ایک بالغ عورت تھی اور اُسے اختیار تھا کہ وہ جیسی زندگی چاہے گزارے مامی دل میں خوش تھی کہ اچھا چھٹکارا ملا اور شادی کے خرچ سے بھی بچے۔ لیکن ماما کے دل میں اپنی بھانجی کے لئے پیار بھڑک اُٹھا۔ اُس کی آنکھوں سے کئی بار آنسو ٹپکے۔ من بھری آخر اُس کی بہن کی آخری نشانی تھی۔ جس دن من بھری کو پتا جی اور ماتا جی کے ساتھ جانا تھا وہ بہت رویا۔ وہ بازار سے اُس کیلئے درجنوں دھوتیاں اور دوسری چیزیں لایا لیکن من بھری نے صرف دو دھوتیاں رکھ کر باقی سب چیزیں واپس کرنے کو کہہ دیا۔

من بھری سارے گھر کو روتا چھوڑ کر ماتا جی اور پتا جی کے ساتھ چلی گئی اور ماما کی حالت اُس دن بہت خراب رہی اُس کا دِل رو رہا تھا۔ گورو جی کا مٹھ گیا کے پاس ایک خوبصورت جگہ پر تھا تھوڑی ہی دُور پر دریا بہتا تھا۔ مٹھ کیا تھا ایک پورا شہر سا آباد تھا۔ اُس مٹھ کا اپنا بجلی گھر اور اپنی پانی کی ٹنکی تھی۔ کئی دکانیں بھی تھیں۔ لیکن لوگوں کے اپنے مکان نہ تھے۔ کئی بڑی بڑی سرائے نما عمارتیں اور بہت سے بڑے بڑے چبوترے بنے ہوئے تھے جہاں گورو جی کے بھگت ٹھہرے رہتے تھے۔ اُس مٹھ کی منتقل آبادی بھی کوئی ایک ہزار افراد پر مشتمل تھی۔ لیکن اِس کے علاوہ تقریباً اتنے ہی آدمی مٹھ کی یاترا کے لئے آئے ہوئے تھے۔ گورو جی ایک بڑی محل نما عمارت میں ماتا جی اور چالیس سیواداروں کے ساتھ رہتے تھے اور اُن کے رہنے کی وجہ سے یہ جگہ مندر کہلاتی تھی۔ باہر کے یاتری گورو جی اور ماتا جی کے درشن صبح شام مندر میں بھی کر سکتے تھے اور اِس کے علاوہ گورو جی ہر روز شام کو باہر آ کر ایک چبوترے پر جس پر اُن کا بیش قیمت تخت رکھ دیا جاتا تھا، اپنی پرارتھنا سبھا بھی کرتے تھے۔ جس میں اُس مٹھ کے سارے رہنے والے اور باہر سے آئے ہوئے سارے بھگت شامل

ہوتے تھے اور پرشاد بٹتا تھا۔

من بھری کے ذمے ماتاجی کی رسوئی سونپ دی گئی۔ جو بڑی خوش نصیبی کی بات تھی۔ جن افراد کے ذمے ماتاجی اور پتاجی کے کھانے پینے کا انتظام تھا۔ وہ پتاجی اور ماتاجی کے بہت قریب سمجھے جاتے تھے۔ اور یہ قرب نصیب ہی سے ملتا تھا۔ من بھری بہت عقیدت اور شردھا سے ماتاجی کے لئے کھانے پینے کی چیزیں اپنی دیکھ بھال میں بنوانے لگی۔ ماتاجی کو من بھری کی سیوا اور دھرم میں اُس کی لگن نے بہت متاثر کیا اور من بھری اُن کی منظورِ نظر ہوگئی۔ وہ اپنی ذمہ داریوں کو ختم کر کے بھی کافی وقت ماتاجی کے کمرے میں گزارتی اور اُن کے سُکھ اور آرام کا بہت دھیان رکھتی۔ اِس خدمت سے خوش ہو کر ماتاجی نے اُسے رام نام اور بھگتی کے کچھ ایسے سادھن بتائے کہ من بھری نے اپنے آپ کو روحانی طور پر کافی بلند پایا۔ من بھری کے دن یونہی گزرتے گئے وہ اپنے نئے ماحول میں بہت خوش تھی۔ اُسے ملما، مامی اور بہن بھائی یاد آتے تھے اور وہ اُسے اِس دُوری پر جتنے وہ تھے اُس سے زیادہ اچھے لگے۔ لیکن موہ مایا کے جنجال سے وہ بہت دُور بھاگنا چاہتی تھی۔ اُس نے اُنہیں دو ایک خط لکھے اور بس۔ اور اُن خطوں میں بھی اُس نے اپنے ماما کو مٹھ میں آنے کی اور پتاجی اور ماتاجی کے درشن کرنے کی ترغیب دی۔ اُس کے دل میں اُن سے ملنے کی کوئی تڑپ پیدا نہیں ہوئی۔ اگرچہ اُس کا خیال تھا کہ جب کبھی پتاجی اور ماتاجی اُدھر جائیں گے اور بھیرول کے مندر میں ٹھہریں گے تو وہ بھی اُن کے ساتھ چلی جائے گی اور اپنے ماما سے مل لے گی۔

من بھری کی زندگی کسی تالاب میں ٹھہرے ہوئے پانی کی طرح پُرسکون تھی۔ لیکن ایک دن ایک عجیب سی بات ہوئی جس نے اُس ٹھہراؤ میں پھیلتی ہوئی لہریں اور ہلچل ڈال دی۔ پتاجی کے رسوئی گھر کا لڑکا شردن جب ماتاجی کے لئے شہد لایا تو اس نے شہد کا برتن من بھری کے ہاتھ میں تھما تو دیا لیکن اُسے چھوڑا نہیں۔ اگرچہ من بھری نے برتن کو کھینچا۔ اُس نے من بھری کی طرف عجیب نظروں

سے دیکھا اور مسکرانے لگا۔ پہلے تو من بھری کچھ نہ سمجھی لیکن جب وہ ماتاجی کو شہد کھلاکر شردن کو برتن لوٹانے آئی تو شردن نے برتن کے ساتھ ساتھ من بھری کا ہاتھ بھی پکڑ لیا اور پھر مسکرادیا۔ من بھری نے کچھ عجیب سا محسوس کیا۔ لیکن یہ سب کچھ صرف چند لمحوں میں ہوا اور شردن اتنی جلدی لَوٹ گیا کہ وہ کچھ سوچ بھی نہ سکی۔ لیکن اُس کے ہاتھ میں ایک جھنجھناہٹ ابھی تک ہو رہی تھی۔ شردن ہر روز کا آنے والا تھا لیکن ابھی تک اُس نے ایسی بات نہیں کی تھی۔ جب من بھری نے چند لمحے اِس بات پر غور کیا تو اُس کے دل میں شردن کے لئے سخت غصّہ پیدا ہوا۔ وہ شردن کے حوصلے پر جھنجھلا اُٹھی اور اُس کے چہرے پر غصّہ کی ایک سُرخ تمتماہٹ پھیل گئی۔ ایک بار تو اُس کے جی میں آیا کہ ماتاجی سے کہہ دے لیکن کچھ سوچ کر رہ گئی۔ اُس نے فیصلہ کیا کہ وہ شردن کو خود ٹھیک کرے گی۔ لیکن من بھری نے شردن کو کچھ نہیں کہا۔ اُس نے اپنے دل کے کسی انجانے اور اَن دیکھے کونے میں ایک جھرجھری سی پیدا ہوتی ہوئی محسوس کی۔ جب وہ رات کو سونے کے لئے لیٹی تو اُسے بہت دیر تک نیند نہ آئی۔ شردن اچھی شکل وصورت کا نوجوان لڑکا تھا۔ اور تندرست وچُست تھا۔ من بھری نے شدّت سے محسوس کیا کہ جیسے اُس کی زندگی میں کوئی خلا ہے کوئی کمی ہے۔ اور وہ کئی متضاد خیالوں اور جذبوں سے دل ہی دل میں اُلجھتی اور جنگ کرتی ہوئی بہت دیر تک جاگتی رہی۔ اگلے دن شردن آیا تو اُس نے پھر من بھری کا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کی اور مسکرایا۔ لیکن اُس وقت اُجالا تھا اور من بھری کے رات کے جذبات بھی جیسے جاگ کر اپنا کام کر رہے تھے۔ اُس نے زور سے شردن کو جھڑک دیا۔ اپنا ہاتھ تک اٹھایا اور شردن ڈر کے مارے بھاگ گیا۔ مٹھ کے ضابطے بہت سخت تھے۔ اُن شادی شُدہ جوڑوں کے سوا جو مٹھ میں مقیم تھے، پتاجی اور ماتاجی کے تمام چیلوں کا رشتہ بھائی بہن کا تھا۔ کوئی مرد اور عورت ایک دوسرے پر بُری نظر نہیں ڈال سکتا تھا۔ اُس مٹھ میں، چاہے وہ کنوارے اور جوان ہوں۔ سب دھرم کے متوالے ہی تھے۔ اور حُسن وعشق کی داستانوں کے پلنے کا یہاں سوال

ہی نہیں تھا۔ پتاجی اِس معاملے میں بہت سخت تھے اور سارا مٹھ جانتا تھا کہ اگر اُن تک اِس بارے میں کوئی شکایت پہنچ گئی تو قصوروار کی خیر نہیں۔ من بھری کی جھڑکی سے اور پتاجی کے خوف سے شرون کانپ گیا۔ من بھری نے شرون کو جھڑک تو دیا تھا لیکن وہ جھڑکی اُس کے ہونٹوں کی آواز تھی، اُس کے دل کی نہیں۔

وہ یہ جان کر حیران رہ گئی کہ اُس کے دل میں چھپا ہوا کوئی چور یہ چاہتا ہے کہ شرون اُسے چھیڑے۔ لیکن شرون اب آتا تھا اور بغیر مسکرائے اور من بھری کو ہاتھ لگائے لوٹ جاتا تھا۔ من بھری نے ایک بے چینی کا احساس کیا اور وہ کئی بار تنہائی میں اُس بجلی کا احساس کرتی جو شرون کے ہاتھ لگاتے ہی اُس کے سارے جسم میں دوڑ گئی تھی۔ وہ ماتاجی کو کھلاتی ہوئی، خدمت کرتی ہوئی، یہاں تک کہ بھجن کرتی ہوئی بھی شرون کے بارے میں سوچنے لگتی۔ اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی عجیب طاقت اُسے کسی اور طرف بُلا رہی ہے۔ اور وہ بے بس سی ہو کر اُسی جانب کھنچ رہی ہے

ایک دن شرون پھر مسکرایا۔ اُس دن نہ جانے کیوں من بھری بھی مسکرا دی لیکن پھر کسی خیال کے آتے ہی اُس نے اپنا چہرہ سنجیدہ بنا لیا۔ لیکن اُس نے شرون کو جھڑکا نہیں۔ بلکہ بات کرنے لگی۔ شرون نے من بھری کے رویئے میں کچھ تبدیلی محسوس کی اور وہ اب پھر ہر روز مسکرانے لگا اور من بھری کا ہاتھ بھی پکڑنے لگا۔ وہ اپنا ہاتھ فوراً چھڑا تو لیتی لیکن ناراض نہ ہوتی۔ یہ چھیڑ چھاڑ چلتی رہی اور من بھری نے محسوس کیا کہ اُس کی حالت اُس انسان کی سی ہے جو پانی سے ڈرتا ہوا بھی کشتی پر سوار ہو گیا ہے۔ جو تیزی سے ڈھلان کی طرف بہتی جا رہی ہے۔ اُسے نہ جانے کیوں شرون زیادہ سے زیادہ اچھا لگنے لگا اُس کے ساتھ باتیں کر کے وہ ایک عجیب سے لطف کا احساس کرتی۔ اُس کی قربت میں اُس کا سارا جسم جاگ سا جاتا۔ نہ جانے کون سی چیز اُس کے خوابیدہ جذبات کو جھنجھوڑ سی جاتی۔

ایک دن شرون نے اُسے شام کو، گوروجی کی پراتھنا سبھا کے بعد گوروجی کے باغیچے میں ملنے کو کہا۔ من بھری سوچ میں پڑ گئی۔ کسی نے دیکھ لیا تو آفت آ جائے گی

اُس نے سُنا تھا کہ بہت مدّت ہوئی مٹھ میں ایک ایسا ہی قصّہ ہوا تھا اور اُس مرد اور عورت پر سارے مٹھ والوں نے آوازے کسے تھے۔ اُن کی بے عزّتی ہوئی تھی اور گورو جی نے سزا کے طور پر اُن سے اپنا نام' واپس لے لیا تھا۔ اور اُنہیں ہمیشہ کے لئے مٹھ سے نکال دیا تھا۔ من بھری بہت دیر تک سوچتی رہی لیکن خوف دہر اس کے باوجود کوئی غیبی طاقت اُسے گورو جی کے باغیچے میں لے ہی گئی۔ باغیچے میں بہت اندھیرا تھا۔ اور اُس نے کئی جگہ ٹھوکر کھائی۔ وہ ٹھوکر کھاتی اور درختوں پر بسیرا کرنے والے پرندے چند لمحوں کے لئے پھڑ پھڑاتے۔ وہ اُس سنسان جگہ پر اکیلی آتی ہوئی بار بار گھبرا رہی تھی۔ لیکن نہ جانے کون سا جذبہ اُسے آگے دھکیل رہا تھا۔ شرون نے کچے کنوئیں پر ملنے کو کہا تھا جو باغیچے کے کونے پر تھا اور جہاں کوئی پانی بھرنے یا نہانے نہیں آتا تھا۔ اُس کنوئیں میں پانی برائے نام تھا اور اُس پر ایک گھنے پیپل کے درخت کا سایہ تھا۔ من بھری درختوں کے تلے روشوں پر چلتی ہوئی، اپنے قدموں سے پتّوں کو سرسراتی ہوئی کنوئیں پر پہنچ گئی۔ شرون اُس کے انتظار میں بیٹھا تھا۔ وہ دونوں ڈرتے چھپتے ہوئے بھی ایسے ملے جیسے دو ندیاں اپنے سنگم پر زور شور سے ملتی ہیں۔ اُنہیں شدّت سے محسوس ہوا کہ وہ ایک دوسرے کو بے حد چاہتے ہیں۔ وہ دونوں کنوئیں کی منڈیر پر اندھیرے کے ایک ٹکڑے میں بیٹھ گئے۔ شرون کو آج وقت ملا تھا اور وہ جذبات میں بہہ کر بہت کچھ کہہ رہا تھا۔ اُس نے بتایا کہ اُس کا گاؤں یہاں سے قریب ہی تھا۔ اور وہ پانچ سال ہوئے اپنے پتا جی کے ساتھ اِس مٹھ میں آیا تھا۔ اس کے پتا دو سال ہوئے اِس مٹھ ہی میں سورگباش ہو گئے تھے۔ وہ یہیں رہنے لگا تھا لیکن اُسے یہاں رہنا پسند نہیں تھا۔ وہ جا کر اپنی زمین پر کام کرنا چاہتا تھا یا پھر اپنی زمین بیچ کر کہیں کوئی دکان کرنا چاہتا تھا۔ اُس نے من بھری کا ہاتھ پکڑ کر اُس سے پوچھا کہ کیا وہ اُس سے شادی کرنے کو تیّار تھی؟

من بھری نے سر اُٹھایا۔ چاروں طرف گھُپ اندھیرا تھا۔ گہرے سکوت

کو صرف درختوں پر بسیرا لیتے ہوئے پرندوں کی پھڑپھڑاہٹ توڑ رہی تھی۔ اُس نے ایک خنکی کا احساس کیا اور وہ شروَن کے اور قریب ہو کر بیٹھ گئی۔ اُس نے شروَن کی آنکھوں میں جھانکا اور اقرار کر لیا۔ وہ دونوں خنکی اور تاریکی کا لحاف اوڑھے ایک دوسرے کے قریب ہو کر اُسی طرح بیٹھے رہے۔ جیسے اُس اقرار نے اُن دونوں کے درمیان حائل پابندی کی اونچی دیوار کو گرا دیا تھا۔ وہ ہر چیز سے بے نیاز بیٹھے تھے۔ اور وقت کے بے آواز پر اُن کے سروں پر سے گزرتے رہے۔ نہ شروَن شہد لے کر ماتاجی کے پاس پہنچا اور نہ ماتاجی کو من بھری نے شہد کھلایا۔ اور وہ اپنے خوابوں سے اُسی وقت چونکے جب باغیچے کے پکّے کنویں میں کسی نے زور سے ڈول گرایا۔ اور کنویں کی چرخی تیزی سے گھومنے لگی۔ وہ تیزی سے اُٹھے اور باغیچے کو جلد جلد پار کر کے گورو جی کے مندر کی طرف بڑھے۔ چاروں طرف گہری خاموشی تھی اور سارا مٹھ سویا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ گورو جی کے مندر کے اُوپر ہر روز کی طرح روشنی تھی۔ مندر کے دروازے پر پہنچنے سے کچھ پہلے شروَن نے من بھری کو ذرا پیچھے کر دیا۔ مندر کے کواڑ ابھی تک بند تھے لیکن مندر کا چوکیدار شروَن کو گھور کر دیکھ رہا تھا۔

"شروَن! من بھری کہاں ہے؟ سب کو پتہ لگ گیا ہے۔ اب مندر میں آنے کا کیا فائدہ؟"

"مجھے بس رات کے یہ دو گھنٹے کاٹنے ہیں۔ من بھری وہ پیچھے آ رہی ہے۔ ہم دونوں نے بیاہ کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔"

"تو بھائی یہاں سے فوراً لوٹ جاؤ۔ صبح ہوتے ہی گورو جی کا سامنا کرنا ہوگا۔ اور بے عزّتی سے مٹھ سے نکلو گے۔ جاؤ گورو جی کے باغیچے میں کہیں پڑ رہو۔ پَو پھٹتے ہی وہاں سے چل دینا۔"

شروَن اور من بھری واپس ہو گئے۔ شروَن نے گورو جی کے مندر کی طرف ایک بار دیکھا اور اُس کے اوپر جلتی ہوئی روشنی کو پرنام کیا۔ من بھری رو

رہی تھی۔ وہ دونوں پھر باغیچے پر پہنچ گئے لیکن اندر نہیں گئے۔ وہ باہر بنے ہوئے کچے چبوترے پر ہی بیٹھ گئے۔ شروَن اپنے سر کو دونوں ہاتھوں میں لے کر لیٹ گیا۔ مَن بھری چُپ چاپ بیٹھی رہی۔ اور پھر بولی۔

"تم پہلے میرے گھر چلنا میں اپنے ماما کو سب کچھ بتا دوں گی۔ ہماری شادی میں اُن کی آشیرواد ضروری ہے۔"

شروَن نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ شاید سو گیا تھا۔ دُور گوردجی کے مندر کے اُوپر کی روشنی یہاں سے ایک ستارے کی طرح چمک رہی تھی۔ وہ اُس کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہی۔ مندر کی طرف اُس روشنی کے نیچے کتنا سکون کتنی شانتی تھی! پھر اُس نے شروَن کی طرف دیکھا۔ اور آہستہ سے اپنا ہاتھ اُس کے سر پر رکھ دیا۔ یہاں وہ ستارے کی طرح روشنی نہ سہی لیکن جیسے اُس کا دل، اُس کی تمام زندگی یہاں پڑی ہو۔ وہ آہستہ سے جھکی اور اُس نے پیار سے اپنا سر اُس کے کندھے پر رکھ دیا۔

آشیانہ

کرشن نگر لاہور میں بابو دوارکا پرشاد ہمارے پڑوسی تھے۔ اس لئے ہم اُن سب کو اور وہ ہم سب کو بخوبی جانتے تھے۔ پھر ملک تقسیم ہو گیا تھا۔ اور ہم سب نے ہی لاہور چھوڑ دیا تھا۔ بابو دوارکا پرشاد نے ایک چھوٹا سا مکان سونی پت میں بنوا لیا تھا اور وہ وہیں رہنے لگے تھے۔ اُن کے چھ لڑکوں میں سے تین یہاں دلی میں نوکر تھے۔ ایک میرٹھ میں ایک ڈرگی میں اور چھوٹے لڑکے کو جو جنم سے گونگا اور بہرہ تھا۔ وہ عام طور پر اپنے ساتھ ہی رکھتے تھے۔ یہاں جو تین لڑکے تھے اِن میں سے میری دوستی رام پال سے بچپن سے تھی۔ لیکن اب بڑے ہونے کے بعد دلی کی مصروف زندگی میں اس سے ملنا بھی شاذ ہی ہوتا تھا۔ کبھی تیسرے چوتھے مہینے سبزی منڈی کی طرف نکل گیا تو اس کے یہاں بھی ہو آتا تھا۔

بابو دوارکا پرشاد ایم ای ایس کے ریٹائرڈ ہیڈ کلرک تھے اور ان کے پاس پرماتما کا دیا سب کچھ تھا۔ کرشن نگر لاہور میں بھی ان کا کافی بڑا مکان تھا۔ پھر لڑکے ہی لڑکے تھے۔ جو قابل، تندرست اور خوبصورت تھے مگر دنیا میں راحت کے پہلو بہ پہلو رنج و غم بھی ہیں اور بابو دوارکا پرشاد کو اپنے بیٹے جے پال کی شکل میں ایک ایسا دکھ مل گیا تھا جس کے بارے میں سوچ سوچ کر وہ بہت مغموم ہو جایا کرتے تھے۔ یہی حالت جے پال کی ماں کی تھی۔ جس وقت جے پال پیدا ہوا تھا۔

تو ہر لحاظ سے ٹھیک ٹھاک تھا۔ ایک ڈیڑھ سال تک بھی کسی کو شک نہیں ہوا کہ یہ بچّہ گونگا اور بہرہ ہوگا۔ مگر آہستہ آہستہ یہ راز کھل گیا اور اس کے ساتھ ہی ماں باپ کی پریشانی شروع ہوگئی اور پھر جے پال کی بجائے اُسے سب گونگا کہہ کر بلانے لگے۔ گھر والے بھی اور باہر کے بھی اور آخر کار یہی اُس کا نام پڑ گیا۔

بچپن کا جے پال اپنے بھائیوں ہی کی طرح سرخ و سفید تھا اور اُسے دیکھ کر سب کو یہ دکھ ہوتا تھا کہ یہ خوبصورت بچّہ نہ کبھی سن سکے گا اور نہ بول سکے گا۔ بابو دوارکا پرشاد نے اُس کے علاج پر روپیہ پانی کی طرح بہایا حتیٰ کہ جے پال آٹھ سال کا ہوگیا اور ہاتھوں کے اشارے اُس کی زندگی کا جزو بن گئے۔ والدین تھک ہار کر بیٹھ گئے اور آخر اسے گونگے اور بہروں کے ایک انگریزی اسکول میں داخل کرا دیا گیا۔ اُس نے اس اسکول میں تین چار سال تعلیم پائی ہوگی مگر یہ تعلیم بڑی محدود تھی اور وہ محض انگریزی کے کچھ فقرے لکھنا پڑھنا سیکھ گیا تھا۔

مَیں نے اِدھر گونگے کو کوئی دس بارہ سال سے نہیں دیکھا تھا مگر جب کبھی رام پال سے ملنا ہو جاتا تو سب ہی کے بارے میں پوچھ لیتا کہ کہاں ہیں اور کیسے ہیں۔ گونگے کے بارے میں پتہ لگا کہ وہ کچھ بگڑ گیا تھا اور رام پال کے کہنے کے مطابق بابو دوارکا پرشاد کے حد سے زیادہ لاڈ پیار نے اُسے خراب کر دیا تھا۔ وہ کوئی کام سیکھنے کے لئے تیار نہیں ہوتا تھا اور نہ کہیں ٹکتا تھا۔ جب اس کا دل چاہتا تھا ایک دو روز کے لئے دلّی چلا آتا تھا۔ پھر یہاں سے واپس سونی پت چلا جاتا یا رڑکی اور میرٹھ ہو آتا تھا۔ یہاں دلّی میں رام پال نے اسے ایک درزی کی دکان پر کام سکھانے کی بڑی کوشش کی مگر دس پندرہ دن کے بعد ہی گونگے نے یہ کام سیکھنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔

اب کے میں سبزی منڈی رام پال کے یہاں گیا تو وہاں گونگا بھی تھا۔ اُسے دیکھ کر مجھے بڑی حیرانی اور دکھ ہوا۔ کیونکہ وہ اب دس بارہ سال پہلے کا خوبصورت لڑکا نہیں تھا۔ بلکہ ایک کمزور اور جھکی جھکی سی کمر کا پورا آدمی ہوگیا تھا۔ جس کے چہرے

کی گولائی ایک بے ڈھنگے لمبوترے پن میں بدل گئی تھی۔ اس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے تھے۔ اور پچکے ہوئے چہرے پر ایک اداسی چھائی ہوئی تھی۔ وہ گھر کے نوکروں کی طرح ایک پھٹی ہوئی قمیض اور دھاری دار پاجامہ پہنے ہوئے تھا۔ وہ مجھے پہچان گیا اور اس نے مجھے بیٹھنے کے لئے کہا۔ ہر واقف کار، دوست اور رشتے دار کے لئے اس کا اپنا شناختی اشارہ تھا۔ اور اس نے ایک ایک کرکے مجھ سے میرے دوسرے بھائیوں اور والد صاحب کے بارے میں پوچھا کہ سب خیریت سے ٹھیک ٹھاک تو ہیں۔ پھر اُس نے مجھ سے پوچھا کہ میں کہاں اور کس نمبر کے کوارٹر میں رہتا ہوں۔ اس نے مجھے ایک کاغذ دیا اور اس پر مجھے اپنا پتہ لکھنے کو کہا۔ میرا پتہ پڑھ کر اُس نے اسی کاغذ پر انگریزی میں لکھ دیا کہ میں کبھی آپ کے گھر آؤں گا۔ پھر اُس نے اشارے سے میری بیوی کی خیریت پوچھی اور یہ دریافت کیا کہ میرے کتنے بچّے تھے۔ جب میں نے اسے بتایا کہ میرے تین بچّے ہیں تو وہ بہت خوش ہوا۔ اور اس نے ایک بزرگانہ انداز میں دعا کی کہ پرماتما انہیں ٹھیک ٹھاک رکھے۔

جب رام پال نے گونگے کو بازار برف لانے کے لئے بھیج دیا تو میں نے کہا۔

"گونگا کب سے آیا ہوا ہے۔ یہ تو بہت کمزور ہو گیا ہے۔"

"بھئی اس میں سارا قصور بابوجی کا ہے۔" رام پال بولا۔ شروع سے اس کو کچھ کروایا نہیں اور اب یہ کچھ کرنا نہیں چاہتا۔ بری بری عادتیں پڑ گئی ہیں اور بات بات پر ناراض ہو جاتا ہے۔ اور گھر سے بھاگ جاتا ہے۔ دو چار دن دوسرے بھائی کے پاس ونے نگر رہا تھا۔ وہاں سے دس روپے چرا کر بھاگ گیا۔ ایک مہینے سے یہاں آیا ہوا ہے اور میں سر پٹک رہا ہوں کہ درزی کی دکان پر بیٹھ جائے مگر نہیں مانتا۔ کہتا ہے مجھے ٹائپ سکھواؤ اور دفتر میں بابو لگواؤ۔"

"رام پال" میں نے کہا "بھئی کچھ بھی ہو اسے مہینے کے مہینے تم سب کو کچھ روپے تو دیتے ہی چاہئیں۔ وہ گونگا بہرہ ہی مگر اس کی بھی تو اپنی ضرورتیں ہیں۔"

"تم نہیں جانتے" رام پال نے فوراً جواب دیا۔ "اسے روپے دینا بڑا خطرناک

ہے کیونکہ پھر یہ گھر پر نہیں ٹکتا اور اِدھر اُدھر بھاگ جانے کی سوچتا ہے۔ اس نے اپنی ساری زندگی کاٹنی ہے۔ بابوجی کے پاس بھی اب کچھ نہیں ہے اور پھر وہ کب تک بیٹھے رہیں گے۔ یہ صرف درزی کا کام سیکھ سکتا ہے جس سے اس کی گزر ہو سکتی ہے مگر کون سمجھائے۔ ویسے اسے روٹی کپڑا سب ملتا ہے اور جتنے پیسوں کی جب ضرورت ہو اپنی بھابی سے مانگ لیتا ہے۔"

میں رام پال کے یہاں سے واپس آیا تو گونگے کے بارے میں سوچتا رہا۔ رام پال نے جو کچھ کہا تھا اس میں بھی صداقت تھی۔ گونگا سننے اور بولنے ہی سے تو لاچار تھا لیکن دیکھتا اور سوچتا تو تھا۔ اُس بے چارے کے جذبات اور محسوسات کو سمجھنے کے لئے تو ایک بہت ہی نرم اور نازک دل کی ضرورت تھی۔ گونگا ایک اچھے خوشحال گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ اس نے ماں باپ کے سایے تلے، ان کی محبت اور پیار کی چھاؤں میں، سب عیش و آرام دیکھے تھے۔ وہ یہ بھی دیکھ رہا تھا کہ اس کے سب بھائی اچھی ملازمتوں میں تھے۔ اور بیوی بچوں کے ساتھ ایک خوش و خرم زندگی بسر کر رہے تھے۔ اس لئے اُس کے دل میں اگر اپنی بے بسی اور لاچاری کے لئے ایک درد اور تڑپ تھی تو یہ کوئی غیر قدرتی بات نہیں تھی۔

گونگا اگلے روز ہی بس میں بیٹھ کر شام کو لودھی روڈ میرے کوارٹر پر پہنچ گیا وہ ایک چھوٹے سے لفافے میں میرے بچوں کے لئے کچھ مٹھائی کی گولیاں بھی لایا۔ اور میرا ایک بچہ آیا تو اس نے اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر اس کے ہاتھ میں لفافہ تھما دیا۔ میں اس کے ساتھ بیٹھک میں بیٹھ گیا اور بیوی کو شربت بنانے کے لئے کہا۔ گونگے کے ساتھ کیونکہ ہملا کافی واسطہ رہا تھا اس لئے اس کی باتیں اور اشارے سمجھنے میں ہمیں کوئی دشواری نہیں ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ اسے کوئی خاص بات کہنا ہوتی تو وہ کاغذ پر انگریزی کے بڑے بڑے حروف میں ایک دو فقرے گھسیٹ دیتا۔ اس نے مجھے بتایا کہ اس کے بھائیوں کا اس کے ساتھ سلوک اچھا نہیں تھا۔ اور اس کے ثبوت میں اس نے اپنی پھٹی ہوئی قمیض اور ٹوٹی ہوئی چپل کی طرف اشارہ

کیا۔ اس نے کہا کہ میں تو ٹائپ اور شارٹ ہینڈ سیکھ کر دفتر میں کام کرنا چاہتا ہوں اس کے علاوہ اس کو ابھی تک یہ بھی یقین تھا کہ وہ ٹھیک ہو سکتا ہے۔ اس نے ایک کاغذ پر کسی دوا کا نام، سات سو روپے اور امریکہ لکھ کر مجھے یہ بتانے کی کوشش کی کہ امریکہ میں یہ دوا اتنے روپے میں ملتی ہے اور میں بولنے لگوں گا۔ لیکن میرے بھائی یہ دوا نہیں منگواتے اور بابوجی کے پاس اب روپے نہیں رہے۔

میں گونگے کی باتیں دلچسپی اور ہمدردی کے ساتھ سنتا رہا۔ جہاں تک اس کے گونگے اور بہرے پن کا تعلق تھا، یہ لاعلاج تھا۔ اور یہ بات تو صحیح نہیں تھی کہ اب اسے کوئی دوا منگوا دی جائے یا اس پر سات سو روپے خرچ کر دیئے جائیں تو وہ ٹھیک ہو جائے گا۔ مگر ساتھ ہی اس بارے میں گونگے کے جذبات کو سمجھنا بھی مشکل نہیں تھا۔ جس ماحول میں وہ پلا تھا جو حساس دل اس نے پایا تھا۔ اس کے مدنظر اس کی یہ آس شاید کبھی نہیں ہٹے گی جہاں تک اس کے دفتر میں کام کرنے کی خواہش کا تعلق تھا تو یہ بھی ایک نفسیاتی بات تھی۔ وہ اپنی لاچاری اور معذوری کے باوجود کوئی ایسا کام کرنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ جو اُسے اس کے بھائیوں کے مقابلے میں ایک احساسِ کمتری دے۔ بہرحال یہ بات عیاں تھی کہ بھائی اس کی اتنی مدد نہیں کر رہے تھے جتنا یہ خون کا رشتہ اور اس کی بے چارگی اس کے متقاضی تھے۔ میں نے اس کے ساتھ پوری ہمدردی ظاہر کی، اسے کھلایا پلایا اور وہ یہ کہتا ہوا چلا گیا کہ اس کے بابوجی اتوار کو سونی پت سے آئیں گے اور وہ ان کے ساتھ سونی پت واپس چلا جائیگا اس نے مجھ سے درخواست کی کہ میں اتوار کو سبزی منڈی ضرور آؤں، اور اس کے جانے سے پہلے اس سے اور اس کے بابوجی سے مل لوں۔

میں گونگے کے ملنے جلنے کے آداب، قاعدے اور شرافت سے بے حد متاثر ہوا۔ میں نے شدت سے محسوس کیا کہ وہ ہر اس انسان کی ہمدردی کا مستحق ہے جسے پرماتما نے بولنے اور سننے کی قوت دی ہے۔ اتوار آیا تو مجھے یاد آ گیا کہ آج شام کی گاڑی سے گونگا اپنے بابوجی کے ساتھ چلا جائے گا۔ اس نے مجھ سے

آنے کی التجا کی تھی اور اگر میں چلا گیا تو شاید اسے کچھ خوشی دے سکوں گا۔ اس کے علاوہ بابو دوارکا پرشاد سے ملے ہوئے بھی ایک عرصہ ہو گیا تھا۔ میں کوئی تین بجے رام پال کے یہاں پہنچ گیا۔

بابو دوارکا پرشاد اور گونگا دونوں بیٹھک میں ہی بیٹھے ہوئے تھے گونگا چیخ چیخ کر بابو دوارکا پرشاد سے اپنی کوئی بات کہہ رہا تھا اور اس کے لہجے سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی شکایت کر رہا ہے۔ بابو دوارکا پرشاد بھی کبھی چیخ کر اور کبھی پیار سے اسے سمجھا رہے تھے۔ ویسے گونگے کے چہرے سے آج ایک بھروسے اور اہمیت کا احساس جھلک رہا تھا۔ بابو دوارکا پرشاد اسے یہ کہہ کر کہ "اچھا اچھا ایسا ہی ہو جائے گا۔" میری طرف متوجہ ہو گئے۔ وہ گونگے سے بات کرتے ہوئے اشاروں سے تو کام لیتے ہی تھے مگر ساتھ ساتھ بولتے بھی رہتے تھے جیسے گونگا سمجھ رہا ہو۔ گونگے نے آگے بڑھ کر مجھ سے ہاتھ ملایا اور یہ اشارہ کر کے کہ ابھی آیا باہر چلا گیا۔ بابو دوارکا پرشاد اِدھر اُدھر کی بات کر کے بولے۔

" گونگے کو بہت سمجھاتا ہوں، مگر وہ یہی رٹ لگائے رہتا ہے کہ مجھے ٹائپ اور شارٹ ہینڈ سکھواؤ اور دفتر میں نوکری لگواؤ۔ اِدھر اُدھر سے اخباروں کی کٹنگ کاٹ کر رکھ لیتا ہے اور کہتا ہے، یہ دوا منگوا دو۔ یہ رٹ اس وقت زیادہ ہو جاتی ہے جب اسے کسی بھائی کے پاس بھیج دیتا ہوں، میرے پاس رہتا ہے تو خوش رہتا ہے اور ان باتوں کی ضد نہیں کرتا۔ کوئی کام سیکھ لیتا تو اچھا تھا۔ آجکل بھائیوں سے توقع رکھنا بے کار ہے اور گونگے کی بات ہی کیا، مجھے بھی کوئی لڑکا کچھ نہیں دیتا۔ آجکل اخراجات ہی سب کے اتنے بڑھے ہوئے ہیں۔"

وہ ایک منٹ کے لئے چپ ہو گئے اور پھر بولے۔

" بھائی تم اس کی شکایت کرتے ہیں، یہ بھائیوں کی کرتا ہے۔ اب کیا بتاؤں اس غریب پر تو پرماتما کی مار پہلے ہی سے ہے۔ یہ تو ایک بے زبان جانور، ایک سیدھی سادی گائے ہے اتنا فرمانبردار ہے کہ کہہ نہیں سکتا۔ مگر یہ بوجھ پھر ہمارا ہے اور

ہم ہی اسے سنبھالیں گے۔ جنم کا گونگا بہرہ سہی مگر باپ کے لئے تو یہ بھی انکے جگر کا ٹکڑا ہے بلکہ دوسرے لڑکوں سے زیادہ، میں نے سوچا کہ یہاں نہیں ٹکتا تو لے آؤں اور اس کی آتما کو دکھ کیوں پہنچاؤں؟

اتنی دیر میں گونگا بھی آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں لیمن کی ایک ٹھنڈی بوتل تھی۔ اور اس نے مسکراتے ہوئے وہ بوتل میرے منع کرتے کرتے بھی میرے ہاتھ میں پکڑا دی۔ میرے آتے ہی وہ میرے لئے یہ بوتل لینے چلا گیا تھا۔ وہ فخریہ مجھے بتا رہا تھا کہ یہ بوتل میں لایا ہوں اور میں پلا رہا ہوں۔ وہ اس وقت ایک خاص مسرت محسوس کر رہا تھا۔ اور میرے دل میں اس کے لئے ایک توقیر اور توصیف کا جذبہ امڈ آیا۔

میں بیٹھا رہا حتیٰ کہ بابو دوارکا پرشاد اور گونگے کے جانے کا وقت ہو گیا۔ میں نے دیکھا کہ گونگا اپنے بابو جی سے بے حد محبت کرتا تھا اور اس اثنا میں وہ اُن کے حقے پر سے بغیر ان کے کہے دو دفعہ چلم اٹھا کر لے گیا تھا اور نئی بھر کر لے آیا تھا۔ جس وقت وہ جانے لگے تو گونگے نے اپنے چھوٹے سے بھتیجے کے سر پر ہاتھ پھیرا اور اپنی جیب میں سے کچھ پیسے نکال کر اسے دیئے۔ ساتھ ہی گونگے نے میری طرف دیکھا اور مسکرا کر اشارے سے کہا کہ آج بابو جی نے مجھے بہت پیسے دیئے تھے۔

گونگے نے اپنا چھوٹا سا ٹرنک اٹھا لیا اور دوسرے میں بابو جی کا تھیلا اور چھاتہ سنبھال لیا۔ وہ کہتے رہے کہ تھیلا اور چھاتہ مجھے دیدے مگر گونگے نے انہیں کچھ نہیں اٹھانے دیا۔ اس نے سب کو نمستے کی اور یہ کہتا ہوا کہ پھر ملوں گا باپ کے ساتھ ساتھ ہو لیا۔ وہ آج بہت خوش تھا اور فخر سے اکڑ اکڑ کر چل رہا تھا مجھے محسوس ہوا کہ بابو دوارکا پرشاد کے لفظوں میں بڑی صداقت تھی۔ گونگا واقعی ایک بے زبان جانور تھا جسے ہم خوش نصیب انسانوں کی ہمدردی کے علاوہ اس وسیع اور بے سہارا دنیا میں، ایک آسرے ایک آشیانے کی ضرورت تھی۔ اس وقت گونگا وہ آسرا پائے ہوئے تھا اور مسرت میں ڈوبا ہوا جھوم جھوم کر چل رہا تھا!

اس دھرتی پر

سیٹھ مکندی سیتا پور کا سب سے مال دار آدمی تھا۔ اس چھوٹے سے گاؤں کے اِس ان پڑھ آدمی نے اتنی دولت کیسے سمیٹ لی تھی اس کا جواب تو صرف بوڑھے وقت کے پاس تھا جس کی کبھی نہ مُندنے والی آنکھ نے مکندی کی خوشحالی اور گاؤں کی بدحالی کا سارا نقشہ دیکھا تھا۔ اِس وقت مکندی کے گاؤں کے باہر دو تو اینٹوں کے بھٹّے تھے اور ایک شہر میں آٹا پیسنے کی چکّی تھی۔ ان کے علاوہ سیتا پور سے دس کوس کے فاصلے پر بوائی کے باہر، جہاں اس کی سُسرال تھی، اس کی ایک دُکان بھی تھی جس میں گوشت روٹی اور کھانے پینے کی چند اور چیزوں کے علاوہ ناجائز طور پر کشید کی ہوئی دیسی شراب اور مٹکوں میں رکھا ہوا ٹھنڈا پانی بھی بِکتا تھا۔ اِس علاقے میں پانی کی بہت کمی تھی اور مکندی نے کافی لاگت سے ایک ہاتھ کا پمپ لگوا کر پانی کی بھی تجارت شروع کر دی تھی۔ مکندی کے آدمی کسی کو اس پمپ کو ہاتھ لگانے نہیں دیتے تھے۔ اور اس میں ہر وقت ایک زنجیر اور تالہ پڑا رہتا تھا۔ سوائے تحصیل دار اور تھانے دار کے کسی کو اس کے مٹکوں کا ٹھنڈا پانی بغیر دام دیئے نہیں ملتا تھا۔ مکندی خود تو اینٹوں کے بھٹّوں پر رہتا تھا مگر دوسری جگہوں پر اس کے جو کانے، چند ھے رشتے دار بیٹھے تھے اُن میں بھی مکندی کی ہی روح تھی۔ جیسا مکندی دل کا سخت اور

ہاتھ کا کنجوس تھا ویسے ہی اس کے رشتے دار تھے۔

یہ گاؤں غریب بڑھئیوں، جلاہوں اور مزدوروں کا تھا جن کے آبا واجداد کے مکان گارے اور پھوس کے بنے ہوئے ناپائیدار گھروندے تھے جن میں اگر کوئی سامان تھا تو وہ کام کرنے کے زنگ آلود اوزار اور مکڑی کے جالے تھے۔ اس گاؤں کے رہنے والوں کی حالت بگڑتی چلی گئی تھی اور اب نہ بڑھئیوں کے پاس کام تھا اور نہ مزدوروں کے پاس مزدوری۔ گاؤں کا گاؤں بے کار سا تھا۔ بہت کم لوگوں کو شہر میں مزدوری ملی تھی یا مکندی کے بھٹوں پر کام کرتے تھے۔ سب بڑی مشکل سے جوں توں کر کے گزارہ کر رہے تھے۔ کھیتی باڑی نہ ہونے کے برابر تھی۔

ان مزدوروں کے تاریک گھونسلوں کے ارد گرد اور ان کا مونہہ چڑاتی ہوئی اگر کچھ اونچی اور پکی عمارتیں تھیں تو وہ مکندی کی تھیں۔ اس نے سات آٹھ مکان بنوا لئے تھے۔ ان میں سے دو تین میں تو اس کا اپنا ہی کنبہ پھیلا ہوا تھا اور باقی خالی پڑے تھے کیونکہ اس گاؤں میں کسی کے پاس بھی انہیں کرایے پر لینے کی استطاعت نہیں تھی۔ مکندی نے ایک عمارت بنواتے ہوئے یہ اعلان کیا تھا کہ وہ گاؤں والوں کی سرائے ہوگی اور اس میں گاؤں میں آنے والی براتیں ٹھہر سکیں گی۔ مگر گاؤں کی کوئی بھی برات اس میں نہیں ٹھہری تھی کیونکہ مکندی اپنے وعدے سے پھر گیا تھا۔ ہاں سرائے کے نام پر گاؤں کے بے کار راج مزدوروں اور بڑھئیوں سے اس نے کام برائے نام مزدوری دے کر لے لیا تھا۔

گرمیوں کا موسم شروع ہوا تو اس علاقے میں دور دور تک زمین تپنے لگی اور اس پر ایک سیاہی مائل گھونڈ آگیا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے گرم مسموم ہوا درختوں جانوروں اور انسانوں کو جھلسنے لگی۔ کوے ایک درخت سے دوسرے درخت پر کائیں کائیں کرکے اڑنے لگے۔ جدھر دیکھو ڈھور ڈنگر پریشانی کے عالم میں، مونہہ سے جھاگ لٹکائے اِدھر اُدھر پھرتے نظر آتے۔ دو چار ندی نالے جو تھے ان میں بھی پانی کی صرف ایک گدلی سی لکیر بہہ رہی تھی۔ کوؤں میں پانی برائے نام

رہ گیا تھا اور کئی کوئیں تو بالکل سُوکھ گئے تھے اتنی سخت گرمی کہ الاماں۔ بارش کا چھینٹا تک نہیں پڑا۔ جو فصلیں زمین کی نمدار کوکھ سے اُگ آئی تھیں وہ سورج کی تپش میں جُھلس گئی تھیں۔ بالکل قحط کے آثار تھے۔ بے کاری، غریبی اور خدا کا یہ قہر۔ لوگ پناہ مانگ رہے تھے اور دُعائیں کر رہے تھے۔ اُس تمام علاقے میں اگر کوئی بے فکر تھا تو وہ ملندی اور اس کے رشتے دار تھے۔ اُن کے پاس پانی بھی تھا اور ان کے کوٹھے اناج سے بھی بھرے ہوئے تھے اور گرمی کی تپش اور لُو سے بچنے کے لئے ان کے پاس ٹھنڈے مکان بھی تھے۔

ملندی کی سُسرال پوالی سے کوئی بارہ کوس پرے بڑھئیوں کا ایک اور چھوٹا سا گاؤں شاطلہ تھا۔ اس گاؤں کے تمام کوئیں سُوکھ گئے تھے اور فصلیں راکھ ہو گئی تھیں۔ گاؤں والے ایک ایک دو دو کر کے گاؤں چھوڑ رہے تھے۔ سب سے آخر اس گاؤں کو چھوڑنے والا سمیرو بڑھئی تھا۔ وہ آخر تک ٹھہرا رہا کیوں کہ اس کی بیوی رامی حاملہ تھی اور دن پورے ہو گئے تھے۔ لیکن آخر کار وہ بھی نکلنے پر مجبور ہوا۔ اس نے گاؤں میں کسی کے چھوڑے ہوئے ایک گدھے کو پکڑا اور اس پر رامی کو بٹھا کر پوالی کی طرف چل دیا۔ اس نے روٹیوں کی پوٹلی کے علاوہ اپنے اوزار بھی رکھ لیے اس کا ارادہ سیٹھ ملندی کے بھٹوں سے بھی پرے شہر میں جا کر کچھ کام تلاش کرنے کا تھا۔

سمیرو، رامی اور گدھے پر مشتمل مہاجرین کا یہ قافلہ آہستہ آہستہ چلتا رہا۔ جلد ہی سورج تیزی سے چمکنے لگا مگر سڑک کے کنارے کنارے ٹنڈ منڈ درختوں کے چھدرے چھدرے سائے میں وہ چلتے رہے۔ گدھا بھوکا بھی تھا اور اسے سمیرو بہت ہی آہستہ چلا رہا تھا کیوں کہ اس کی بیوی بیٹھی ہوئی بھی تکلیف سی محسوس کر رہی تھی۔ وہ کبھی کبھی مسکرا کر اپنی پھیکی اور خشک آنکھوں سے سمیرو کی طرف دیکھ لیتی تھی جس کے چہرے کی ساری خشکی اس کی بڑھی ہوئی تنکوں سے بھی سخت داڑھی سے جھلک رہی تھی۔ وہ مسکراتی تھی اور سمیرو اس مسکراہٹ کے پیچھے اس کے

پیٹ میں بڑھتی ہوئی بے چینی اور تکلیف کو محسوس کرتا۔ اسے دل میں دکھ ہوتا اور وہ ایک گناہ کا احساس کرتا۔ پھر وہ اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتا اور ایک مشین کی طرح قدم بڑھا دیتا۔

جس وقت یہ قافلہ پوالی پہنچا تو سہ پہر کا سورج آگ کا گولہ بن کر سروں پر چمک رہا تھا۔ نیچے ساری زمین پر ریت بھُن رہا تھا۔ اگرچہ وہ جگہ جگہ ٹھہر کر آئے تھے مگر سب کا حال بُرا تھا۔ سمیرو تھک کر چُور ہو گیا تھا اور اس نے کانپتے ہوئے بازوؤں سے رامی کو اتار کر ایک درخت کے سائے میں بٹھا دیا۔ گدھے کو پانی اور خوراک دونوں کی ضرورت تھی۔ اس نے اپنی پوٹلی کھولی اور چار موٹی موٹی روٹیاں گدھے کے آگے توڑ کر ڈال دیں۔ پھر اس نے اسے درخت سے باندھ دیا اور لوٹا اور بالٹی لیکر کھڑا ہو گیا۔

" تو یہاں بیٹھ " وہ رامی سے بولا " میں پانی کی تلاش میں جاتا ہوں۔ سامنے ایک ہاتھ کا نل نظر آتا ہے۔ جانور بھی بچارا پیاسا ہے۔ تو یہ سخت روٹیاں مت کھائیو۔ میں گاؤں سے تازہ روٹی ملے گی تو لے آؤں گا۔"

" مگر پیسے ؟"

" میرے پاس تین چار روپے ہیں۔ پھر شہر پہنچ کر تو کچھ نہ کچھ کام مل جائے گا۔"

رامی ایک تکلیف میں کراہ کر درخت کے سائے میں لیٹ گئی اور سمیرو بالٹی لے کر نظر آتے ہوئے نل کی طرف بڑھا۔ وہ پاس پہنچا تو اس نے دیکھا کہ نل میں زنجیر اور قفل پڑا ہے۔ وہ تالے کو اِدھر اُدھر ہلا ہی رہا تھا کہ ایک آدمی آیا اور بولا " کیا ہے بے! چل رستہ ناپ۔ یہ سیٹھ مکندی کا نل ہے۔"

" بھیّا مجھے پانی چاہیئے۔ میری عورت اور میرا جانور پیاسے ہیں۔"

" کہیں اور کا ہے کیا ؟ پانی کا ایک قطرہ دیکھنے کو نہیں ملتا اور تو جناور کے لئے مانگ رہا ہے۔ اِس نل سے تو پانی نہیں ملے گا۔ اور اگر اپنے لئے ایک آدھ گلاس لینا ہو تو سڑک پر دکان سے لے لے مگر پیسہ دینا ہوگا اور جناور کے لئے

اس گڑھے میں سے بھر لے۔"

سمیرو کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں اور اس نے اپنے خشک ہونٹوں کو چاٹا۔ اس کے ذہن میں ایک بگولہ سا اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کے دل میں ایک احساس تلملایا اور غائب ہو گیا۔ اس کے پاس وقت نہیں تھا، طاقت نہیں تھی اور اس کی بیوی اور جانور دونوں پیاس سے تڑپ رہے تھے۔ اس نے بالٹی کو گڑھے میں ڈبویا اور آدھی بالٹی مٹی اور پانی کی بھر لی۔ پھر وہ تیزی سے دکان کی طرف بڑھا۔ اس دکان پر کافی رونق تھی ایسا معلوم ہوتا تھا قحط کا ادھر سے گزر بھی نہیں ہوا کیوں کہ بڑے بڑے برتنوں میں پکی ہوئی کتنی ہی چیزیں رکھی تھیں اور اندر ایک پردے کے پیچھے بیٹھے ہوئے کئی لوگ کھا پی رہے تھے۔ دکان کی گدی پر ایک بہت کالا اور چیچک زدہ آدمی بیٹھا تھا جو ایک آنکھ سے کانا بھی تھا۔ یہ مکندی کا چھوٹا بھائی تھا۔ سمیرو نے جلدی سے پوچھا "لالہ پانی ملے گا؟"

" ایک گلاس کے آٹھ آنے ہوں گے۔"

" لالہ پانی کے بھی دام!"

" تو پانی کیا تیرے باپ کے گھر سے یہاں آتا ہے؟ پتہ نہیں سارے علاقے میں قحط پھیلا ہوا ہے۔"

سمیرو ایک دفعہ پھر تلملایا مگر وہ اور اس کا جانور پیاسے تھے۔ اس نے ہونٹ کو زبان سے تر کرتے ہوئے پوچھا "روٹی کیسے ملے گی؟"

" گوشت لے گا؟"

" نہیں۔ دال ہے؟"

" دو روٹی اور دال کا ڈیڑھ روپیہ ہو گا۔"

سمیرو نے حساب لگایا۔ ڈیڑھ روپیہ دال روٹی کا اور ایک روپیہ دو گلاس پانی کا۔ پھر بھی اس کے پاس ایک روپیہ چار آنے بچ جائیں گے۔ اس نے لالہ کو پیسے تھمائے اور دو گلاس پانی لوٹے میں ڈلوا کر اور دو کاغذ جیسی پتلی روٹیوں پر

دال رکھوا کر وہ جلدی سے لوٹا۔ رامی اس کو دیکھتے ہی اٹھ بیٹھی۔ سمیرو نے بالٹی گدھے کے آگے رکھی اور روٹیاں رامی کو تھما دیں۔ اس نے تھوڑی سی دال لی اور لائی ہوئی سخت روٹی خود کھانے لگا۔ رامی نے احتجاج کیا مگر سمیرو بولا "دماغ چلی ہوئی ہے کیا؟ تجھے ان نرم روٹیوں کی زیادہ ضرورت ہے۔ پیٹ والے جی کا بھی خیال رکھو۔"

روٹی کھا کر سمیرو اور رامی نے تھوڑا سا آرام کیا۔ گدھا بھی نیند اور تکان میں اونگھنے لگا۔ جب سورج ڈھل چکا اور جلتی ہوئی زمین کی آگ پر چند سایوں کا چھینٹا پڑا تو قافلہ پھر چل پڑا۔ رامی مشکل سے بیٹھی اور اس نے زیادہ آہستہ چلنے کو کہا وہ کچھ تکلیف محسوس کر رہی تھی۔ سمیرو نے اس کے پیٹ کی طرف دیکھا اور اسے ایسا محسوس ہوا کہ وہ ابھی پھٹ پڑے گا۔ اس نے رامی سے پوچھا کہ کہیں اسے وہی درد تو نہیں ہو رہے تھے جو بچے کی پیدائش سے کچھ دیر پہلے ہوتے ہیں مگر رامی نے سر ہلا دیا۔ اس نے کہا کہ وہ دن بھر گدھے پر چلتی رہی ہے اس لئے پیٹ میں کچھ درد سا ہے مگر وہ درد نہیں ہے۔

اور قافلہ سیتا پور کی سڑک پر چلتا رہا۔ وہ شام کے دھندلکوں میں اور پھر رات کے اندھیروں میں چلتے رہے۔ وہ کئی گھنٹے چلتے رہے ہوں گے۔ رامی کی تکلیف بڑھ گئی تھی اور سمیرو نے ایک دفعہ اتار کر اسے نیچے بھی بٹھایا۔ رامی نے پوچھا کہ سیتا پور اب کتنی دور ہے۔ سمیرو نے اندازہ کیا کہ شاید دو کوس ہوگا اور انہیں ڈیڑھ دو گھنٹے اور چلنا ہوگا۔ سمیرو نے رامی سے کہا کہ اگر اس کی تکلیف بڑھ رہی ہے تو وہ آگے نہ بڑھیں اور یہیں رک جائیں۔ مگر چند منٹ میں رامی کے درد پھر دب گئے اور وہ چلتے رہے۔

اندھیرا کافی بڑھ گیا تھا۔ شاید رات کے نو بجے ہوں گے۔ سیتا پور ابھی دور ہی تھا اور سمیرو تیزی سے گدھے کو ہانکتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ کافی دیر تک رامی کو کوئی تکلیف نہیں ہوئی اور وہ آگے بڑھتے رہے۔ مگر پھر یکایک رامی کے پیٹ

میں درد کی لہریں اٹھیں اور اس نے ایک تکلیف میں اپنے ہونٹ بھینچے۔ اس نے چلتے چلتے سمیرد کا بازو پکڑلیا اور اُسے رُکنے کو کہا۔ اس نے سمیرد سے کہا کہ وہ اسے تھام لے اور جلد جلد گاؤں میں پہنچ کر کہیں ٹھہر جائے۔ سمیرد نے اسے تھاما اور وہ دونوں انتہائی پریشانی کے عالم میں گاؤں کی جانب بڑھے۔

وہ گاؤں کی سرحد پر پہنچے ہی ہوں گے کہ انہوں نے دیکھا کہ آسمان یکایک مٹیالا ہو گیا ہے اور ساری فضا میں ایک دھندلاہٹ سی پھیل گئی ہے۔ پھر ایک تیز شور مچا اور اس کے ساتھ ہوا چلی اور درختوں کی ٹہنیوں میں گھس کر سیٹیاں بجانے لگی سمیرد نے اپنی آنکھوں کے اوپر ہاتھ رکھ کر چاروں طرف دیکھا۔ شاید کوئی بڑی آندھی یا زبردست طوفان آرہا تھا۔ وہ جلد جلد آگے بڑھے مگر گاؤں میں داخل ہوئے ہی تھے کہ تیز اور تند ہوا کا ایک زبردست طوفان اٹھا اور خوف ناک تیزی اور تندی سے زمین پر ٹوٹ پڑا۔ چاروں طرف دل دہلا دینے والی پھٹ پھٹ کی آوازیں آئیں اور ماحول کے ذرّے ذرّے سے عجیب و غریب شور اور آوازیں آنے لگیں۔

سمیرد نے پہلے تو رامی کو اپنے دونوں ہاتھوں میں سنبھالا مگر پھر اسے نیچے اتار لیا کیوں کہ گدھا بے قابو ہو رہا تھا۔ سمیرد نے اسے نیچے اتارا ہی تھا کہ گدھے نے رسّی چھڑالی اور رینگتا ہوا گاؤں کی طرف بھاگا۔ سمیرد نے رامی کے اوپر اپنی چادر ڈالی اور اسے طوفان اور ریت سے بچایا مگر رامی کا درد بڑھ رہا تھا اور وہ ہمّت کرکے اٹھی اور اس نے سمیرد کو گاؤں کے اندر چلنے کو کہا۔ سمیرد آہستہ آہستہ چل کر گاؤں میں داخل ہوا۔ طوفان کی تیزی بدستور تھی مگر اندر گلیوں میں اس کی تندی باہر کی بہ نسبت کم تھی۔ سارا گاؤں سنسان اور اجاڑ تھا جیسے کوئی شہر خموشاں ہو۔ لوگ اندر طوفان سے ڈر کر دبکے ہوئے تھے اور اس کے علاوہ رات بھی کافی ہو گئی تھی سمیرد تکلیف میں کراہتی ہوئی رامی کو لے کر ایک بڑی حویلی کے چبوترے پر چڑھا اور اس نے دروازے کو زور زور سے کھٹکھٹایا۔ یہ سیٹھ مکندی کا مکان تھا۔ کافی دیر تک اندر سے کوئی نہیں بولا۔ مگر جب سمیرد نے دروازہ اور زور سے کھٹکھٹایا

اور آوازیں بھی دیں تو ہاتھ میں لالٹین لئے ہوئے ایک بوڑھے نے دروازہ کھولا۔

" بھیّا یہ حویلی کس کی ہے ؟" سمیرو نے پوچھا۔

" ارے تم گاؤں کے نہیں ہو کیا ؟ سارا جگت جانت ہے سیٹھ مکندی کی ہے تم کون ہو اور کہاں سے آت ہو۔"

" بھیّا میں بِوالی کی طرف سے آرہا ہوں۔"

" بِوالی سے ؟ — سیٹھ کی سسرال سے۔ ٹھہرو۔"

یہ کہتے ہوئے بوڑھا اندر چلا گیا اور اس نے سیٹھ سے کہا کہ بِوالی سے کوئی آیا ہے۔ سیٹھ سمجھا کہ شاید اس کی سسرال سے یا دُکان سے کوئی آیا ہے۔ وہ بوڑھے کے ساتھ ہی نیچے چلا آیا۔ طوفان ابھی بند نہیں ہوا تھا اور رامی اپنا سر چھپائے نیچے بیٹھی تھی اور سمیرو دروازے سے سر لگائے کھڑا تھا۔ سیٹھ بولا " کون ہے رے ؟"

" لالہ میں ایک مصیبت کا مارا بڑھئی ہوں اور شاملہ سے آیا ہوں۔"

" شاملہ سے ؟ ارے چندو تُو تو کہتا تھا میری سُسرال سے کوئی آیا ہے۔ خیر کیا بات ہے۔ ایسے طوفان میں تو اُٹھائی گیرے ہی پھرتے ہیں۔"

" میں اُٹھائی گیرا نہیں بڑھئی ہوں۔"

" بک بک مت کر جلدی سے اپنی بات کہہ۔"

" لالہ صرف رات کے لئے اپنی حویلی میں کوئی جگہ دے دو، میری عورت تکلیف میں ہے اور بچّہ ہونے والا ہے۔"

" چل چل یہ پاکھنڈ میں نے پہلے بھی دیکھے ہیں۔"

" لالہ میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔ یہ عورت بیٹھی ہے۔ اِس کی حالت تو دیکھ رہے ہو۔"

" میرے پاس کوئی جگہ نہیں ہے۔"

" کرائے پر مانگت ہو ؟" چندو بولا۔

" پیسے دینے ہیں کچھ ؟" مکندی نے پوچھا۔

" لالہ میں تو قحط کا مارا گھر سے نکلا ہوں۔ میرے پاس صرف سوا روپیہ ہے"۔

" چل بھاگ یہاں سے۔ سوا روپیہ لے کر آیا ہے"۔

" لالہ تم اتنے بھاگوان ہو۔ تمہاری کتنی حویلیاں ہیں۔ تم کوئی جگہ رات بھر کے لئے نہیں دے سکتے۔ ہم اس طوفان میں کہاں جائیں۔ عورت کی تکلیف کا خیال کرو"۔ سمیرو گڑگڑا کر بولا۔

" اِن باتوں کو مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوگا۔ میری حویلیاں ہیں یا نہیں ہیں، خالی پڑی ہوئی ہیں یا بھری ہوئی ہیں اس سے تجھے کوئی مطلب نہیں"۔

" اگر تم پیسے کی وجہ سے مجھے کمرہ نہیں دے رہے ہو تو میں جتنا تمہارے مکانوں میں لکڑی کا کام ہوگا سب کر دوں گا"۔

" اِس جھانسے کو رہنے دے۔ میرے پاس کوئی کام نہیں ہے۔ خیر چونکہ اِس وقت طوفان ہے اور تیری عورت تکلیف میں ہے تو اُسے سامنے میرے بیل خانے میں لے جا۔ وہاں میری بھینسیں بندھی ہوئی ہیں۔ وہاں گھسیٹا کو آواز دے لینا"۔

اور مکندی نے تیزی سے دروازہ بند کر لیا۔ ہوا کا ایک تیز جھکڑ شور مچاتا ہوا آیا اور مکندی کے دروازے سے سر پھوڑ کر لوٹ گیا۔ مگر سمیرو اور رامی نے اپنا سر ڈھانپ لیا۔ رامی کے پیٹ میں درد کی لہریں اب تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد اٹھ رہی تھیں۔ وہ سمیرو کی ٹانگوں سے چپٹ گئی۔ سمیرو نے اسے سہارے سے اٹھایا اور وہ دونوں طوفانی ہوا اور شور کو چیرتے ہوئے مکندی کے بیل خانے کی طرف بڑھے۔

بیل خانے کا رکھوالا گھسیٹا ایک بوڑھا اور شریف آدمی تھا۔ اس نے بڑی ہمدردی کے ساتھ انہیں اندر آنے دیا۔ یہ ایک اصطبل نما وسیع کچا کوٹھا تھا جس میں گھپ اندھیرا تھا۔ اس میں تین بھینسیں بندھی کھڑی تھیں اور اندر کی فضا جگہ جگہ پڑے ہوئے گوبر کی وجہ سے متعفن تھی۔ گھسیٹا نے بھینسوں کو لکڑی مار کر اٹھایا اور ایک طرف کو کر دیا۔ پھر اس نے اپنی چادر رامی کے لئے نیچے بچھا دی اور خود بھینسوں سے بھی پرے کونے میں دبک کر ایسے لیٹ گیا جیسے تھا ہی نہیں۔ رامی درد سے کراہتی ہوئی

نیچے لیٹ گئی۔ باہر طوفان بہت ہی تیز ہو گیا تھا جیسے آج زمین کی ہر چیز اکھاڑ پھینکیگا
گھسیٹا بہت ہی جلد اکھڑ گیا اور اٹھتے ہی سب سے پہلی آواز جو اس کے کانوں میں پڑی وہ بچے کے رونے کی آواز تھی۔ اس نے بھینسیں کھولیں اور انہیں باہر باندھ دیا۔ طوفان رات کو نہ جانے کب تھم گیا تھا۔ اس وقت تو آسمان پر سیاہ سیاہ بادلوں کے بے شمار تنبو ٹنگے ہوئے تھے۔ گھسیٹا نے اوپر دیکھا۔ بادل گرج رہے تھے اور نیچے بڑی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ بھینسیں اوپر دیکھ کر، مونہہ پھاڑ کر چیخ رہی تھیں وہ اپنے پاؤں خوشی میں پٹکا رہی تھیں اور ان کے گلوں میں پڑی ہوئی گھنٹیاں زور زور سے بج رہی تھیں۔ گھسیٹا کے ہاتھ آسمان کی طرف ایک دعا میں اٹھے بھی نہیں تھے کہ بادل پھٹ پڑا اور اس کے بڑے جہاز میں سے چھم چھم کرتی ہوئی بارش نیچے آ گری۔ بھینسیں اور چیخیں۔ گھسیٹا خوشی سے پھولا نہ سمایا۔ کتنی موٹی موٹی بوندیں تھیں بالکل اناج کے دانوں کی طرح۔ دھرتی کی ساری پیاس بجھ جائے گی اور بادلوں کے تو بہت ہی سیاہ ہاتھی جھوم آئے تھے اور ایک خوفناک گڑگڑاہٹ میں گرج رہے تھے گھسیٹا اندر گیا اور اس نے اپنا سرسوں کے تیل کا دیا جلایا۔ رامی نے اپنی ٹانگیں سکڑ کر کروٹ بدل لی۔ سمیرو بیٹھا تھا بارش کی آواز اس نے بھی سن لی تھی۔ گھسیٹا بولا " بھائی بدھائی ہو — منا ہے نا ؟"

" ہاں بھیا لڑکا ہے۔"

" بڑا ہی بھاگوان لڑکا ہے۔ کیسی گھڑی جنم لیا ہے۔ ذرا باہر تو دیکھو کیسی برکھا ہے جل تھل ایک ہو رہا ہے۔ ایسی بھور تو نصیب سے ملتی ہے۔ یہ لڑکا کوئی بڑا آدمی بنے گا۔"

سمیرو نے گھسیٹا کی طرف دیکھا مگر اس کے چہرے پر مسکراہٹ کا نشان تک نہیں ابھرا۔ باہر برکھا ضرور ہو رہی تھی مگر اس کے دل کی سوکھی کھیتی تو ویسے ہی سوکھی پڑی تھی۔ اس نے اپنے لخت جگر کو ہاتھوں میں لیا اور بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔" یہ بڑا آدمی بنے گا یا نہیں یہ تو میں نہیں جانتا۔ یہ بڑھئی کا بیٹا ہے اور میں

اسے بڑھئی کا کام ہی سکھاؤں گا۔ ہاں شاید یہ اتنا بھاگوان ہو جائے کہ باپ کی طرح کمزور اور مجبور نہ ہو۔ شاید اس کے بازوؤں میں اتنا بل ہو جائے کہ اپنے اوپر گرجتے ہوئے کسی ملکندری کی کلائی مروڑ دے اور اپنے اوپر ظلم کرتے ہوئے کسی ظالم کا ہاتھ تھام لے۔"

یہ کہہ کر اس نے اپنے بچّے کو چوما اور ماں کی گود میں لٹا دیا۔ اس کے بعد وہ اٹھا اور دہلیز میں کھڑا ہو گیا۔ بڑی موسلا دھار بارش ہو رہی تھی اور مدت کی بن نہلائی اور پیاسی بھینسیں خلافِ معمول سر جھکائے کھڑی تھیں۔ گاؤں کے چاروں طرف بارش اور بادلوں کے دھندلکے میں سے صبح کا اُجالا پھوٹ رہا تھا۔ مگر سمیر واس گھڑی بھی کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ خوشی کے اس لمحے میں بھی اس کی آنکھیں دھیرے دھیرے نم ہو رہی تھیں۔

دو دِل

کالو کی دُکان گاؤں سے باہر جیت گڑھ کو جانے والے راستے پر تھی۔ یہ دُکان کالو کا گھر بھی تھا۔ اور وہ اِس میں اپنی لڑکی لچھمی کے ساتھ مدّت سے رہتا تھا۔ اِن دونوں کے علاوہ اِس دُکان میں دو اور افراد کام کرتے اور رہتے تھے۔ ایک بوڑھا شِو سنگھ جو کالو کا بہت پُرانا دوست تھا اور جسے لچھمی چاچا کہتی تھی۔ اور دوسرا شیرو جو چھ مہینے ہوئے جیت گڑھ سے آیا تھا۔ اور اِسی دُکان میں کام کرنے لگا تھا۔ اِس دُکان کے گاہک زیادہ تر جیت گڑھ اور اُس کے آس پاس کے پہاڑی گاؤں کی طرف جانے والے اُس طرف سے نیچے اُترنے والے راہی تھے۔ اِس دُکان میں بھوک اور پیاس مٹانے والی کئی چیزیں ملتی تھیں۔ مثلاً دال روٹی۔ چائے۔ گُڑ کے شکرپارے۔ بھنے ہوئے مکّی کے دانے اور چنے۔

اِس دُکان کے تقریباً ہر روز آنے والے گاہکوں میں بھیکو چودھری بھی تھا اُس کا گاؤں اِس دُکان سے تقریباً تین کوس پر ہوگا۔ مگر وہ ہر روز ہی آجاتا اور کسی شام کو یہیں رہ جاتا۔ اُسے اِس دُکان کی دال روٹی اور چائے بہت ہی اچھی لگتی تھی بھیکو اچھا پیسے والا آدمی تھا۔ وہ پینتالیس سال کا تھا مگر پھر بھی اب تک کنوارا تھا کالو کبھی کبھار اُس سے روپے بھی اُدھار لے لیتا تھا۔ اور اِس لئے بھی اُس کے

دل میں بھیکو کے لئے بڑی عزت تھی۔ اس کے علاوہ کالو کو پینے کی عادت تھی۔ اور بھیکو کبھی کبھی اپنے گاؤں کی کشید کی ہوئی شراب بھی لے آتا۔

لچھی کوئی سترہ سال کی تھی۔ وہ گٹھیلے جسم کی گول مٹول سی لڑکی تھی۔ جس کے گال سیب کی طرح سُرخ، چکنے اور سڈول تھے۔ اُس کی آنکھوں میں چڑھتی جوانی کے مستی سے شرابور، لپکتے، دوڑتے اور چنچل شرارے تھے۔ اُس کی چال میں ہرن کی چوکڑی کی سی تیزی اور لپک تھی۔ وہ اپنی تنگ چولی اور لہنگے میں اِدھر اُدھر پھُدکتی رہتی اور اس کے کانوں میں چاندی کے بڑے بڑے کُنڈل جھولتے رہتے۔ دُکان کے لئے روٹی اور چائے لچھی ہی تیار کرتی تھی۔ اور دکان پر سب سے زیادہ دال روٹی اور چائے ہی بکتی تھی۔ بھیکو نے تو کئی دفعہ کہا تھا کہ لچھی کے ہاتھ میں بڑی مٹھاس تھی اور جو چیز وہ تیار کرتی تھی اس میں شکر سی گھل جاتی تھی۔

جہاں تک شادی کا تعلق تھا، بھیکو نے اپنی تمام زندگی میں عورت کی مزاحمت کی تھی مگر وہ لچھی کی طرف کھنچتا چلا گیا۔ کچھ عرصے سے وہ یہ سوچ رہا تھا کہ اگر اُس کی شادی لچھی سے ہو جائے تو اِس معاملے میں اُس کے اب تک کے نقصان یا غفلت کی تلافی ہو جائے گی۔ اس کے علاوہ کالو کا بوجھ بھی ہلکا ہو جائے گا۔ کالو لچھی کے لئے بر ڈھونڈ ہی رہا تھا مگر سوال یہ تھا کہ بھیکو کس طرح بات چھیڑے۔ اُس نے پہلے سوچا کہ شو سنگھ سے ذکر کرے اور شو سنگھ خود کالو سے بات کرے گا۔ لیکن بعد میں وہ اِس نتیجے پر پہنچا کہ اس کا خود شو سنگھ سے یا کالو سے بات کرنا مناسب نہ ہو گا۔ اِس کے لئے اُس نے اپنے گاؤں کے پٹواری رام اوتار کو تیار کیا۔ جو اسی روز نیچے کالو کی دُکان پر پہنچ گیا۔ دوپہر کا وقت تھا۔ کالو، لچھی اور شو سنگھ دو چارپائیوں پر آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ شیر دکہیں باہر گیا ہوا تھا۔ پٹواری نے ایسا ظاہر کیا کہ وہ کسی خاص کام کے لئے نہیں آیا تھا۔ اُس نے چائے پی اور کالو کے پاس بیٹھ کر حقہ گڑگڑانے لگا۔ اِدھر اُدھر کی بات کرنے کے بعد لچھی کی طرف دیکھ کر بولا۔

"چھوری کے لئے دیکھ لیا کوئی بر؟"

" دیکھ رہا ہوں۔ تم بھی کوئی بتا دینا!"

کالو بولا۔

" سمیر و کا چھورا دیکھ لے۔"

" وہ تو مشکل سے تیرہ برس کا ہوگا۔"

" ہاں ہے تو چھوٹا ہی ـــــ اور ہاں!" پٹواری بن کر بولا "چودھری بھیکو بھی تو بیاہ کرنے کی سوچ رہے ہیں۔ اگر وہ مان جائیں تو کیا کہنے۔ چھوری راج کرے گی!"

لچھی یہ سنتے ہی اٹھ کر چلی گئی۔ شیو سنگھ بھیکو کا نام سن کر پہلے چونکا۔ لیکن پھر پٹواری کی طرف زیادہ متوجہ ہو گیا۔

کالو بولا۔

" پٹواری میں چھوٹا آدمی ہوں۔ میرے ایسے بھاگ کہاں کہ لچھی اتنے بڑے گھر چلی جائے۔"

" کالو یہ نہ کہہ۔ چھوکری کے بھاگ ہوں تو محل میں بھی چلی جائے۔"

پٹواری بولا

اس پر شیو سنگھ نے بھی ہاں میں ہاں ملا دی۔ کالو بولا۔

" سو تو ٹھیک ہے پٹواری۔ مگر میری تو ہمت چودھری سے کہنے کی نہ پڑے۔"

" یہ کام مجھ پر چھوڑ دو۔ پٹواری نے کہا۔" میں چودھری کو راضی کر لوں گا۔ اُسے لین دین کا کوئی لالچ نہیں ہے اور پھر تمہاری لڑکی سینکڑوں میں ایک ہے۔"

پٹواری کچھ دیر اور بیٹھا۔ اور پھر ایک گلاس اور چائے پی کر اور کالو سے وعدہ کر کے روانہ ہو گیا۔ کالو پٹواری کے جاتے ہی شیو سنگھ کی طرف مڑا اور بولا

" شیو سنگھ یہ تو گھر بیٹھے گنگا آگئی۔ تم ایسا کرو لچھی سے بھی بات کر لو۔ پیچھے درخت کے نیچے ہو گی۔"

شیو سنگھ پیچھے کی طرف باہر گیا۔ لچھی درخت کے نیچے نہیں تھی۔ اس نے

آواز دی۔ لیکن صرف درخت کے اوپر بیٹھی ہوئی ایک کوئل اڑ گئی۔ وہ آگے بڑھا کہ لچھی شاید سامنے درختوں کے جھنڈ میں کہیں بیٹھی ہو۔ مگر جھنڈ تلے صرف سہانی ہوا تھی۔ اور دھوپ اور چھاؤں کی کچھ لکیریں آنکھ مچولی کھیل رہی تھیں۔ شوسنگھ کو کچھ سرسراہٹ سی محسوس ہوئی۔ وہ دبے پاؤں آگے بڑھا۔ برگد کے درخت کے پیچھے ایک ٹھنڈی چھاؤں والے گڑھے میں ایک پتھر پر شیرو اور لچھی بیٹھے تھے۔ شوسنگھ کو دیکھتے ہی لچھی تڑپ کر الگ ہو گئی۔ اُس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ گال تمتما رہے تھے۔ اور پیشانی پر گھبراہٹ اور حیا سے پسینہ پھوٹ آیا تھا۔ شیرو کا چہرہ بھی سُرخ تھا۔ اُس کے بازوؤں کی مچھلیاں اُبھر آئی تھیں۔ اُس کے کُرتے کے بٹن کھلے ہوئے تھے۔ اور اُس کا سینہ کُندن کی طرح دمک رہا تھا۔ شوسنگھ لوٹ آیا۔ اور اُس کے پیچھے پیچھے لچھی آ گئی۔ تھوڑی دیر بعد شیرو بھی آ گیا۔ شوسنگھ نے یہ بات کالو کو نہیں بتائی۔

شیرو نوجوان تھا۔ لچھی نوجوان تھی۔ اور اس نے دو محبت بھرے دلوں کو ملتے دیکھا تھا۔ دونوں رُوپ اور جوانی کی اُمڈتی ہوئی ندیاں تھیں۔ جو شور مچاتی ہوئی بل کھاتی ہوئی بہہ رہی تھیں۔ دوڑ رہی تھیں۔ شیرو کے مقابلے میں بھیکو تھا۔ جس کی جوانی کے ذرّے ماند پڑ چکے تھے۔ جس کے چہرے پر ایک ڈسنے والی سنجیدگی اور بڑا پن تھا۔ جس کے سینے میں جذبات کا کوئی طوفان موجزن نہیں تھا۔ جو بالکل برگد کی طرح پھیلا ہوا خاموش، سرد اور سیاہ تھا۔ لچھی کے بارے میں کالو کی براہِ راست بھیکو سے بھی بات ہو گئی۔ کالو نے بھیکو کو بتایا کہ وہ اِس تجویز سے بڑی عزت افزائی محسوس کر رہا تھا۔ شوسنگھ بھی پاس ہی بیٹھا تھا۔ اُس نے بتایا کہ جب اس نے لچھی سے اِس رشتے کا ذکر کیا تو لچھی نے بڑی جھجک محسوس کی اور ہاں یا نا کئے بغیر وہ اُٹھ کر چلی گئی۔ اس پر بھیکو بولا کہ لچھی بڑی شرمیلی اور شریف لڑکی تھی۔ اور اُس کے اِن ہی گنوں کی وجہ سے وہ اُسے قبول کرنے کو تیار تھا۔ پھر بھی اُس نے شوسنگھ سے کہا کہ وہ پھر کبھی بات کر کے لچھی کی رضامندی بھی لے لے۔ مگر کالو نے بھیکو سے پکا وعدہ کر لیا کہ وہ لچھی کی شادی اُسی سے کرے گا۔

اس کے کئی دنوں بعد کی بات ہے۔ کالو کی طبیعت کچھ خراب سی تھی اور وہ صبح ہی سے چارپائی پر لیٹا ہوا تھا۔ شیرو برتن وغیرہ صاف کر کے درختوں کی طرف گیا ہوا تھا۔ شوسنگھ گدی پر بیٹھا ہوا تھا۔ کالو کی طرف دیکھتی ہوئی لچھی بھی باہر چلی دی۔ لچھی کے جانے کے کافی دیر بعد بھیکو آیا۔ اُس کا چہرہ بہت پریشان تھا اور اُس کا سانس پھولا ہوا تھا۔ اُس نے کالو کی طرف دیکھا جو منھ ڈھانپے لیٹا ہوا تھا۔ بھیکو گدی پر ہی چڑھ گیا اور شوسنگھ سے بولا۔" شوسنگھ! میں نے آج جو کچھ دیکھا ہے اُس سے میرا خون کھول رہا ہے۔ تم نے آستین کا سانپ پال رکھا ہے!"

" کیا ہوا چودھری؟" شوسنگھ نے پوچھا۔

" جھنڈ کی طرف شیرو لچھی سے ہنسی ٹھٹھا کر رہا تھا۔ اُس نے لچھی کی کلائی بھی پکڑی ہوئی تھی۔ میں تو کہہ رہا ہوں کالو کو جگا کر ابھی سب کچھ بتا دوں۔"

" نا نا چودھری ایسا نہ کرنا۔" شوسنگھ بولا۔" کالو کا غصہ تم کو معلوم ہے۔ ابھی خون خرابہ ہو جائے گا۔ اور پھر بدنامی اپنی ہے!"

اِتنے میں لچھی اور شیرو بھی آ گئے۔ اور بھیکو چپ ہو گیا۔ وہ ایک چارپائی گھسیٹ کر کروٹ کے بل لیٹ گیا۔ شیرو کی ایک ایک حرکت کو وہ دیکھ رہا تھا اور تاؤ کھا رہا تھا۔ شیرو اب بھی لچھی کی طرف بار بار دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ بھیکو سخت پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ اُس نے رات بھر وہیں رہنے کا فیصلہ کیا۔ عام طور پر دُکان کے پچھواڑے میں کالو، شوسنگھ اور لچھی سوتے تھے۔ اور دُکان کے آگے شیرو چارپائی ڈال لیتا تھا۔ آج شیرو کے علاوہ دُکان کے آگے بھیکو کی چارپائی بھی تھی۔ اور بھیکو کی وجہ سے کالو نے بھی اپنی چارپائی اِدھر ہی ڈلوائی تھی۔ لیکن کالو اور بھیکو کی چارپائیوں اور شیرو کی چارپائی کے درمیان کوئی دس گز کا فاصلہ تھا۔ سونے سے پہلے شوسنگھ بھی بھیکو کے پاس بیٹھا رہا۔ شیرو جو دن بھر سخت محنت کرتا تھا چارپائی پر پڑتے ہی سو گیا تھا۔ کالو کی طبیعت اب کچھ اچھی تھی۔ بھیکو کالو کے قریب ہو کر بولا۔

" کالو! میں کہنا تو نہیں چاہتا تھا مگر یہ میری اور تمہاری عزت کا معاملہ ہے!"

" کیا بات ہوئی ؟ " کالو گھبرا کر بولا۔

" بس زیادہ کیا پوچھو گے، یہاں شیرو کا رہنا ٹھیک نہیں ہے !"

" آخر بات کیا ہوئی ؟" کالو بے تاب ہو کر بولا " کیا شیرو نے کوئی ایسی ویسی ...."

" کالو۔" بھیکو بات کاٹ کر بولا " آگ اور پانی کا کیا میل۔ تم نے پتہ نہیں شیرو کو کیسے رکھ لیا تھا۔ میں نے خود آج دیکھا۔ اُس نے لچھی کی کلائی پکڑی ہوئی تھی۔"

" ہیں ــــ !" کالو بھاری آواز میں بولا۔ وہ تیزی سے چارپائی پر سے اٹھا اور دُکان میں سے لاٹھی نکال لایا۔ غصّے سے اُس کا جسم کانپنے لگا۔ بھیکو اور شو سنگھ نے اُسے پکڑ لیا مگر وہ زور زور سے بولنے لگا۔ بھیکو نے سمجھایا کہ لڑائی جھگڑے سے بات دُور دُور تک پھیل جائے گی۔ اور بدنامی ہوگئی تو لچھی کی شادی بھی مشکل ہو جائے گی۔ مگر کالو کی آنکھوں میں خون اُتر رہا تھا۔ وہ اب ایک منٹ بھی شیرو کو دُکان میں نہیں دیکھ سکتا تھا۔ وہ اپنے آپ کو چُھڑا کر بھاگا۔ اور اُس نے زور سے لاٹھی شیرو کے پیروں کی طرف ماری۔ جو کچھ چارپائی کی پٹی پر اور کچھ کمبل میں لپٹی ہوئی ٹانگوں پر پڑی۔ لاٹھی پڑتے ہی شیرو ہڑبڑا کر کھڑا ہو گیا۔ کالو کڑک کر بولا۔

" بدمعاش! فوراً یہاں سے چلا جا۔ ورنہ ہڈی پسلی ایک کر دوں گا۔"

شیرو چند لمحے مبہوت اور ساکت کھڑا رہا۔ کالو کی لاٹھی کو بھیکو نے پکڑ لیا تھا۔ اور شو سنگھ نے کالو کو کمر سے تھاما ہوا تھا۔ شیرو بھیکو کو دیکھتے ہی سمجھ گیا کہ ماجرا کیا ہے۔ شو سنگھ بولا۔

" شیرو! تمہارے لئے یہی بہتر ہے کہ صبح ہوتے ہی یہاں سے چلے جاؤ!"

" نہیں نہیں صبح کس سالے کی!" کالو کڑک کر بولا۔ " ابھی اِسی وقت دفع ہونا ہوگا۔ ورنہ جان سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔"

" شو سنگھ!" بھیکو بولا " اب یہ یہاں ایک منٹ بھی نہیں رہ سکتا۔ اگر اِسے راستے میں بھیڑیوں کا ڈر ہے تو ٹیلے پر جا کر سو رہے۔ اور صبح ہوتے ہی جہاں اِس کے سینگ سمائیں بھاگ جائے۔"

کالو نے ایک بار پھر بھیکو سے لاٹھی چھڑانے کی کوشش کی۔ لیکن خیرو نے معاملے کی نزاکت کو فوراً محسوس کر لیا۔ اُس نے اپنا کمبل اٹھایا۔ پگڑی سمیٹی اور سر پر لپیٹ لی۔ اور جوتا پاؤں میں ڈال کر ٹیلے کی طرف روانہ ہو گیا۔ چاروں طرف گھُپ اندھیرا تھا۔ اور خیرو چند ہی لمحوں میں تاریکی میں تحلیل ہو گیا۔ لیکن کچھ دیر تک پتھریلی زمین پر پڑتے ہوئے اُس کے بھاری قدموں کی آواز آتی رہی۔ اُس کے جاتے ہی کالو اپنی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ وہ بالکل گم صُم سا ہو کر لیٹ گیا۔ جیسے کسی گہری سوچ میں ہو۔ کچھ دیر بعد اُس نے کروٹ لی اور بھیکو سے بولا۔

"اب چودھری ایسا کرو۔ کوئی تاریخ طے کر کے میرا بوجھ ہلکا کرو۔"

"میں تو تیار ہوں۔ شِو سنگھ کوئی تاریخ سُجھا لیں۔" بھیکو بولا۔

"شِو سنگھ کل گاؤں جا کر پنڈت جی سے مل آؤ۔ اور جاؤ اب اُدھر چلے جاؤ۔ لچھی اکیلی سو رہی ہے۔" کالو بولا۔

شِو سنگھ دُکان کے پچھواڑے چلا آیا۔ اُس نے لچھی کو چارپائی پر بیٹھی پایا۔ لچھی کالو کی آواز سُن کر جاگ گئی تھی۔ اور اُس نے دُکان کے دروازے کی اوٹ میں کھڑے ہو کر سارا جھگڑا دیکھ لیا تھا۔ ایک ایک بات سُن لی تھی۔ شِو سنگھ کے پہنچتے ہی لچھی نے اُس کے پاؤں پکڑ لئے اور بولی۔

"چاچا! میں زہر کھا لوں گی۔ لیکن بھیکو سے شادی نہیں کروں گی۔ ہرگز نہیں کرونگی!" لچھی رونے لگی۔ شِو سنگھ گھبرا گیا۔ اور اس نے لچھی کو اپنے پاؤں سے الگ کرتے ہوئے اُسے فوراً سو جانے کو کہا۔ کیونکہ کالو ابھی تک جاگ رہا تھا۔ اُس نے لچھی کو دلاسا دیا کہ وہ کل اِس بارے میں بات کرے گا۔ لچھی اس کا کہنا مان کر لیٹ گئی۔ مگر آنکھوں میں نیند کہاں؟ اُس کی نظریں کبھی پلک کر تاریکی میں ڈوبے آسمان میں کھو جاتیں۔ یا کبھی سامنے بھُوت کی طرح کھڑے ہوئے ٹیلے پر دوڑ جاتیں۔ اُس کا خیرو اُس سے دُور سامنے ٹیلے پر لیٹا ہوا تھا۔ اُسے پتھروں کے بستر پر نیند کہاں آئی ہو گی۔ اُس کی نگاہیں بھی ضرور وہاں سے نیزے بنی ہوئی لچھی کی طرف لگی ہوئی

ہوں گی۔ صرف چند گھنٹوں میں شیرو وہاں سے چل پڑے گا۔ اُف چند گھنٹوں میں! اور پھر کوئی بھی اُسے اُس کے شیرو سے نہیں ملا سکے گا۔ لچھی آنکھیں پھاڑے بُت بنی لیٹی ہوئی سوچتی رہی۔ یہاں تک کہ کئی گھنٹے ہو گئے۔

پرے پہاڑیوں پر گیدڑوں کی آوازیں اب بہت کم ہو گئی تھیں۔ لچھی اُٹھ بیٹھی اُس کے اِرد گرد اب بھی اندھیرا تھا۔ پھر کہیں دُور کنوئیں میں ڈول گرنے کی آواز آئی۔ وہ کھڑی ہو گئی۔ شِو سنگھ سینے تک کمبل اوڑھے سویا پڑا تھا۔ لچھی نے آہستہ سے اُس کا سر اور منھ بھی ڈھانپ دیا۔ پھر اُس نے چوروں کی طرح اِدھر اُدھر دیکھا۔ اور اپنے بستر سے کمبل اٹھا کر اپنے اِرد گرد لپیٹ لیا۔ اُس کی نگاہیں ٹیلے کی طرف پرواز کر گئیں جو ابھی تک تاریکی اور دُھند کے جال میں اوجھل تھا۔ اُس نے ایک بار اور شِو سنگھ کی طرف دیکھا۔ اور دبے دبے پاؤں وہاں سے چل دی۔ اگر شیرو اس کے پہنچنے سے پہلے ہی چل دیا تو وہ کبھی اسے پا نہ سکے گی۔ اس لئے کچھ دُور چل کر وہ دوڑنے لگی۔ وہ دوڑتی چلی گئی۔ اور ٹیلے پر پہنچکر ہی دم لیا۔

اس کے چند ہی لمحے بعد کمبلوں میں لپٹے ہوئے لچھی اور شیرو دُھند اور تاریکی کو چیرتے ہوئے نیچے اُتر رہے تھے! نیچے اُن کے سامنے کئی راہیں تھیں۔ اِس گاؤں سے مختلف، ایک نئی وسیع دُنیا جہاں شاید وہ پریمی، دو دل جی سکیں۔ وہ ایک راستے پر ہو لئے۔ اور تقریباً دوڑنے لگے ——— کیونکہ اُنہیں پو پھٹنے سے پہلے ہی گاؤں سے بہت دُور چلے جانا تھا!

زندگی کا رقص

وہ اُٹھ گیا اور ندی کے اس پار ڈوبتے ہوئے سورج کو دیکھنے لگا۔ سہ پہر کی نرم بے جان دھوپ ڈھل چکی تھی اور افق میں کانپتے ہوئے زرد سونے کے سوا تمام فضا میں ایک دھندلکا چھا گیا تھا تیزی سے سمٹتی ہوئی روشنی ایک اندھیرے کی گود میں گم ہو رہی تھی اور اُسے ایسا محسوس ہوا کہ ایک زندگی موت سے ہم کنار ہو رہی ہے اور موت کا خیال آتے ہی اس کے بوڑھے جسم میں کپکپی دوڑ گئی، اور وہ سوچنے لگا کہ کسی بھی لمحے وہ بھی اسی طرح ایک اندھیرے کی گود میں کھو جائیگا۔
وہ خوف زدہ سا ہو گیا اور جلد جلد اپنے گھر کی طرف چلنے لگا جو یہاں سے پاس ہی تھا۔
گھر پہونچ کر وہ سیدھا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اُسے دیکھتے ہی نوکر دوڑ کر آیا اور اس نے اس کے کمرے کی بتی جلائی، اس کے ہاتھ سے اس کی چھڑی لی اور اُس کا لمبا کوٹ اُتارنے لگا۔ وہ پلنگ پر بیٹھ گیا اور اُس نے نوکر کو چائے لے آنے کے لئے کہا بستر پر لیٹ کر اور لحاف اپنے پاؤں پر ڈال کر وہ پھر سوچنے لگا۔ یہاں اس کمرے میں کتنا سکون تھا۔ باہر پھیلی ہوئی لا محدود وسعت کتنی بھیانک تھی جیسے موت ہی پھیل کر یہ وسعت بن گئی ہو۔ جب تک سورج سروں پر چمکتا ہے، چاروں طرف ایک گہما گہمی رہتی ہے اور سرگرمی اور دوڑ دھوپ کا چکّر چلتا رہتا ہے اس وقت ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے یہ چکّر کبھی نہیں رُکے گا لیکن شام ہوتے ہی زندگی کی

چکّی کا یہ شور کتنا کم ہو جاتا ہے۔ اور جب درختوں کے سائے ڈھلتے ہیں اور دھرتی پر ایک کاٹنے والی اُداسی اور ٹھنڈک کا غلاف پڑ جاتا ہے۔ تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ اب زندگی پھر نہیں جاگے گی۔ یہ چکّر پھر نہیں چلے گا۔

وہ سوچنے لگا کہ وہ ستّر برس کا ہو گیا ہے اور کسی بھی دن اور کسی بھی لمحے وہ ایک جگمگاتی پرشور دُنیا سے چلا جائے گا۔ اس کے اعضا، تقریباً جواب دے چکے تھے اور دن بھر اپنے مکان کے برآمدے یا لان میں آرام کرسی پر بیٹھنے اور سہ پہر کو اپنی چھڑی کے سہارے ندی تک چلے آنے اور ایک پتھر پر بیٹھنے کے سوا وہ کوئی اور کام کرنے کے قابل نہیں رہا تھا لیکن اس لاچاری کے باوجود اسے موت سے ڈر لگتا تھا وہ موت کو ایک ایسی اتھاہ گہرائی سمجھتا تھا جس میں گر کر وہ ہمیشہ کے لئے نیست و نابود ہو جائے گا۔

نوکر چائے لے آیا اور وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ چائے کی گھونٹوں میں گرمی اور زندگی تھی، اور وہ اس گرمی اور زندگی کو چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ یکایک اُسے ٹھنڈک کا احساس ہوا اور اُس نے مڑ کر دیکھا تو کھڑکی کو کھلا ہوا پایا۔ کھڑکی کے پار موت کی سی خاموشی اور اندھیرا تھا۔ اُس نے نوکر کو کھڑکی بند کرنے اور پردہ ڈالنے کے لئے کہا اور جب کھڑکی بند ہو گئی۔ اور نوکر دروازہ بند کرتا ہوا چلا گیا تو وہ اطمینان سے چائے پینے لگا اور چائے پی کر لیٹ گیا۔ اب اس کے کمرے میں کوئی نہیں آئے گا کیونکہ وہ شام کو کچھ نہیں کھاتا تھا اُس نے لحاف سینے تک اوڑھ لیا۔ اس کے کمرے میں بتی ساری رات جلتی تھی کیونکہ وہ گھپ اندھیرے کو ہی موت کی آمد سمجھتا تھا۔ کچھ دنوں سے تو جب وہ سونے لگتا تو اُسے یہ خیال آتا کہ وہ شاید صبح نہیں جاگے گا اور نیند میں ہی اس کے دل کی حرکت بند ہو جائے گی۔ وہ ہر صبح جاگ کر پہلے اپنے آپ کو ہی محسوس کرتا تھا۔

اگلے روز اٹھ کر اور چائے وغیرہ پی کر وہ معمول کے مطابق اپنی چھڑی لے کر باہر برآمدے میں آ گیا اُس کا بیٹا دفتر جاتا ہوا ہمیشہ کی طرح اُس سے ملنے آیا اور اس کی

طبیعت کے بارے میں پوچھتا ہوا چلا گیا۔ بیٹے کے جاتے ہی اُس کے دل میں اپنے مکان میں پیچھے کی طرف لگے ہوئے امرودوں کے درختوں کو دیکھنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ دراصل درختوں سے زیادہ وہ اُن خرگوشوں کو دیکھنا چاہتا تھا جو اس کے پوتوں منو اور چنو نے پال رکھے تھے وہ اندر گیا اور اس نے اپنی الماری میں سے بسکٹیں نکال کر اپنی جیبوں میں بھر لیں۔ وہ جب کبھی مکان کے پیچھے کی طرف جاتا تھا وہ اپنی جیبیں اسی طرح بسکٹوں سے بھر لیتا تھا کیونکہ اُدھر کھیلتے ہوئے چنو اور منو اپنے بابا کو دیکھتے ہی اس کی ٹانگوں سے چپٹ جاتے اور بسکٹ مانگتے وہ اپنی چھڑی کے سہارے آہستہ آہستہ نیچے اُتر آیا اور پیچھے کی طرف پہنچ کر چنو منو اور اُن کے دوستوں کو بسکٹیں دیتا ہوا امرودوں کے درختوں کے پاس آکر رُک گیا۔

یہ درخت اُسے بہت پسند تھے۔ ایک بڑا درخت تھا جو کچے امرودوں سے لدا پڑا تھا۔ ایک اس سے چھوٹا تھا جس پر ذرا بڑے کئی امرود لگ گئے تھے اور دو تین تو تقریباً پودے ہی تھے جو پچھلے ہی سال لگائے گئے تھے اور ہرے ہرے پتوں سے بھرے ہوئے تھے۔ اس نے بڑے درخت کے نیچے کھڑے ہو کر اپنے بائیں ہاتھ کو آنکھوں پر رکھتے ہوئے اُوپر کی طرف جھانکا۔ اور اُس کے جھانکتے ہی ٹہنیوں پر بیٹھی ہوئی دو تین چڑیاں اڑ گئیں پھر وہ خرگوشوں کی طرف بڑھ گیا۔ یہ خرگوشوں کا جوڑا پچھلے سال مالی نے اس کے لڑکے کو لا کر دیا تھا اور کوئی ایک ماہ کے بعد ہی اُن میں دو ننھے ننھے روئی سے بھی زیادہ سفید اور نرم بچوں کا اضافہ ہو گیا تھا اور اب تو وہ بھی پورے خرگوش تھے۔ اور اُن کے لئے ایک علیحدہ گھر بن گیا تھا وہ خرگوش کے گھر کے سامنے زمین پر بیٹھ گیا اور اندر جھانکنے لگا۔ اس کے بیٹھتے ہی خرگوش دبک کر ایک کونے میں بیٹھ گئے اُس نے جالی کے سوراخوں میں سے دو بسکٹ توڑ کر اندر پھینک دیئے، اور پھر زمین پر سے ہری گھاس کے چند تنکے توڑ کر اندر ڈال دیئے۔

وہ اٹھ گیا اور مکان کی دیوار کے ساتھ ساتھ دھوپ میں چلنے لگا۔ یہ مکان اس نے پچیس برس ہوئے چالیس ہزار روپے کی لاگت سے بنوایا تھا اور دس بارہ کمروں کا ایک شاندار بڑا مکان تھا جس کے چاروں طرف ایک اچھا خاصا باغ تھا اب اس لمبے چوڑے مکان میں جو کبھی اس کے خوابوں کی تعبیر تھا وہ تنہا ایک چھوٹے سے کمرے میں اپنی زندگی کی شام گزار رہا تھا۔ اس کی بیوی پندرہ سال ہوئے چل بسی تھی اور وہ اب اس سفر کے لئے تیار بیٹھا تھا۔ وہ اس دُنیا کی بے ثباتی کے بارے میں سوچنے لگا۔ کیا ایک بھری پری بارونق زندگی کا یہی المناک انجام تھا؟ اس کی تمام زندگی چند سمٹے ہوئے لمحے بن کر اس کے سامنے سے گزر گئی۔ کتنا شوریدہ پن کتنی بھرپور جوانی، کتنی طاقت کتنا آرام، اور سُکھ اس کی زندگی میں رہا تھا اور افسوس کہ وہ سب کچھ اس طرح مٹنے والا اور مٹ کر کبھی نہ بننے والا تھا۔ زندگی کا یہ انجام اور زندگی میں یہ موت کیوں تھی؟

سہ پہر کو تین بجے کھانا کھانے اور کچھ دیر لیٹنے کے بعد وہ اپنا کوٹ پہن کر اور چھڑی لے کر ندی کی طرف چل پڑا۔ آج اُسے کچھ زیادہ تھکاوٹ محسوس ہو رہی تھی۔ شاید اس لئے کہ وہ صبح اُٹھ کر مکان کے پیچھے کی طرف چلا گیا تھا اور کچھ دیر وہاں رہا تھا۔ کمزوری کی اب یہ حالت تھی کہ اگر وہ ذرا سا بھی فالتو چل لیتا تو بڑا تھک جاتا تھا۔ لیکن یہ تھوڑا بہت چلنا ہی تو اس کی زندگی تھی اور وہ اُسے چھوڑنے کے لئے آمادہ نہیں تھا۔ اس کے علاوہ وہ دن کے وقت کمرے کے باہر ندی کے کنارے کھلے آسمان کے نیچے اور سورج کی کرنوں میں زندگی محسوس کرتا تھا اور شام کو اپنے کمرے کے اندر۔ اُسے یہ وسیع دنیا اندھیرے میں ڈوبی ہوئی بڑی خوفناک لگتی تھی۔ وہ ندی پر پہنچ کر دھوپ میں بیٹھ گیا اور سورج کی کرنیں اس کے ناتواں جسم میں گرمی بھرنے لگیں۔ ہوا اور صاف شفاف پانی ایک خوشگوار خنکی کا احساس دے رہا تھا حرارت اور خنکی کا یہ امتزاج زندگی کا کتنا پر مسرت پہلو تھا اور وہ چند لمحوں کے لئے اپنے آپ کو بھول سا گیا۔

مگر جاڑے کی دھوپ بھی زندگی کی مانند کتنی مختصر ہوتی ہے۔ گھنٹے دو گھنٹے میں ہی سُہانی دھوپ کی یہ چادر سمٹ گئی۔ اور ہواؤں میں خنکی سرسرانے لگی۔ وہ اُٹھ گیا کیونکہ درختوں کے سائے سمٹنے لگے تھے اور ایک زندگی ایک موت سے ہمکنار ہونے والی تھی۔ ایک دہکتا ہوا آگ کا گولہ ایک ٹھنڈی نارنجی گیند بن کر ڈوبنے والا تھا اور دھرتی پر ایک ڈسنے والی تاریکی کا غلاف بڑھنے والا تھا وہ گھبرا کر گھر کی طرف بڑھنے لگا۔ نہیں، وہ ڈوبتے ہوئے سورج کو نہیں دیکھے گا؟ پنچے پھیلاتے ہوئے سایوں پر نظر نہیں ڈالے گا۔ وہ بغیر موت کو دیکھے ہوئے اُس زندگی کی طرف لوٹ جائے گا۔ جواب اُس کے کمرے کی چار دیواری میں بجلی کی روشنی میں نمودار ہو جائے گی۔ وہ کانپتے ہوئے قدموں کے ساتھ ہانپتا ہوا گھر پہونچا۔

اس روز اُسے پتہ نہیں لگا کہ کب نیند آگئی یا آئی بھی یا نہیں۔ یہ زندگی کیا تھی اور موت کیوں تھی۔ اس پر وہ بہت دیر تک سوچتا رہا تھا۔ اور جتنا وہ سوچتا رہا تھا اس کا دِل ڈوبتا سا گیا تھا اور اس نے اپنے دِل کو کئی بار کڑا کرنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن پھر بھی اس کی اُداسی دُور نہ ہوئی تھی وہ ایک ایسی بے مقصد لمبی چوڑی زندگی کو جس کا انجام موت تھا ماننے کے لئے تیار نہیں تھا۔ یہ ایک بڑا غیر یقینی اور بھیانک انجام تھا۔

اگلی صبح وہ چائے وغیرہ پی کر باہر برآمدے میں نہیں آیا بلکہ اپنے پلنگ پر لیٹا رہا۔ اُس نے آج اپنے اندر اُٹھنے اور باہر جانے کے لئے کوئی بھی جوش محسوس نہیں کیا دراصل وہ اِس نتیجے پر پہنچا کہ اس کے لئے کوئی بھی سرگرمی جو جینے کیلئے ضروری نہیں ہے بے معنی سی تھی اِس کا بیٹا حسب معمول دفتر جاتے ہوئے اُس سے ملنے کے لئے آیا اور اسے برآمدے میں نہ پاکر تیزی سے اندر آیا۔ باپ کو پلنگ پر لیٹے ہوئے دیکھ کر وہ بالکل اس کے قریب سرہانے کی طرف بیٹھ گیا اور اُس کی طبیعت کے بارے میں پوچھنے لگا۔ اُس نے بتایا کہ وہ بالکل ٹھیک تھا۔ اُس کا بیٹا دو تین منٹ تک بیٹھا رہا اور کچھ کہہ کر اور مُسکرا کر چلا گیا۔

اس کا بیٹا چلا گیا مگر وہ کچھ ٹھٹک کر رہ گیا وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا تھا کہ اس کا بیٹا ہو بہو اس کی تصویر تھا اور جب وہ بھی چالیس سال کا تھا تو بالکل ایسا ہی تھا اور اب جو اس کا بیٹا مسکرایا تھا تو بالکل اُسی کی طرح۔ تو کیا اُس کے بیٹے میں وہ خود موجود تھا۔ اور اس کا بیٹا جو ابھی دفتر گیا تھا تو کیا اُس کی شکل میں وہ خود گیا تھا؟

اس کے ذہن میں ایک کوندا سا لپکا جیسے کوئی نئی روشنی پھوٹنے والی ہو۔ وہ لپک کر اُٹھ بیٹھا۔ اُس نے اپنا کوٹ پہنا۔ چھڑی اٹھائی اور باہر برآمدے میں آگیا پھر وہ نیچے اتر کر پھاٹک کے پاس کھڑا ہو گیا۔ اور باہر کی طرف دیکھ کر مسکرا اٹھا کیوں کہ چند لمحے ہوئے وہ خود چالیس سال کا جوان بن کر اس پھاٹک میں سے نکل کر دفتر گیا تھا!

وہ اپنے کمرے میں آگیا اور اس نے اپنی جیبوں میں بسکٹیں ٹھونس لیں اور پھر باہر نکل کر چنو اور منو کو بسکٹیں دیتا ہوا امرودوں کے درختوں کی طرف ہو لیا اور ان کے تلے چند لمحے کھڑا ہو کر خرگوشوں کے خاموش مگر خوش و خرم کنبے کی طرف بڑھ گیا۔

وہ اس روز کافی خوش تھا اور اُسے تھکاوٹ کا احساس تک نہیں ہوا وہ لوٹ کر اپنے کمرے کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اور اُدھر سے چنو گزرا تو اُس نے اُسے بلا کر پوچھا کہ کیا وہ بابا کے ساتھ ندی پر چلے گا۔ چنو نے جواب میں بابا سے پوچھا کہ کیا اس کی جیبوں میں بسکٹ تھے اور جب اس نے بسکٹ دکھائے اور ایک پہلے ہی دے دیا تو چنو خوشی سے بابا کے ساتھ ہو لیا۔

آج ندی پر بڑی روپہلی اور خوشگوار دھوپ تھی، اور ندی کا پانی چندن کی طرح سفید اور اجلا تھا درختوں کے لمبے سائے، چمکتی دھرتی پر اپنے جسموں کی شکل بنے لہلہا رہے تھے۔ ندی کے اوپر آسمان کی نیلگوں پہنائی میں پرندوں کی کتنی ہی ڈاریں اُڑان میں مصروف تھیں۔ چاروں طرف ایک نہ مٹنے والی زندگی تھی۔ وہ دھوپ میں نیچے بیٹھ گیا تھا اور اس نے چنو کو دو بسکٹ دے کر اپنے پاس ہی کھیلتے رہنے کو کہہ دیا تھا۔

تھوڑی دیر میں چنو اپنے ہاتھ میں گول گول بجریاں اکٹھی کر کے لے آیا

اور جب اس نے اُنہیں نیچے رکھ کر بابا سے آئس کریم کے لئے پیسے مانگے تو وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ چنّو کی شکل بھی اس سے بہت ملتی تھی۔ اور اُس کے کان اور آنکھیں تو بالکل ہی اُس پر تھیں۔ اس کے ذہن میں اُس کا بچپن جھلملا نے لگا اور وہ چنّو کو دیکھ کر مسکرانے لگا۔ تو کیا وہ اپنے بعد اپنے بیٹے کی صورت میں اور پھر اس کے بعد اپنے پوتے کی صورت میں زندہ رہے گا اور کیا زندگی ایک ایسا دائرہ ہے جو کبھی نہیں ٹوٹے گا۔ ؟

اس نے چنّو کو پیسے دیئے اور چنّو آئس کریم لینے دوڑ گیا۔ وہ بے اختیار ہنس پڑا اور نیچے بیٹھ کر چنّو کی بجریوں سے کھیلنے لگا۔ پھر چنّو بابا کی چھڑی لے کر بابا کی طرح چلا تو اس کی خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا۔ وہ دونوں دیر تک ندی پر رہے اور جب درختوں کے سائے سمٹ گئے اور گرمی اور روشنی کو خنکی اور اندھیرے نے نگل لیا تو بھی وہ نہیں گھبرایا۔ اسے اپنے مسئلے اور اپنی پریشانی کا حل مل گیا تھا۔ وہ اطمینان سے سورج کو افق میں کانپتے اور ڈوبتے دیکھتا رہا اور اُسے محسوس ہوا کہ ایک زندگی دوسری زندگی میں پل رہی تھی، موت کا کہیں نام ونشان نہیں تھا اور زندگی کے لاتعداد دائرے ایک دوسرے میں جذب ہو کر مسلسل گردش کر رہے تھے۔

نئی مسکراہٹ

سادھنا کی زندگی گھر میں بالکل کھوکھلی، سونی سونی سی تھی۔ ماں باپ اور تین چھوٹی بہنوں کے باوجود اس کا چھوٹا سا گھر اس کے لئے کوئی دل کشی نہیں رکھتا تھا اور جب سے یہ آریہ نگر کا مکان چھوڑ کر یہاں چلے آئے تھے، ان کی سماجی زندگی بھی تقریباً ختم ہو گئی تھی۔

سادھنا کا باپ ایک ناکارہ مشین بن چکا تھا۔ وہ بوڑھا تو تھا ہی مگر کوئی دس سال ہوئے اس کا دماغ بھی خراب ہو گیا تھا۔ مگر سادھنا کی ماں جیسے بڑھاپے کی دہلیز میں قدم رکھتے رکھتے رک گئی تھی۔ اس کی عمر اب کوئی بیالیس سال کی تھی مگر اس کے چہرے کے خطوط اور خدوخال اس کی عمر کو ظاہر نہیں کرتے تھے۔ اس کی مسکراہٹ، آنکھوں کی چمک، گالوں کی گولائی اور اس کے ہونٹوں میں تازگی کا ایک وقتی لمس بعض مرتبہ اسے بھرپور جوانی کی حدوں کے بہت قریب لے آتا تھا۔ اسے اچھے کپڑے پہننے کا بھی شوق تھا اور وہ کئی مرتبہ سادھنا کی ساڑیاں خود پہن لیتی تھی۔

سادھنا کی زندگی میں ہلچل بہت چھوٹی سی عمر میں ہی مچ گئی تھی۔ وہ مشکل سے چودہ سال کی ہی ہو گی کہ اس کے متعلق، جب وہ آریہ نگر میں رہتے تھے، ایک عجیب سی بات اڑ گئی تھی۔ اس کے بعد تو اس کی زندگی بس ہچکولے کھاتی ہوئی ایک کشتی بن گئی تھی۔ ان طوفانوں اور ہچکولوں نے اسے کئی مرتبہ بیزار بھی کیا تھا۔ مگر زندگی تو جیسے

اپنی راہ خود بناتی ہے، وہ بے بس سی ہو گئی تھی۔ آریہ نگر میں ماں اور بیٹی دونوں بدنام تھیں اور اگرچہ وہ اب آریہ نگر چھوڑ چکے تھے مگر ان کی بدنامی ان کے ساتھ چلی آئی تھی۔ سادھنا کو اپنی ماں کے بارے میں یا ان باتوں کے بارے میں جو اس کی ماں کے متعلق اڑا کرتی تھیں، زیادہ پتہ نہ تھا۔ ہاں وہ جانتی تھی کہ ان میں کچھ نہ کچھ صداقت ہے۔ کیونکہ اس کا باپ تو مدت سے بے کار اور ناکارہ تھا مگر ان کا گزارہ ہمیشہ آسانی سے چلتا رہا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ ان کے گھر میں کتنے ہی جانے اور ان جانے لوگ آتے رہے تھے۔ اس کے باپ کی حالت تو گھر میں پڑی ہوئی بے حس و حرکت آبنوس کی میز یا کونے میں پڑی ہوئی پتھر کی سل سے زیادہ نہیں تھی اور گھر میں مہمانوں کا استقبال، ان سے ہنس ہنس کر باتیں کرنے اور چائے وغیرہ پلانے کی ذمہ داری ماں پر ہی تھی۔ ان کاموں میں سادھنا کی تین کافی چھوٹی بہنیں اپنی ماں کی ایک بے جان سی مدد ضرور کیا کرتی تھیں۔

سادھنا ٹیلیفون ایکسچینج میں آپریٹر تھی۔ یہ اس کی پہلی نوکری نہیں تھی، اس سے پہلے اس نے ایک ملٹری کے دفتر میں ٹائپسٹ کے طور پر بھی کام کیا تھا۔ اس کے بعد وہ نرس بن گئی تھی اور پھر ایک بڑی دکان میں کلرک رہی۔ وہ سترہ سال کی عمر میں ہی نوکر ہو گئی تھی اور اب تئیس سال کی تھی۔ یہ چند سال اس کی زندگی کے بڑے طوفانی سال رہے تھے جن میں اس نے مسرت اور غم دونوں کا احساس قدم قدم پر کیا تھا۔ اُف! ان سالوں کو وہ کس طرح آنکھیں بند کئے عبور کرتی رہی تھی۔ ان میں کتنی تیزی کتنا اندھاپن تھا۔!

اور اب اس ایکسچینج میں وہ جیسے تھک کر، ایک لمبے بے مقصد سفر سے لوٹ کر آ بیٹھی تھی۔ زندگی کی ہماہمی تو یہاں بھی تھی مگر اتنی جوشیلی اور رنگین نہیں اور اس پر ایک بے کیفی اور یکسانیت کا جذبہ رینگ آیا تھا۔ اس ایکسچینج میں اٹھارہ عورتیں اور سات مرد کام کرتے تھے مگر اسے یہ بالکل نمک یا کوئلے کی کان معلوم ہوتی تھی۔ یہ معمولی شکل و صورت کی لڑکیاں اور مرد اسے بالکل جاذب نظر نہ لگے وہ زیادہ زندگی دیکھ چکی تھی، بلندیوں میں پرواز کر چکی تھی اور گہری ہوئی زندگی اسے ایک

احساس برتری دے گئی تھی۔ وہ ایکسچینج کی بیشتر لڑکیوں کی مانند ہلکے اندھیرے رنگ کی تھی مگر وہ ایک خوبصورت متناسب جسم اور چہرے کی مالک تھی۔ وہ اپنے بالوں کو چڑیا کے گھونسلے کی شکل میں بڑے خوشنما انداز سے بناتی تھی۔ اس کے خدوخال میں ایک مسکراہٹ سی چھپی رہتی اور اس کی ستارہ سی کھلی آنکھوں میں بلا کی کشش اور بلاوا تھا۔ وہ بلاشبہ ان لڑکیوں میں سے تھی جنہیں نظریں بار بار مڑ کر دیکھتی ہیں۔ مگر اس ایکسچینج میں اس کا دم سا گھٹتا تھا۔ جیسے وہ زندگی کے ولولے کہیں دور چھوڑ آئی تھی۔ اسے یہ ایکسچینج کسی ایسی بستی کا خاکہ محسوس ہوا جہاں قسم قسم کی لڑکیاں دن رات ایک رذیل سے کھیل کی ملگجی رنگینیوں میں لپٹی رہتی ہوں۔ جہاں زندگی اپنی خاموشی اور نچلی سطح کے باوجود خلط ملط ہوتی رہتی ہو۔

سادھنا کی تنخواہ یوں تو اتنی تھی کہ اس کے گھر کا گزارہ چل ہی جاتا۔ مگر اس کا اپنا خرچ کافی تھا اور اسے اپنی تنخواہ بڑی حقیر لگتی تھی۔ جب وہ نرس تھی یا ملٹری کے دفتر میں نوکر تھی تو وہ روپے گھر بھی بھجوا دیا کرتی تھی۔ اسے ان دنوں اچھی اچھی چیزوں، روپے پیسے، کسی چیز کی بھی کمی نہیں تھی۔ اس کی زندگی میں کتنی ریل پیل تھی اور وہ کتنے کھلے وسیع ماحول میں سانس لیتی تھی۔ مگر وہ دن تو جیسے ماضی کی گہری قبر میں دفن ہو گئے تھے اور آج وہ وسیع ماحول یہاں گھٹ کر کتنا چھوٹا ہو گیا تھا۔

سادھنا کی اس مختصر مگر شوریدہ زندگی کے نشان اب صرف خط و کتابت کے دو سلسلوں کی صورت میں باقی تھے۔ ایک ڈاکٹر چاند کے ساتھ جواب مدراس میں تھا اور دوسرا کیپٹن راکیش کے ساتھ جو اب فوج کی ملازمت چھوڑ کر آسام میں کسی جگہ چائے کی کاشت کر رہا تھا۔ ان خطوط میں اب اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ کیونکہ وہ دونوں بھی رس چوس کر اڑ جانے والے بھنورے ثابت ہوئے تھے۔ جب بھی اسے ان کا کوئی خط ملتا تو وہ سرسری طور پر پڑھ کر اپنے ٹرنک میں ڈال دیتی جو بے شمار تصویروں اور خطوں سے اٹا پڑا تھا۔

وہ عموماً شام کو چھ بجے اپنی پرانی سی سائیکل پر لوٹا کرتی تھی۔ اس وقت اس کی

ماں گھر میں عام طور پر ایک رنگین بیٹی کوٹ اور پھولدار چھوٹی سی کوٹی پہنے، انکل رام پرشاد یا کشور اور یا دونوں کو چائے وغیرہ پلاتی ہوئی ملتی۔ یہ دونوں شام کو اسی وقت بلا ناغہ آتے تھے اور کافی رات گئے واپس جایا کرتے تھے۔ ماں کے لئے رام پرشاد ایک اخبار بھی تھا۔ آریہ نگر کی تمام خبریں جن میں اس کی ماں دلچسپی لیتی تھی، اسے رام پرشاد سے ہی ملتی تھیں۔ کشور اگرچہ سادھنا کی ماں میں دلچسپی لیتا تھا، مگر زیادہ وہ سادھنا کے لئے ہی آتا تھا۔ سادھنا ان دونوں کو پسند نہیں کرتی تھی۔ رام پرشاد کے متعلق وہ صرف اتنا جانتی تھی کہ تقریباً سال بھر سے اس نے اپنی بیوی کو چھوڑ دیا تھا۔ جو بہر حال اس کی بیاہتا بیوی نہیں تھی، مگر ماں اسے سادھنا کا "انکل" بتایا کرتی تھی۔ ایک روز رام پرشاد نے ایک بالکل عجیب بات چھیڑ دی۔

"سادھنا کی کہیں سگائی وغیرہ کی یا نہیں۔؟"

"ہو جائے گی ابھی کیا جلدی ہے۔" سادھنا کی ماں سادھنا کی طرف مسکراتی ہوئی بولی۔ "ابھی تو سادھنا مانتی ہی نہیں۔"

"کیا کہہ رہی ہو۔" رام پرشاد اپنے بھدّے سے دانت نکال کر بولا۔ "اب تو سادھنا کی عمر بھی کافی ہو گئی ہے۔"

"ہائے آپ کو تو کچھ نہیں پتہ، سادھنا تو اگست میں بیس کی ہو گی۔ چالیس کی تو پوری میں بھی ابھی نہیں ہوئی۔"

رام پرشاد کے دل میں یہ سنکر کہ سادھنا کی ماں ابھی چالیس کی بھی نہیں ہوئی، کچھ کھلبلی سی مچ گئی اور اس نے اس کے گداز جسم کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھا۔۔۔ سادھنا اپنے بالوں کو سنوار رہی تھی۔ رام پرشاد نے ایسے ہی پوچھ لیا۔

"سادھنا کیا آج پکچر کا ارادہ ہے۔؟"

سادھنا کسی جواب کے لئے آمادہ نہیں تھی۔ وہ صرف مسکرادی اور آخری مرتبہ آئینے میں جھانک کر باہر نکل گئی۔ باہر جا کر اس نے کہیں جانے کے بارے میں سوچا مگر وہ یہ جان کر بالکل حیران رہ گئی کہ اتنے بڑے شہر میں وہ بالکل تنہا تھی اور لے سکے

پاس جانے کے لئے کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ اسے بے ساختہ اپنی گزشتہ ہنگامہ خیز زندگی یاد آئی اور وہ اپنی ساڑھی کی سامنے کی تہوں کو ٹھیک کرتی ہوئی آریہ نگر کی طرف ہولی۔ وہ آریہ نگر میں چندر کانت سے ملنا چاہتی تھی۔ چندر کانت ایک آرٹسٹ تھا جو ستار بجانے کی وجہ سے آریہ نگر میں کافی مقبول تھا۔ اس نے لمبے لمبے بال بھی رکھے ہوئے تھے جن سے اس پر نا چنے والے کا بھی دھوکہ ہوتا تھا۔ چندر کانت اپنے گھر پر ستار بھی سکھاتا تھا۔ جب سادھنا آریہ نگر میں رہتی تھی تو وہ ایک مرتبہ ایک لڑکی کے ساتھ جو چندر کانت سے ستار سیکھتی تھی اس کے گھر گئی تھی، اور آج وہ کئی سال بعد وہاں جانا چاہتی تھی۔ چندر کانت لڑکیوں میں بہت مقبول تھا اور نہ جانے سادھنا کو کیوں خیال آگیا کہ وہ ستار سیکھنا شروع کر دے تاکہ اس کی اداسی اور تنہائی کچھ تو دور ہو جائے۔

وہ چندر کانت کے گھر پہنچ گئی۔ پہلے دیوار پر ایک چھوٹا سا بورڈ ستار سکھانے والے اسکول کا لگا ہوا تھا، مگر وہ بورڈ اب نہیں تھا۔ اس نے جھجکتے ہوئے دروازے پر پڑی ہوئی چق اٹھائی۔ ایک مدھم سے چراغ کی روشنی میں چندر کانت کا بھائی رما کانت بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے نمستے کی اور رما کانت نے اسے ایک کرسی پر بیٹھنے کے لئے کہا اور آہستہ سے بولا۔

"جب سے تم آریہ نگر سے گئی ہو، آئی نہیں رسنا۔ ماں اور بہنیں تو ٹھیک ہیں۔؟"

سادھنا نے اپنے اور گھر والوں کے بارے میں بتایا۔ پھر اس نے چندر کانت کے بارے میں پوچھا اور اسے یہ جان کر مایوسی ہوئی کہ چندر کانت تو چار مہینے ہوئے آریہ نگر کی ایک عیسائی لڑکی ڈیزی کے ساتھ شادی کر کے بمبئی چلا گیا تھا اور وہیں کچھ کر رہا تھا۔

"اس کی شادی پر بہت جھگڑے ہوئے۔" رما کانت بولا۔ "کوئی ایک مہینہ تو دونوں بھاگ کر میرٹھ رہے۔"

سادھنا سنتی رہی۔ اس نے ڈیزی کا احساس کیا جو کبھی اس کی سہیلی رہی تھی۔ ڈیزی بڑی شریر بلکہ خراب تھی، اور شادی کے متعلق سب کچھ اس وقت جانتی

تھی جب وہ صرف بارہ سال کی تھی۔

سادھنا لوٹ آئی، اس نے اپنی زندگی میں زیادہ بے کیفی کا احساس کیا اس نے اپنے ارد گرد، اپنے ماحول پر نظر ڈالی۔ مگر اسے کوئی بھی ایسی جگہ نظر نہ آئی جہاں وہ پھر پہلے کی سی رنگینی اور دلچسپی ابھار سکے۔ وہ اس احساس کے بوجھل پن سے دبی ہوئی، تھکی ہوئی گھر پہنچی تو اس نے دیکھا کہ رام پرشاد ابھی تک نہیں گیا تھا۔ وہ سیدھی اپنی چارپائی پر جاکر لیٹ گئی۔

ایک روز شام کو وہ ایکسچینج سے لوٹی تو اس نے دیکھا کہ اس کی ماں اس کی گلابی رنگ کی ساڑھی پہنے آنگن میں تیار کھڑی تھی اور رام پرشاد میز پر جھکا ہوا چائے پی رہا تھا۔

" سادھنا" اس کی ماں بولی۔" پکچر چلنا ہے تو فوراً تیار ہو جاؤ، تمہارے انکل کہیں سے پاس لائے ہیں۔"

" ارے کہیں سے کیا کہتی ہو" رام پرشاد بولا۔" وہ ہمارے دہرہ دون والے بہنوئی کا اپنا سینما ہے۔"

سادھنا نے سائیکل رکھی اور چارپائی پر بیٹھ کر سینڈل اتارنے لگی۔ اس نے ماں کی طرف دیکھا اور اپنی مضمحل طبیعت کے باوجود اس نے خوشی کا احساس کیا اس کی ماں نے ہلکی سی لپ اسٹک بھی لگائی ہوئی تھی۔ جو گالوں پر نمایاں پاؤڈر کی تہہ سے کوئی مناسبت نہیں رکھتی تھی۔ بہرحال گلابی ساڑھی سفید بلاؤز اور سفید سینڈل میں اس کی ماں کافی اچھی لگ رہی تھی۔

" چلو گی کیا۔؟" اس کی ماں نے پوچھا۔

" نہیں، میں تو بالکل تھکی ہوئی ہوں۔"

تھوڑی دیر میں رام پرشاد ایک تانگہ لے آیا اور جیسے وہ خود اس گھر کا مالک ہو، اس کی ماں اور اس کی چھوٹی بہنیں اس تانگے میں بھر گئیں اور تانگہ چل پڑا۔ سادھنا اٹھی اور اس نے میز پر رکھا ہوا لیمپ جلایا۔ اس کا باپ چارپائی پر پڑا

اپنے پاگل پن میں کچھ کچھ بول رہا تھا۔

سادھنا کو اپنی ماں کا اس طرح رام پرشاد کے ساتھ جانا بالکل اچھا نہ لگا۔ مگر وہ کیا کر سکتی تھی، اس کی ماں کا یہ رویہ تو پرانا تھا اور اب اس منزل پر وہ اسے کیسے روک سکتی تھی، اور پھر ——— وہ خود۔؟

وہ خود ایک آرام اور آسودگی کی تلاش میں تھی اور اس لحاظ سے اسے اپنی ماں اپنے سے کہیں بہتر نظر آئی اور ایک لمحے کے لئے ایک نفرت کے جذبے کے تحت اس کے دل میں ماں کے لئے ایک نیا جذبہ بیدار ہوا جس میں رشک و حسد دونوں شامل تھے۔ وہ پھر آنگن میں جا کر بیٹھ گئی اور ایمپلائمنٹ ایکسچینج سے لائے ہوئے آج کے اخبار میں اشتہاروں کو دیکھنے لگی۔ وہ پھر سے کسی زیادہ کھلی دنیا میں جانا چاہتی تھی۔ وہ اپنی ملازمت میں ایک تبدیلی کی خواہاں تھی مگر اسے کوئی بھی ایسا اشتہار نظر نہیں آیا جو اس کے کام کا ہو۔ اس نے اخبار ایک طرف رکھ دیا۔ میز پر رکھا ہوا کھانا کھایا اور تھکاوٹ کے احساس سے دب کر پھر آنگن میں لیٹ گئی۔

وہ لیٹ تو گئی لیکن آنکھوں میں نیند کہاں۔؟ اس نے اپنے ذہن میں ایک لاوا سا ابلتا ہوا محسوس کیا جیسے اس کے سارے بدن میں چنگاریاں سی لگ رہی ہوں، جیسے وہ کسی آگ میں جھلس رہی ہو۔ اس نے اپنے اور اپنی ماں کے حالات پر غور کیا مگر اسے کہیں بھی، کوئی امید کی کرن نظر نہیں آئی۔ کافی رات گئے جب اس کی ماں رام پرشاد اور بچوں کے ساتھ سینما سے لوٹی، تب بھی وہ کروٹ لئے یونہی پڑی تھی اور نیند اس سے کوسوں دور تھی۔

"سادھنا تو سوئی پڑی ہے۔" ماں نے گھستے ہی کہا۔

"ہاں۔" رام پرشاد آنگن میں پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھتا ہوا بولا۔ "سادھنا کے چہرے پر وہ اب پہلی سی رونق نہیں رہی، کچھ سوچتی سی رہتی ہے۔"

"دراصل۔" سادھنا کی ماں بولی۔ "اس کی ایک آرمی آفیسر سے محبت تھی مگر وہ دھوکے باز نکلا۔ جب سے بیچاری کچھ اداس رہتی ہے۔"

سادھنا یہ سنکر بالکل حیران رہ گئی، کیونکہ ایسی کوئی بات دراصل نہیں ہوئی تھی اور ماں کو تو کچھ بھی نہیں پتہ تھا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ اٹھ کر ماں کا منہ نوچ لے، مگر وہ چپ چاپ پڑی رہی۔

اگلے روز وہ اٹھی تو اس نے ذہنی تھکاوٹ اور بے چینی کے علاوہ جسمانی تھکاوٹ کا احساس بھی کیا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ آج کام پر نہیں جائے گی۔ اس نے جلدی سے چائے پی اور تھوڑی دیر بعد نہانے چلی گئی۔ جب وہ نہا کر تیار ہوئی تو اس نے اپنے آپ کو کافی بہتر محسوس کیا۔ آج کا دن وہ اپنے طور پر اپنی سوچ میں بسر کرے گی اور کچھ گھومے گی بھی، اس احساس سے اسے بڑا اطمینان ہوا۔ اس نے اپنا ٹرنک کریدا اور کتنی ہی تصویروں کو دیکھ دیکھ کر پھر رکھ دیا۔ اس نے اپنے چند پرانے خطوں کو پڑھا اور وہ ایک سوچ میں ڈوب گئی۔ وہ اٹھی اور اپنا پیڈ نکال کر ڈاکٹر چاند کو خط لکھنے لگی۔ مگر اس نے چند سطریں ہی لکھی تھیں کہ اس پر ایک بھاری جذبہ رینگ آیا، اور اسے ایسا معلوم ہوا کہ وہ ایک غیر فطری سا کام کر رہی ہے۔ ڈاکٹر چاند تو ایک بھولی بسری کہانی تھا اور اب ان چٹھیوں سے کیا فائدہ۔!

وہ اٹھی اور آئینے میں اپنا چہرہ دیکھنے لگی۔ اس کے گالوں پر تعطل اور بیزاری کا ہلکا سا سایہ تھا۔ وہ ایک کونے میں پڑی ہوئی چارپائی پر لیٹ گئی اور چھت کو گھورنے لگی۔ اس کے ذہن میں ایکسچینج میں کام کرنے والے کئی لڑکے ابھرے جو اس کی طرف نگاہ رکھے ہوئے تھے۔ رام ناتھ سپروائزر — نہیں، وہ تو بالکل نکما تھا، اور وہ اس کی موٹی اور جھکی ہوئی ناک کو ہرگز برداشت نہیں کر سکے گی۔ پریم — ہاں وہ خوبصورت ضرور ہے، اگر خوب صورتی میں رنگ کی کوئی وقعت نہ تھی اور وہ سانولی سہی مگر پریم جتنی کالی تو نہ تھی۔!

اس نے کروٹ لی اور چاہا کہ سوچنے کا یہ سلسلہ بند ہو جائے، مگر اس کے دل میں ایک ہیجان سا پیدا ہوا، اور اس کے تصورات کا دھارا نہیں رکا — بٹو، رام داس، سنگھا اور — اور وہ کشور پر رک گئی۔ اسے شروع میں کشور، پتہ نہیں کیوں پسند نہ آیا تھا

شاید اس لئے کہ اس کا کام اسے پسند نہیں تھا، یا شاید اس لئے کہ وہ رام پرشاد کے ساتھ آتا تھا اور رام پرشاد سے وہ نفرت کرتی تھی۔ مگر اس نے اب سنجیدہ ہو کر سوچا کشور ایک مضبوط جسم کا خوبرو نوجوان تھا، جو اس کی طرف مائل تھا، اور وہ اپنی زندگی کی خلا کو پُر کرنا چاہتی تھی۔

کشور کا چہرہ، اس کے مضبوط بازو، اس کی نظروں کے سامنے گھومنے لگے۔ اس کا سکون اس کے کتنا قریب تھا۔ اس کے ہونٹ ایک چھوٹی سی مسکراہٹ میں پھیل گئے۔ اس کی ذہنی تھکاوٹ اور بوجھل پن جیسے ٹوٹ کر گر پڑا۔ اس نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھا، اور آج شام کے اپنے رویئے پر غور کرنے لگی۔ وہ کشور کی طرف دیکھ کر کیسے مسکرائے گی، اس سے کیسے بات کرے گی، باہر ملنے کی کیسے کوشش کرے گی اور سب کچھ کیسے ہو جائے گا، اس نے تھوڑی ہی دیر میں سب کچھ سوچ لیا۔

شام کے پانچ بج گئے تھے اور کشور کے آنے کا وقت قریب تھا۔ سادھنا نے اٹھ کر آنگن میں جھانکا۔ دھوپ کا آنچل آنگن سے سمٹ کر منڈیر پر پڑ چکا تھا۔ اُس نے منہ ہاتھ دھویا، تولئے سے پونچھا اور میز پر آ بیٹھی۔ پاؤڈر کی ہلکی سی صاف تہوں میں اس نے گالوں کی تھکاوٹ کو جذب ہوتے ہوئے دیکھا۔ پھر اس نے بالوں کو سنوارا، اور آخر میں ہونٹوں پر احتیاط سے ذرا گہری لپ اسٹک لگائی اور آئینے میں ایک پرکھنے والی نظر ڈالی۔

وہ بے حد خوبصورت لگ رہی تھی۔ اس کے دل نے ایک جھرجھری سی لی، اور پھر وہ اپنی بہترین ساڑھی نکالنے کے لئے ٹرنک پر جھک گئی۔ وہ ساڑھی پہن کر تیار ہوئی تو ماں بھی اس کی طرف دیکھ کر مسکرا دی، اور عین اس وقت دروازے میں کشور داخل ہوا۔

آج وہ اکیلا تھا اور سادھنا کو دیکھ کر ٹھٹھک کر رہ گیا۔ اسے سادھنا بڑی دلکش لگی اور سادھنا کے ہونٹوں پر ایک نئی دلفریب مُسکراہٹ دیکھ کر تو وہ بالکل کھو سا گیا اور اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی جب چند ہی لمحوں بعد اسے چائے کا پیالہ خود سادھنا نے پیش کیا!

گھاٹے کا سودا

یوں تو لالہ گھاسی رام نے سامنے کے چوبارے میں رہنے والی سندھی لڑکی رجنی للوانی کو بارہا بنتے سنورتے، اتراتے، مٹکتے اور ایک تتلی کی طرح اپنی چھت پر پھدکتے اور گلی میں آتے جاتے دیکھا تھا اور رام کا نام لیا تھا مگر ان کے یہ وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ ان کے اکلوتے بیٹے پرکاش پر ڈورے ڈال رہی تھی۔ وہ تو اگر پرکاش کی ماں چٹھی لکھنے کے لئے لالہ جی سے کاغذ نہ مانگتی اور لالہ جی پرکاش کے کمرے میں ہی آکر اس کی حساب کی کاپی میں سے ایک صفحہ نہ پھاڑتے تو یہ راز شاید کبھی فاش نہ ہوتا۔ جب انہوں نے کاغذ پھاڑنے کے لئے کاپی اٹھائی تو پاس ہی رکھی ہوئی پرکاش کے ہاتھ کی اپنے دوست انوپ کے نام چٹھی نظر آئی جو پرکاش شاید دکان جاتا ہوا لے جانا بھول گیا تھا۔ لالہ جی نے چٹھی اٹھائی اور پڑھنی شروع کر دی۔ جوں جوں وہ اسے پڑھ رہے تھے، چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا دوسرا جا رہا تھا۔ چٹھی یہ تھی۔

"پیارے دوست انوپ، تم اس روز کرید کرید کر پوچھتے رہے کہ میں اداس کیوں رہتا ہوں اور میں شرم کے مارے جواب نہ دے سکا لیکن پھر سوچا کہ دوست سے کیا چھپانا۔ پیارے انوپ تمہارا خیال درست تھا اور مجھے واقعی محبت ہو گئی ہے۔ کوئی سال بھر سے

ہمارے سامنے کے مکان میں ایک سندھی کنبہ ٹھہرا ہوا ہے۔ ان کے یہاں ایک لڑکی رجنی ہے جس نے میرا دل چرا لیا ہے۔ انوپ تم اسے دیکھو گے تو میری پسند کی داد دو گے لڑکی کیا ہے بس پری ہے، پتلی دبلی اور چھوٹی سی، شکل و صورت بڑی موہنی آنکھوں میں عجیب مستی اور کشش۔ وہ وہ فیشن کرتی ہے کہ دیکھتے رہ جاؤ۔ عام طور پر بہت کسی ہوئی شلوار اور قمیض پہنتی ہے۔ چند دن ہوئے اس نے میرے دکان جاتے ہوئے اوپر سے اپنا خوشبو میں بسا ہوا رومال پھینک دیا بس اس دن سے زیادہ بے قرار ہو گیا ہوں اور ہر وقت اس کے رومال کو سینے سے لگائے رکھتا ہوں۔

سچ مانو انوپ میں تو دیوانہ ہو گیا ہوں دکان پر پہنچتا ہوں مگر کام میں جی نہیں لگتا۔ رجنی کی تصویر ہر وقت آنکھوں کے سامنے گھومتی رہتی ہے۔ اتنا کھویا کھویا رہتا ہوں کہ کل ایک گاہک نے چودہ کیرٹ کا ہار مانگا مگر میں نے اسے اکیس کیرٹ کا ہار چودہ کیرٹ کے دام لگا کر دیدیا۔ وہ تو کچھ پرماتما کا کرنا ایسا ہوا کہ پیسے میری بجائے منیم جی نے لے لئے اور انہوں نے غلطی پکڑ لی ورنہ نقصان ہو جاتا۔ رات بھر نیند نہیں آتی اور دل میں میٹھا میٹھا درد ہوتا رہتا ہے۔ اب تو اس کے بغیر ایک ایک دن گزرنا مشکل ہو رہا ہے۔ تم کچھ دن یہاں ٹھہر سکتے تو جی لگ گیا تھا۔

تمہارا دوست

پرکاش "

لالہ گھاسی رام کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ ان کے خاندان میں کبھی کسی نے عشق نہیں کیا تھا اور یہ پرکاش جو مشکل سے اکیس سال کا ہو گا، خاندان کو برباد کرنے پر تل گیا تھا اور پھر کمبخت نے عشق بھی کیا تو سندھی لڑکی سے، نہ ذات نہ برادری۔ پھر کہاں لالہ گھاسی رام مشہور جوہری، لاکھوں کے مالک، صرافے بازار

میں ہی کم ازکم دس دکانیں اور مکان ان کے اپنے تھے اور اب ان کا لڑکا عشق میں پڑکر اس دولت اور جائداد کو آگ لگائے گا۔ لیکن نہیں، لالہ گھاسی رام سے زیادہ ہوشیار کون ہوگا۔ زمانے کی اونچ نیچ ان کی آنکھوں کی پتلیوں میں سمائی ہوئی تھی۔ ایک ہاتھ سے دھوتی کو سنبھال کر اور دوسرے میں کاپی کا کاغذ اور پرکاش کی چٹھی لے کر پرکاش کی ماں کے پاس پہنچے اور اس کے سامنے بیٹھ کر بولے۔

"کچھ اپنے پرکاش کی کرتوت کا بھی پتہ ہے۔"

"کیوں کیا ہوا۔؟" وہ گھبرا کر بولی۔

"سامنے کی سندھی لڑکی سے عشق کر رہا ہے۔ بس اب یہ زمین جائداد سمجھ لو ختم ہوئی۔ اس کا عشق اتنے زوروں پر ہے کہ اسے چودہ کیرٹ اور اکیس کیرٹ کے سونے میں بھی فرق نظر نہیں آتا اور کل منیم جی دکان پر نہ ہوتے تو پانچ سو کا ہار تین سو میں چلا گیا ہوتا۔"

"ہائے رام۔" پرکاش کی ماں ماتھے پر ہاتھ رکھ کر سوچ میں ڈوب کر بولی "تمہیں یہ سب کیسے پتہ لگا۔"

"یہ چٹھی اس کی الماری میں ملی ہے۔ الوپ کو لکھ رہا ہے کہ جب سے رجنی کو دیکھا ہے دل میں میٹھا میٹھا درد ہوتا رہتا ہے۔"

"اب کیا ہوگا بھگوان۔"

"ہوگا کچھ نہیں۔" لالہ گھاسی رام اٹھتے ہوئے بولے۔

"اگر پرکاش یہ سپنے دیکھ رہا ہے کہ وہ رجنی سے بیاہ کرلے گا تو یہ میرے جیتے جی نہیں ہوگا۔ اپنی ناک کو بازار اور برادری میں نہیں کٹنے دوں گا۔ اس کا بیاہ ہوگا تو کسی اپنے برابر کے لالہ کی لڑکی سے ورنہ اسے گھر سے نکال دوں گا۔ بنتی کی شادی میں جو میرا ڈیڑھ لاکھ روپیہ لگا تھا وہ اس کی شادی سے پورا کرنا ہے۔ میں مورکھ نہیں ہوں۔"

اس پر پرکاش کی ماں گھبرا کر بولی۔

"میری مانو تو پرکاش سے لڑنا جھگڑنا نہ۔ اس سے بات پھیلے گی اور لڑکے کے ہاتھ سے چلے جانے کا ڈر ہے۔ تم اتنے ہوشیار ہو کوئی ہوشیاری کر کے اس سنکٹ کو ٹالو۔"

اپنی تعریف سنکر لالہ گھاسی رام کے ہوش کچھ ٹھکانے آئے۔ دکان پر جانے کی بجائے اوپر کے کمرے میں چلے گئے اور سارے مسئلے پر بڑے ٹھنڈے دل سے غور کیا۔ غور کرنے کے بعد یہ چٹھی اپنے بڑے بھائی سیٹھ چوراسی رام کو ہاپڑ ڈال دی۔

"بھائی صاحب جے رام جیکی۔

پرکاش اب اکیسواں سال پورا کر رہا ہے میں سوچ رہا ہوں اب اس کی شادی کر ہی دینی چاہیئے۔ کوئی چار مہینے ہوئے آپ کے بازار کے سیٹھ منالال نے اپنی لڑکی کے لئے لکھا تھا۔ وہ شادی میں بچاس ہزار خرچ کرنا چاہتے تھے مگر چونکہ یہ رقم میری حیثیت کے مطابق نہیں تھی میں نے کل ملا کر ایک لاکھ کے لئے لکھ دیا تھا جس میں سے تیس ہزار نقد لگن میں دینا تھا، تیس ہزار کے زیورات اور باقی شادی کے دیگر اخراجات۔ ان کا جواب نہیں آیا۔ آپ ذرا ان سے بات کر کے دیکھیں اور مجھے جلدی لکھیں۔

سنا ہے سیٹھ بھاگ مل گھی والے بھی اپنی لڑکی کے لئے رشتہ ڈھونڈ رہے ہیں، ان سے بھی بات کرلیں۔ وہ تکڑی اسامی ہیں ان کی لڑکی شاید موٹی اور پکے رنگ کی ہے مگر یہ کوئی نقص نہیں ہے۔ اگر وہاں معاملہ طے ہو جائے تو ٹھیک رہے گا۔ شادی میں اسی دسمبر میں کرنا چاہتا ہوں آپ جلدی بات کر کے جواب دیدیں

آپ کا بھائی

گھاسی رام"

یہ ایک ہفتہ لالہ گھاسی رام نے بڑی بیتابی سے گزارا۔ سوموار کو جواب آگیا۔ لکھا تھا۔

" جے جے رام،

آپ کی چھٹی ملی، آپ نے دیر کردی۔ سیٹھ منالال کی لڑکی شادی پچھلے ہی مہینے علی گڑھ کے لالہ سورن چند صراف کے لڑکے سے ہوگئی۔
سیٹھ بھاگ مل سے پوری بات ہوگئی ہے وہ رشتے کے لئے تیار ہیں اور شادی میں سوا لاکھ خرچ کریں گے۔ مگر لڑکی کے مہین مہین چیچک کے داغ ہیں، اگر لکھو تو پکی کرلوں۔

چوراسی رام "

لالہ گھاسی رام نے اس چٹھی کا ذکر صرف پرکاش کی ماں اور اپنے دوست لالہ گھنشیام داس سے کیا۔ مگر پرکاش کی ماں اور لالہ گھنشیام داس دونوں ہی نہیں مانے۔ ان کا خیال تھا کہ چونکہ پرکاش کی نظروں میں رجنی جیسی مہ لقا بسی ہوئی تھی کہیں ایسا نہ ہو کہ پرکاش شادی کے بعد لڑکی کو چھوڑ دے یا شادی سے پہلے ہی کوئی ایسا ویسا فیصلہ کرلے۔ لالہ گھاسی رام نے پہلے تو اتفاق نہیں کیا مگر پرکاش کی ماں سے زیادہ صلاح کرنے پر مان گئے کہ اس رشتے میں خطرہ ہے۔

مراد آباد بھی ایک جگہ بات چیت ہوئی اور وہاں سے لڑکی کی فوٹو بھی آگئی۔ انہوں نے شادی میں اکیانوے ہزار روپیہ خرچ کرنے کا وعدہ کیا تھا جس میں ایک کار بھی شامل تھی۔ فوٹو سب کو پسند آگئی مگر جب پرکاش کی ماں نے فوٹو پرکاش کو دکھائی تو وہ کر بولا۔

" اماں یہ بھی بھلا کوئی فوٹو ہے۔ دیکھ تو یہ لڑکی کتنی موٹی ہے اور یہ ناک ہے یا پکوڑا۔"

" میرے لال اپنے بنیوں میں تو ایسی ہی لڑکیاں ملے ہیں اور پھر موٹر بھی تو دے رہے ہیں۔"

" موٹر تو میں لالہ جی سے لوں گا۔ سبھوں نے کار لے لی اور یہ سب سے بڑے ہو کر بھی نہیں لیتے۔"

" بیٹا ڈرہیں ہیں کہ کہیں ٹکرا و کرا نہ جائے ۔"

" نہیں اماں ایسی کوئی بات نہیں اور ہم نے تو ڈرائیور رکھنا ہے اور میں خود بھی سیکھ لوں گا ۔"

" تو تجھے یہ لڑکی پسند نہیں ۔" پرکاش کی ماں نے فوٹو اٹھاتے ہوئے پوچھا۔

" بالکل نہیں ۔"

" تو اپنی پسند بھی تو بتا دے ۔"

" اماں آجکل ایک سے ایک لڑکی ہے ۔ دیکھ رجنی کتنی اچھی ہے اور اپنے نیم جی کی لڑکی آشا وہ بھی سندر ہے لالہ جی تو بس پیسہ دیکھ رہے ہیں ۔"

" لیکن رجنی تو ۔۔۔۔۔۔"

اور اتنے میں لالہ گھاسی رام آگئے اور یہ بات یہیں ختم ہوگئی اور پرکاش دکان پر چلا گیا ۔ لالہ جی نے رجنی کا لفظ سُن لیا تھا ، غصّے میں بولے ۔

" تو اب یہ رجنی کے بارے میں کھلم کھلا بات کر رہا ہے ۔"

" تم ذرا دھیرج سے کام لو ۔" پرکاش کی ماں بولی ۔" برابر کا جوان بیٹا ہے غلطی کی تو ساری عمر پچھتاؤ گے ۔"

" تو پرکاش کی ماں ایک بات تو صاف ہے کہ اس کا بیاہ رجنی سے نہیں ہوگا ، کبھی نہیں ہوگا ۔ اچھا اس فوٹو کے بارے میں کیا خیال ہے اس کا ۔"

" اسے تو پسند نہیں اور مجھے بھی کوئی خاص اچھی نہیں لگی ۔"

" تو ماں بیٹا مل کر اپنے آپ ڈھونڈ لو لڑکی ۔ اس لڑکے کے تو دن خراب آگئے ہیں ۔ ایک ایک لاکھ کی شادی ہاتھ سے جا رہی ہے ۔"

اتنے میں ہی رسوئیے نے ایک چٹھی لا کر لالہ جی کے ہاتھ میں تھما دی کہ ڈاکیہ ابھی دے گیا ہے ۔ یہ چٹھی پرکاش کے نام تھی اور بلند شہر کی مہر دیکھ کر لالہ جی سمجھ گئے کہ انوپ کی ہے ۔ انہوں نے چٹھی کھول لی ۔ اندر صرف ایک کورا کاغذ نکلا ۔ لالہ جی نے اسے الٹ پلٹ کر دیکھا اور پھر مسکرا کر بولے ۔

" ذرا ایک موم بتی جلاؤ، یہ کل کے لونڈے مجھے کیا چلائیں گے۔ ابھی چٹھی پڑھ لیتا ہوں۔"

" پرکاش کی ماں کی سمجھ میں کچھ نہ آیا مگر وہ موم بتی جلا کر لے آئی۔ لالہ جی نے کاغذ کو موم بتی کی لو کے اوپر گھمایا تو یہ حروف روشن ہو گئے۔

" پیارے دوست پرکاش!

تمہاری خفیہ چٹھی ملی۔ تمہاری حالت زار پڑھ کر بڑا افسوس ہوا۔ تو اب تمہاری یہ حالت ہو گئی ہے کہ دن بھر روتے ہو اور راتوں کو جاگتے ہو مگر یہ جان کر اطمینان ہوا کہ رجنی بھی تمہیں دل وجان سے چاہتی ہے تم نے جو لکھا ہے کہ وہ تمہارے ساتھ بھاگنے تک کو تیار ہے تو یہ قدم سوچ سمجھ کر اٹھانا۔ ویسے تم بھی سچے ہو کیونکہ تمہاری محبت کے راستے میں رکاوٹیں ڈالی جارہی ہیں۔ خیر میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں جو چاہے کرو۔

تمہارا جگری دوست

الوپ"

یہ چٹھی پڑھ کر لالہ گھاسی رام اور پرکاش کی ماں کے ہوش اڑ گئے مگر اس موقع پر پرکاش کی ماں نے زیادہ سمجھداری کا ثبوت دیا۔ اس نے رسوئیے کو آواز دیکر چائے بنانے اور بازار سے گرم گرم جلیبی اور سموسے لانے کو کہا جب وہ دونوں جلیبی اور سموسے کھا رہے تھے تو پرکاش کی ماں ہنس کر بولی۔

" کیوں جی تم نے بھی عشق کیا ہے کیا جو یہ پتہ لگا لیا کہ چٹھی موم سے لکھی ہوئی ہے؟"

لالہ جی ہنس پڑے اور بولے۔

" گھاسی رام نے عشق نہیں کیا تو کیا ہوا عقل تو رکھتا ہے۔"

" دیکھنا جی میں تو یہ کہہ رہی ہوں کہ تم چھورے کا رشتہ جلدی سے کرو، اس چٹھی سے تو میں بڑی گھبرا گئی

" اب میں کیا کر سکتا ہوں ۔" لالہ جی بولے ۔" تمہیں کسی کو کوئی لڑکی پسند ہی نہیں آتی ۔"

" میں بتاؤں جی ۔" پرکاش کی ماں نے کہا ۔ " اپنے منیم جی کی لڑکی آشا کیسی رہے گی ۔"

" تمہارا کچھ دماغ خراب ہو گیا ہے ۔" لالہ جی سٹپٹا کر بولے ۔" اب ہم نوکروں چاکروں سے رشتہ کرنے لگیں ۔ منیم جی کی میرے مقابلے میں کیا حیثیت ہے ۔ بہت خرچ کر دیں گے دس پندرہ ہزار کر دیں گے ۔ کیا برادری میں ناک کٹواؤ گی ۔"

" میں تو اس لئے کہہ رہی ہوں کہ منیم جی کی لڑکی سُندر ہے ، دوسرے برادری کی لڑکی ہے ۔ پھر منیم جی تو خود نوکری چھوڑ کر اپنی دکان کرنے کو کہہ رہے ہیں ۔ اب یہ دیکھو گے یا اپنے گھر کو برباد ہونے سے بچاؤ گے ۔"

" نہیں نہیں مجھے یہ رشتہ منظور نہیں ۔"

یہ کہہ کر لالہ گھاسی رام اٹھ گئے اور سیدھے دکان چلے گئے ۔ جب تک دکان پر بیٹھے رہے اس مسئلے پر سوچتے رہے ۔ جب غصہ کم ہوا تو پرکاش کی ماں کی باتوں میں وزن نظر آیا ۔ منیم جی کی لڑکی گوری چٹی اور سُندر بھی اور دسویں پاس ۔ مگر جو بات رہ رہ کر کھٹک رہی تھی وہ یہ تھی کہ کل جو ان کا منیم تھا وہ ان کا سمدھی ہو جائے گا ۔ بازار میں بدنامی ہو گی کہ کتنا بڑا لالہ اور رشتہ کہاں کیا ۔ دوسرے لاکھ سوا لاکھ کے جہیز کو چھوڑ کر چند ہزار کی معمولی شادی قبول کرنی پڑے گی ۔ مگر اس کے برعکس الوپ کی چٹھی بار بار نظروں کے سامنے گھوم کر ایک ایسے خطرے کا اعلان کر رہی تھی جس میں ساری ہی لٹیا ڈوب جائے گی ۔

دکان بند کر کے لالہ گھاسی رام اپنے دوست لالہ گھنشیام داس کے پاس پہنچے اور سارا ماجرا سُنایا ۔ انہوں نے صلاح دی کہ بیٹا بھاگ گیا تو کہیں کے نہ رہو گے ، فوراً شادی کی زنجیر میں باندھ دو اور وہ بھی ایک ہفتہ کے ۔ . . اندر اور ان حالات میں منیم جی کی لڑکی ہی ٹھیک رہے گی ۔ فیصلہ ہوا کہ لالہ گھنشیام داس ابھی منیم جی کو بلوا کر بات کر لیں گے اور ایک ہفتے بعد ہی کی تاریخ رکھوا کر کل شادی

کے کارڈ چھپوا کر بنٹوا دیئے جائیں گے۔ لالہ گھاسی رام نے جاکر یہ فیصلہ پرکاش کی ماں کو سنایا تو وہ بولی۔

"سنو جی گاڑی کتنے میں آئے گی"؟

"گاڑی؟ کیا موٹر کو کہہ رہی ہو"

"جی۔"

"موٹر آجکل بیس ہزار میں ملتی ہے۔ لالہ چھجو مل اپنی نو مہینے پہلے خریدی ہوئی نئی موٹر ساڑھے سترہ ہزار میں دے رہے ہیں۔ مگر موٹر تو اس کمبخت نے کھودی، مفت میں مل جاتی۔"

"تو اپنے پاس کونسی کمی ہے۔ آپ لالہ چھجو مل سے کل گاڑی خرید لیں۔ میں ساڑھے سترہ ہزار اپنے پاس سے دیدوں گی اور یہ گاڑی ہماری طرف سے پرکاش کو بیاہ کا تحفہ ہوگا۔"

"تو میرے اور تمہارے روپے دو ہیں کیا۔ کل موٹر آجائے گی مگر ایک ٹکر کھائے رہا ہی ہے۔"

"کیا؟"

"یہ کمبخت شادی سے پہلے ہی رجنی کے ساتھ بھاگ گیا تو۔"

"بھگوان پر بھروسہ رکھو، مجھے امید نہیں وہ ایسا کرے گا۔"

"بھاگوان یہ دیکھ لے پورے لاکھ کا نقصان ہو رہا ہے، تیرے بیٹے کے عشق کی وجہ سے۔" لالہ جی آہ بھر کر بولے۔

شادی کی تاریخ صرف پانچ دن کے بعد نکل آئی۔ اُدھر منیم جی حیران ہو گئے کہ پرماتما نے یہ کیا چمتکار دکھایا کارڈ بنٹے اور پوری تیاریاں شروع ہو گئیں۔ پرکاش کو دکان پر جانے کی ممانعت کردی گئی۔ گھر پر پرکاش رشتے داروں کے درمیان گھرا رہنے لگا اور سب کو یہ ہدایت مل گئی کہ پرکاش کو باہر نہ جانے دیا جائے اور اگر اسے جانا پڑے تو چار آدمی اس کے ساتھ جائیں اور ساتھ واپس لائیں۔

یہ احتیاط کامیاب ثابت ہوئی۔

خوب دھوم دھام سے بارات گئی اور اگلے دن صبح واپس آگئی۔ شام کو لالہ جی کی طرف سے سارے بازار کی دعوت ہوئی۔ لوگ کھا پی رہے تھے اور لالہ گھاسی رام کی دریا دلی کا ذکر کر رہے تھے۔ ایک کونے میں لالہ جی شاداں و فرحاں کھڑے اپنے دوست گھنشیام داس سے شیخی بگھار رہے تھے۔

" لالہ گھنشیام داس اسے کہتے ہیں شیخی کے تین کانے۔ آخر میرا نام بھی لالہ گھاسی رام ہے، وہ پھانسا ہے کہ بھول گیا اپنے عشق اور رجنی کو۔" لالہ جی نے اتنا کہا ہی تھا کہ رسوئیا آ پہنچا اور بولا۔

" لالہ جی ابھی آیا۔ دوپہر کو چھوٹے لالہ نے یہ چٹھیاں ڈاک میں ڈالنے کو دی تھیں مگر کام میں ہوش نہ رہا۔"

" کیسی چٹھیاں ہیں، دکھاؤ ادھر۔" لالہ جی بولے۔

گھاسی رام نے چٹھیاں دیکھیں تو ایک چٹھی انوپ کے نام دیکھ کر چونکنے ہو گئے۔ رسوئیے کے سامنے ہی کھول کر پڑھی، لکھا تھا۔

" پیارے انوپ،

بھئی تم شادی میں نہیں آسکے اس کا دلی افسوس رہا۔ تمہارا شکریہ کس زبان سے ادا کروں۔ تمہاری ترکیب بالکل کارگر ثابت ہوئی اور میں نے رجنی کے ساتھ فرضی عشق کا ڈھونگ رچا کر اپنی پیاری آشا کو پالیا، جسے میں دل و جان سے چاہتا تھا۔ لالہ جی میری شادی کبھی آشا سے نہ کرتے کیونکہ وہ ایک یتیم کی لڑکی تھی۔ یہ راز راز ہی رہے گا اور تم بھی جب آؤ تو اس کا ذکر نہ کرنا ورنہ لالہ جی کو شادی میں ایک لاکھ روپے کے جہیز کا نقصان رہ رہ کر تڑپایگا تمہاری مہربانی کو نہ بھول سکوں گا۔ اپنی من پسند شادی بھی ہو گئی اور لالہ جی سے کار بھی لے لی۔ آؤ گے تو کار میں خوب گھماؤں گا۔

تمہارا جگری دوست

پرکاش"

اور یہ چیٹھی پڑھتے ہی لالہ گھانسی رام پر غشی سی طاری ہوگئی۔ لالہ گھنشیام داس نے گرتے ہوئے کو سنبھالا اور لوگ پانی اور عرق گلاب لینے کے لئے دوڑے پانی چھڑکتے ہی لالہ جی کو ہوش آگیا مگر بڑبڑا کر بولے۔

" پرکاش کی ماں .. .. .. اتنا گھاٹے کا سودا زندگی میں کبھی نہیں کیا..

.. .. اُف اتنا نقصان۔"

اے جذبۂ دل

موہن چند کے حلیئے، وضع قطع اور لباس کو دیکھ کر یہ اندازہ لگانا مشکل تھا
کہ وہ کیا کام کرتا تھا اور کتنا پڑھا لکھا تھا جب تک کہ کوئی زیادہ پڑھا لکھا آدمی اس سے
کچھ دیر بات نہ کر لے اور اس کی ٹوٹی پھوٹی غلط انگریزی سے یہ جان نہ جائے کہ موہن چند
صرف آٹھ نو جماعت تک پڑھا ہوگا۔ وہ عام طور پر ایک رنگین قمیض، سفید پتلون
اور سفید یا کالے رنگ کے نکیلے جوتے پہنتا تھا اور آنکھوں پر سیاہ چشمہ تقریباً
لگائے رہتا تھا۔ اس کی عمر اب اٹھائیس انتیس برس کی ہوگی مگر وہ نوکری یا کام
پندرہ سال کی عمر سے کر رہا تھا، جب اس نے نویں میں فیل ہو کر پڑھنا چھوڑ دیا
تھا۔ اس کے بعد اس نے کئی کام سیکھے اور کئے۔ اس نے اچھا کھایا پیا اور پہرا
تھا۔ کبھی کبھی وہ کافی کما لیتا تھا اور بعض دفعہ کچھ عرصہ تک بیکار رہتا تھا مگر چونکہ اس کی
کوئی ذمہ داری نہیں تھی اس لیئے وہ مالی طور پر کوئی خاص تنگ نہ رہا۔ اس کے پاس
قسطوں میں خریدی ہوئی ایک نئی سائیکل بھی تھی اور اس کے کوٹھڑی نما کمرے میں سامان
کچھ اس قسم کا تھا کہ اس کے ساتھیوں کو اس کے خوشحال ہونے کا شبہ ہو سکتا
تھا۔ آج کل وہ سائیکل کے پرزوں کی ایک تھوک دکان پر ایک سو چالیس روپے
ماہیتے پر ملازم تھا۔

موہن چند کے بال اکثر خشک، گھنے اور الجھے ہوئے ہوتے جیسے کسی
فن کار کے ہوں مگر اس کے چہرے پر زرد پیلی مخمور آنکھیں اس کی گزشتہ ٹیڑھی
میڑھی زندگی کی غمازی کرتی تھیں۔ شام کو کام پر سے آتے ہی وہ ایک ٹین کی کرسی نکال
کر باہر چبوترے پر بیٹھ جاتا۔ سڑک کے کنارے پر ایک بڑے چوبارے کے نیچے

اس کا چھوٹا سا کمرہ اتنا تنگ تھا کہ گرمی میں اس میں بیٹھنا بھی مشکل ہو جاتا۔ وہ آتے ہی پہلے اپنی کرسی نکالتا اور پھر کمرے میں سے اپنا آئینہ اور کنگھا لا کر چلتی سڑک اور سامنے کی دکانوں سے بالکل بیگانہ ہو کر اپنے بال بناتا جو تیل نہ ہونے کے سبب اور الجھ جاتے۔ اس کے بعد وہ اندر رکھے ہوئے لوٹے کے پانی سے منہ ہاتھ دھو کر تولیے سے اپنے گالوں کو خوب رگڑتا اور پھر دیر تک آئینے میں پلٹ پلٹ کر اس طرح گھورتا جیسے بڑا حسین و جمیل ہو۔ پھر وہ ایک دو آہیں سی بھرتا، کمرے کو تالا لگاتا اور اپنی چمکیلی سائیکل پر باہر گھومنے نکل جاتا۔

اس مکان کی بائیں طرف اسی لان میں ایک دھوبی کا ایک مکان تھا جو اپنے میلے کپڑے بڑے بڑے ڈھیروں کی صورت میں تقریباً ہر وقت پھیلائے رکھتا۔ وہ اپنے کپڑے اسی دھوبی سے دھلواتا تھا۔ اس فیصلے میں وہ زیادہ متاثر دھوبی کے مکان کی قربت یا اس کی اچھی دھلائی سے نہیں ہوا تھا بلکہ اس کی سالونی سلونی جوان دھوبن سے جو شربتی رنگ کی بڑی بڑی آنکھوں والی ایک خوبصورت عورت تھی جسے دیکھ کر اسے بڑی بے چینی کا احساس ہوتا تھا۔

مول چندیوں تو اپنی زندگی سے مطمئن تھا، لیکن جس خلا کا بعض اوقات اسے بڑی شدومد سے احساس ہوتا تھا وہ اس کی زندگی میں عورت کی کمی تھی۔ وہ جب نوجوان جوڑوں کو گھومتے دیکھتا، چاہے وہ شادی شدہ ہیں یا غیر شادی شدہ، تو اس کے دل میں ایک ہوک سی اٹھتی تھی اور ایسا اتنی مرتبہ ہوتا تھا کہ وہ اب جس لڑکی کو دیکھتا اسے حاصل کرنے کی آرزو کرنے لگتا اور اپنے تصور میں ہی وہ اس لڑکی کو اپنی سائیکل کے ڈنڈے پر بٹھا کر بھگا لے جاتا۔ یہ بات تو نہیں تھی کہ لڑکیاں اس کی زندگی میں نہیں آئی تھیں۔ وہ اب تک بڑی سنجیدگی اور شدت سے کم سے کم چار لڑکیوں سے محبت کر چکا تھا لیکن کوئی نہ کوئی ایسی بات ہو گئی تھی کہ ان میں سے کوئی بھی ہمیشہ کے لئے اس کی نہ بن سکی، اور اب تو دراصل وہ کسی ایسی لڑکی کی تلاش میں تھا جو اس کے ساتھ پہلے عشق اور پھر شادی کر سکے، چاہے یہ عشق کتنا بھی مختصر کیوں نہ ہو، اور جب تک کوئی

ایسا حادثہ نہ ہو جائے تو وہ تاک جھانک سے نظروں کی سیرابی کے سوا اور بھی کیا سکتا تھا۔

اسے کنوارا ہونے کے سبب بڑی مشکل سے یہ کمرہ ملا تھا اور وہ بھی اس لئے کہ دراصل یہ ایک دکان تھی۔ اپنی عادت کے مطابق اس نے اِدھر اُدھر کافی جستجو کی تھی لیکن اسے کوئی دلچسپی نظر نہیں آئی تھی اور جب وہ ناامیدی کی لہر میں تقریباً ڈوبنے لگا تھا تو ایک دن جب وہ اپنی پتلون پر استری کرانے کے لئے اس دھوبی کے یہاں گیا تھا تو اس کی دھوبن پر نظر پڑ گئی تھی جس نے آنکھوں کے علاوہ اپنے جسم کے انگ انگ سے اسے تقریباً ڈس لیا تھا۔ لیکن مول چند کوشش کے باوجود اس دلچسپی کو آگے نہ بڑھا سکا، اور اس کی ناگن کو شاید پتہ بھی نہیں لگا کہ اس نے انجانے میں کس کو ڈس لیا تھا۔ شام کو جب وہ کام سے لوٹتا تو دھوبی بھی آچکا ہوتا اور کسی روز اس کی چھٹی ہوتی تو دونوں گھاٹ گئے ہوئے ہوتے۔ صبح یا شام کپڑے دینے اور لینے آتا تو دھوبی مُول چند نے سوچا کہ دراصل یہ کمرہ بھی ٹھیک نہیں ہے اور اسے کوئی اچھا سا کمرہ کسی گلی میں یا پھر اوپر کی منزل میں لینا چاہیئے تھا۔

اس کے کمرے کے سامنے نئی کالونی کی سلسلے وار عمارتیں تھیں۔ یہ دراصل رہائشی کالونی تھی۔ لیکن چونکہ اس سڑک پر دور تک بازار سا بن گیا تھا اِس لئے ادھر بھی دکانیں کھل گئی تھیں۔ سڑک کے پار، اس کے بالمقابل، ایک ہیر کٹنگ سیلون تھا اور برابر میں درزیوں کی تین چار دکانیں تھیں۔ یہ دکانیں عام طور پر ان کمروں میں کھلی تھیں جو ان مکانوں کی بیٹھکیں تھیں۔ اس کالونی کے بارے میں یہ خیال عام تھا کہ اس کی لڑکیاں بڑی خوبصورت، چنچل اور نٹ کھٹ تھیں۔ جب سے یہ دکانیں بن گئی تھیں، انہوں نے اس کالونی کی حقیقی رونق کو بڑا چھپا لیا تھا، سب کچھ ہی تو اوٹ میں آ گیا تھا، سوائے سامنے درزیوں کی دکانوں میں لٹکے ہوئے فراکوں، قمیصوں اور شلواروں کے۔

حجام کی دکان پر ایک روز بال کٹواتے ہوئے مول چند کی ایک مسٹر پورن سے ملاقات ہو گئی۔ پورن گندمی رنگ اور ادھیڑ عمر کا آدمی تھا جس کے کپڑوں اور ٹوٹی ہوئی عینک سے اس کی خستہ حالی صاف ظاہر تھی۔ وہ بڑھتی ہوئی قیمتوں کا ذکر کرتے کرتے ایک دوسرے کے بارے میں پوچھنے لگے اور مول چند نے پورن کو اشارے سے بتایا کہ وہ سامنے ہی کے کمرے میں رہتا ہے اور نیشنل سائیکل مارٹ میں کام کرتا ہے۔ اس پر پورن نے اسے بتایا کہ وہ بھی اسی نئی کالونی میں تیسری گلی میں کونے کے مکان میں رہتا ہے۔ وہ پچھلے سال سے بیکار تھا اور اس نے مول چند سے درخواست کی کہ اگر اس کی کمپنی میں اس کے لائق کوئی کام ہو تو دھیان رکھے۔ پورن کا حلیہ دلچسپی سے بالکل خالی تھا لیکن اپنے بالوں کو کنگھی سے الجھا تا ہوا اور آئینے میں دیکھتا ہوا مول چند اپنے ذہن میں پورن کے بیچھے کچھ ٹٹولنے لگا۔ اس کے گھر، رشتے داروں لڑکوں اور دوسال لڑکیوں کے بارے میں!

اسی شام کو پورن مول چند کے کمرے میں آیا اور اس نے اپنے متعلق کچھ اور باتیں بتائیں۔ وہ انگریزوں کے زمانے میں بڑے بڑے افسروں کا بیرا رہا تھا اور اس نے بڑی زندگی دیکھی تھی اور بڑی عیش کی تھی۔ اس نے بجلی کا کام بھی سیکھا تھا، مگر اونچے درجے کی بیرے گری کے بعد اسے مستری کا کام نہ بھایا۔ مگر بچّوں کی ذمہ داری سر پر تھی اور اسے یہ کام بھی کرنا پڑا تھا۔ اس نے کسی ٹیلر ماسٹر کے ساتھ مل کر ایک درزی کی دکان بھی کھولی تھی مگر اس میں وہ ٹیلر ماسٹر ہی دغا دے گیا تھا۔ آج کل وہ بیکار تھا اور اس نے مول چند پر زور دیا کہ اسے کوئی کام ضرور دلوائے۔ آج پورن اپنی عمر، بیکاری اور خستہ حالی کے باوجود کافی دلچسپ آدمی نظر آیا اور مُول چند نے اس کے لئے برابر کی دکان سے چائے اور بسکٹ منگوائے۔ مُول چند نے باتوں باتوں میں پورن سے اپنی ایک اچھے کمرے کی ضرورت کا بھی ذکر کر دیا۔ اور پورن نے اس بارے میں جلد ہی کچھ کرنے کا وعدہ کیا۔

ایک روز شام کو بارہ تیرہ سال کا ایک لڑکا مول چند کے پاس آیا اور بولا کہ

میرے پاپا نے اُردو کا اخبار مانگا ہے ۔ یہ پورن کا لڑکا منّا تھا، اور مول چند نے منّا کو بٹھا لیا اور اس کے لئے بھی چائے منگوائی ۔ منّا چائے پی چکا تو مولچند نے اسے اخبار پکڑا دیا اور اس سے پوچھ لیا کہ اس کے کتنے بھائی بہن اور ہیں اور کتنے کتنے بڑے ہیں ۔ منّا چلا گیا تو اس کے دل میں چھپے ہوئے کسی جذبے نے پھر کروٹ لی اور وہ تصور میں ہی پھر کچھ ٹٹولنے اور محسوس کرنے لگا ۔ اور ایک مرتبہ پھر اس کی زندگی میں دلچسپی پیدا ہونے لگی ۔

ایک دن پورن نے منّا کو بھیج کر اس سے دس روپے ادھار منگولئے اور مول چند نے فوراً دیدیئے ۔ اس سے اگلے ہی روز شام کو پورن اس کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ آپ کو کوئی عذر نہ ہو تو آپ میرے مکان میں ہی میرے ساتھ رہیئے ۔ اس نے مول چند کو بتایا کہ اس کا مکان کافی بڑا ہے اور اسے ایک الگ کمرہ مل جائے گا ۔ مکان میں بجلی بھی تھی اور نل بھی ۔ مول چند اتنی جلدی ان سب باتوں کے لئے تیار نہیں تھا، ساتھ ہی وہ آگے بڑھنا بھی چاہتا تھا ۔ اس نے پورن کا شکریہ ادا کیا اور جھجکتے ہوئے پوچھا کہ اس کے جانے سے ان لوگوں کو کچھ تکلیف تو نہیں ہوگی ۔ اس پر پورن نے دو دلوں کے مل جانے کی بات کی اور اسے اطمینان دلایا کہ وہ سب محبت کے بھوکے ہیں ۔ اس پر مول چند بول اٹھا ۔

" یہ بات آپ نے لاجواب کہی ۔ جب سے ماں مری ہے پیار نہیں ملا ۔ میرا تو اب کوئی نہیں ہے مگر آپ تو خوش قسمت ہیں ۔"

اگلے روز مول چند کی چھٹی تھی ۔ کوئی نو بجے منّا اسے بلانے آگیا ۔ یہ طے ہو گیا تھا کہ وہ کل آکر مکان دیکھ لے گا ۔ اس نے انجانے طور پر کافی تیاری کی تھی ۔ وہ اپنے دل میں ایک عجیب سی تھرک محسوس کر رہا تھا جیسے نئی کالونی کی نظروں سے اوجھل زندگی اس کے سامنے کھلنے والی ہو ۔ اس نے منّا کو دیکھا اور اس کے تصور میں ایک نسوانی چہرہ بنا اور تحلیل ہو گیا ۔ !

مول چند نے اپنے بہترین کپڑے پہنے، چہرے پر کریم ملی اور آئینے میں

ایک کامیاب آدمی کی مانند دیکھا۔ گہرے نیلے رنگ کا ریشمی رومال ہاتھ میں لیکر وہ منا کے ساتھ ہو لیا۔ گلی میں گزرتے ہوئے اس کی طبیعت بہت خوش ہوئی۔ اس لمبی گلی میں اس نے کتنے ہی کھلے ہوئے گھروں میں جھانکا اور ان چہروں کو دیکھ کر محظوظ ہوا جنہیں باہر کی دکانوں نے اپنی اوٹ میں لے لیا تھا۔ گھر کے دروازے پر پہنچتے ہی منا دوڑ کر اندر گیا اور ایک دوسرا دروازہ چار ہی کھل گیا۔ مول چند اندر داخل ہوا تو پورن نے اس سے ہاتھ ملا کر اسے بید کی ایک کرسی پیش کی۔ پورن خود پاس پڑی ہوئی ایک چارپائی پر بیٹھ گیا۔ یہ ایک اچھا بڑا کمرہ تھا جس میں دو الماریاں بھی بنی ہوئی تھیں۔ ایک کھلی ہوئی الماری میں کچھ برتن پیالے پڑے ہوئے تھے۔ اندر جانے والے دروازے میں ایک میلی سی مہین ساڑی کا پردہ ٹنگا ہوا تھا۔ پورن اندر جاکر چائے کی ٹرے اٹھا لایا اور چائے بنا کر بولا۔

" بھئی دیکھو لو، یہ مکان ہے۔ آج کل تو ڈیڑھ سو دو سو میں بھی نہیں مل سکتا۔ میرے پاس تیئیس چوبیس برس سے ہے جب سے کالونی بنی تھی صرف سترہ روپے پر ہے۔ تمہارے لئے یہی کمرہ خالی کر دوں گا۔ ویسے اس میں تم جو سامان استعمال کرنا چاہو وہ یہیں پڑا رہے گا۔ چائے پی لو تو اندر بھی دکھا دیتا ہوں۔"

" آپ کی وائف ہے؟ " مول چند نے یہ سوال جو اسے بہت پہلے پوچھ لینا چاہیے تھا، اب پوچھا۔

" نہیں، وہ سات سال ہوئے جب منا پانچ چھ سال کا تھا گزر گئی تھی۔"

" تو بچوں کے کھانے دانے کا۔۔؟ "

" میری بڑی لڑکی ہے رادھا اور وہ بڑی ہوشیار ہے اور گھر کا سارا کام سنبھالے ہوئے ہے۔ میرے پاس بس یہ دو بچے ہیں۔ رادھا سے چھوٹی لڑکی مراد آباد میں اپنے انکل کے پاس ہے۔"

چائے پینے کے بعد وہ اندر گئے۔ اندر ایک کمرہ اور تھا۔ آنگن کافی کھلا تھا اور اس میں امرود کا ایک پیڑ تھا۔ اس پیڑ کے نیچے ایک چارپائی پر رادھا بیٹھی کچھ

بُن رہی تھی۔ رادھا مول چند کو دیکھتے ہی اٹھ گئی اور اس نے مُسکرا کر نمستے کی۔ مول چند نے بھی جواب میں مُسکرا کر نمستے کی۔ رادھا پتلے دُبلے بدن، ہنستے ہوئے چہرے اور لمبی ٹانگوں کی ایک دلکش لڑکی تھی، جو اگر لڑکی نہ ہوتی تو شاید ہرنی ہوتی۔ اس کی قدرے وحشی آنکھوں میں ایک خاموش بلاوا تھا۔ اس کا رنگ اس قسم کا سانولا تھا جو دیکھنے والے کو گورے رنگ سے کہیں زیادہ مدہوش کر دیتا ہے، اور گورے رنگ کی مدہوشی تو شاید کبھی نہ کبھی اتر جاتی ہے مگر اس سانولے کا کاٹا ہوا جاگ جاگ کر پھر سو جاتا ہے۔ رادھا نے کئی مرتبہ کنکھیوں سے مول چند کی طرف دیکھا اور مول چند اندر ہی اندر تڑپ سا گیا۔ وہ اسی تڑپ کی جستجو میں تھا اور اسے فوراً ہی احساس ہوا کہ وہ شاید اپنی منزل پر پہنچ گیا ہے اور اس گھر میں وہ گھنیری چھاؤں مل سکتی ہے جہاں وہ بیٹھ کر تمام عمر سستا سکتا ہے۔ اس نے ایک مرتبہ پھر رادھا کی طرف دیکھا اور اس مرتبہ اس نے اس کی مُسکراہٹ اور گالوں سے ایک تناسب پیدا کرتی ہوئی اور چوکڑی سی بھرتی ہوئی نشیلی آنکھوں کی حرکت سے اپنے دل میں ایک تڑپ کے علاوہ ایک سکون سا بھی محسوس کیا۔

پورن اور مول چند بیٹھک میں واپس آ گئے۔ پورن بولا۔

" اور کھانے کا یہ ہے کہ اگر ہم لوگوں سے کوئی پرہیز نہ ہو تو یہیں انتظام ہو سکتا ہے، ورنہ آپ کی خوشی ہے چاہے ہوٹل ہی کا انتظام رکھو۔"

" بھلا آپ سے پرہیز کیسا۔" مول چند بولا۔" لیکن آپ لوگوں کو ناحق تکلیف ہی ہو گی۔"

" ارے کونسا دس بیس آدمیوں کا کھانا ہے اور رادھا کے ہاتھ کا کھانا کھاؤ گے تو ہوٹلوں کو بھول جاؤ گے۔"

مول چند جواب میں صرف مُسکرا دیا۔ قدرے وقفے کے بعد اس نے پوچھا۔

" تو جتنا کرایہ آپ کہیں میں دیدوں۔"

" کبھی کرنے لگے نہ غیروں والی بات۔" پورن بولا۔" تم اپنا سامان لے آؤ

اور اس کو اپنا گھر سمجھو۔ چھوڑو اس کوٹھری کو اور تمہارے پاس سامان ہی ایسا کونسا ہے منّا کو لے جاؤ کچھ یہ اٹھالائے گا اور رادھا ابھی اس کمرے سے فالتو چیزیں نکال کر اسے صاف کر دے گی۔"

مُول چند باہر آیا تو اسے ایسا محسوس ہوا کہ وہ زمین پر نہیں بلکہ کسی پہاڑ کی چوٹی پر تھا۔ اس نے ایک بڑی فتح کا احساس کیا اور اس کے قدموں میں پر لگ گئے۔ پیچھے پیچھے منّا بھی دوڑتا ہوا آگیا۔ اس نے ایک میز کرسی خود اٹھائی اور ایک تپائی منّا کو پکڑا دی۔ مگر پھر کچھ سوچ کر اس نے یہ چیزیں نیچے رکھ دیں اور منّا سے بھی تپائی لے لی۔ اس نے باہر بیٹھے ہوئے موچی کے لڑکے کو آواز دی اور اس کے ہاتھ میں ایک روپیہ دیتے ہوئے بولا۔ "یہ چارپائی، یہ میز کرسی اور یہ چھوٹی چھوٹی چیزیں اس کے ساتھ جاکر سامنے کی گلی میں چھوڑ آ، دو چکر میں سب چلی جائیں گی۔"

اور جب مُول چند کا سامان جاچکا تھا اور وہ تالہ لگا کر مالک مکان کو مکان خالی کرنے کی خبر دینے اور اسے اپنا تالہ لگانے کے لئے کہنے کو جانے کی سوچ رہا تھا تو خلاف اُمید دھوبن آج خود اس کے کپڑے لیکر چلی آئی وہ کمرے میں اندر تک آکر اس کے بالمقابل کھڑی ہوگئی۔ مول چند نے پہلی دفعہ محسوس کیا کہ دھوبن اتنی مضبوط اور گٹھی ہوئی تھی جیسے اناج کی ٹھسا ٹھس بھری ہوئی بوری ہو جسے زور سے زمین پر گرا دینے میں مزا آتا ہے۔ لیکن مول چند کے دل میں کوئی ہلچل پیدا نہ ہوئی۔ اس کی نظروں میں رادھا کی مُسکراہٹ کا جادو سما گیا تھا۔ وہ اپنی منزل پر پہنچ چکا تھا اور اب اسے منزل کے اتنے پاس کسی پڑاؤ کی ضرورت نہیں تھی۔ اس نے جیب میں سے پیسے نکالے اور نیچی نظر کرکے دھوبن کو دیدیئے، اور دھوبن حیران تھی کہ آج مُول چند اتنا بدلا ہوا کیوں تھا۔ اور اسی حیرانی میں وہ یہ پوچھے بغیر ہی باہر نکل آئی کہ وہ مکان خالی کرکے کہاں جا رہا تھا اور آئندہ وہ کپڑے لینے آئے یا نہیں۔

قسمت والی

جب سرنا گاؤں کے مولوی نثار احمد کی نوجوان لڑکی نوری کے لئے ماسٹر فقیر محمد اور ان کے گھر کی عورتوں کی معرفت ان کے بھتیجے سلیم کا پیغام پہنچا تو مولوی نثار احمد اور ان کی بیوی نے فوراً ہاں کردی۔ سلیم میرٹھ میں چاندی اور نکل پالش کے ایک کارخانے میں کاریگر تھا اور اُسے ساڑھے تین سو روپے ملتے تھے۔ سلیم میرٹھ سے کبھی کبھی اپنے چچا ماسٹر فقیر محمد کے یہاں آجاتا تھا وہ گاؤں والوں کا دیکھا بھالا تھا۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اُس کی ایک دو دفعہ نظر نوری پر پڑ گئی تھی اور وہ اُس کی جسمانی کشش پر مرتا تھا۔ سلیم چھ جماعت تک پڑھا ہوا تھا مگر کاریگر تھا اور اپنے پاؤں پر کھڑا تھا۔ مولوی نثار احمد نے اپنی بیٹی نوری کو بڑی شفقت اور توجہ سے پالا تھا۔ وہ اُردو اور عربی بخوبی پڑھ لیتی تھی اور قرآن حفظ کر رہی تھی۔ وہ انیس سال کی، سانولے رنگ کی ایک معصوم تندرست اور ہوشیار لڑکی تھی جو اپنی امڈتی ہوئی نوجوانی اور بے پناہ جسمانی کشش سے قطعی ناواقف تھی۔ سلیم کی عمر کے بارے میں ٹھیک علم تو کسی کو بھی نہیں تھا مگر ماسٹر فقیر محمد نے اندازے سے اُس کی عمر تیس سے کم بتائی تھی۔ وہ لمبا تھا اور دیکھنے میں نوجوان ہی لگتا تھا۔ مولوی نثار احمد کی غربت اور سلیم کی نوکری

کو دیکھتے ہوئے مولوی صاحب کے رشتہ داروں اور دوسرے گاؤں والوں کا کہنا تھا کہ نوری قسمت والی ہے جو اُسے شہر کا رہنے والا اتنا اچھا لڑکا مل گیا تھا!

دو مہینے میں ہی نوری کی شادی ہو گئی۔ مولوی نثار احمد نے اپنی بساط اور طاقت سے بڑھ کر اپنی بیٹی کی شادی کی تھی اور گھر کے روزمرہ کے استعمال کا تقریباً سارا ہی سامان نوری کو دیا تھا۔ بارات رخصت ہو کر پہلے بیل گاڑیوں سے مظفر نگر پہنچی اور وہاں سے بذریعہ بس میرٹھ۔ سلیم کے والدین تو اس کے بچپن میں ہی فوت ہو گئے تھے اور اس کی شادی میرٹھ میں اس کے رشتے کی ایک خالہ کے گھر سے ہوئی تھی۔ نوری دلہن بنی پہلے اسی خالہ کے گھر پہنچی تھی اور تقریباً ایک ہفتے وہاں رہی تھی۔ اُس کے بعد سلیم اسے اپنے مکان میں لے آیا تھا۔ یہ مکان، جو اُس کے کارخانے سے زیادہ دُور نہیں تھا، اس نے شادی سے ایک مہینے پہلے ہی پچاس روپے ماہوار کرائے پر لیا تھا۔

سلیم کا مکان بیگم پُل کے پاس ایک تنگ اور تاریک گلی میں تھا اور اس میں نئی نویلی دُلہن نوری جس کے ہاتھوں اور پاؤں کی مہندی بھی ابھی نہیں چھُٹی تھی اپنے شوہر سلیم کے ساتھ ایک رکشا میں سوار ہو کر پہنچ گئی تھی۔ اس سے ایک دن پہلے جہیز میں ملا ہوا سامان اور برتن سلیم ایک تانگے میں رکھ کر اُس مکان میں چھوڑ گیا تھا۔ اس گھر میں نوری کا استقبال کسی ساس، بھابی اور نند نے نہیں کیا تھا۔ نوری کو اچانک خیال آیا کہ وہ اس معاملے میں بڑی بدقسمت نکلی مگر یہ خیال فوراً ہی اس نے اپنے ذہن سے جھٹک دیا۔ خدا کا شکر ہے کہ اُس کا شوہر اس کے ساتھ تھا اور یہ گھر اس کا اپنا گھر تھا۔ رکشا میں سوار جب وہ اور سلیم گلی میں گھسے تھے تو کئی گھروں میں ٹاٹ کے پردوں کے پیچھے سے کئی عورتوں نے نوری کو عروسی لباس میں دیکھ لیا تھا اور کچھ بچے تو ان کے ساتھ ہی دوڑتے دوڑتے دروازے تک پہنچ گئے تھے۔ نوری سمٹی سمٹائی اندر گھسی اور بچے بھی اندر آ گئے۔ یہ ایک کمرے کا آنگن دار کچا پکا مکان تھا جس میں ایک

چھوٹی سی رسوئی اور اینٹوں کا بنا ہوا بغیر چھت کا عارضی غسل خانہ بھی تھا۔ بجلی تھی مگر میونسپلٹی کے نل کی بجائے، جس کا نوری کو کوئی احساس نہیں تھا، آنگن میں ہاتھ سے چلانے والا نل تھا۔ نوری نے پہلے اسی نل کو چلایا اور جب اُس میں سے ٹھنڈے پانی کی ایک موٹی دھار نیچے گری تو وہ بچوں کی طرح کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

جب گلی کے بچے اُسے اچھی طرح دیکھ کر چلے گئے، تو نوری نے کپڑے بدلے اور جھاڑو دے کر سارا گھر دھو ڈالا۔ اُس کے بعد جب فرش سوکھ گیا تو اس نے قرینے سے گھر کی ساری چیزیں لگا دیں۔ کوئی دو تین گھنٹے میں ہی سارا گھر صاف ستھرا اور اُجلا اُجلا لگنے لگا جیسے یہ دونوں کئی برسوں سے اس میں رہتے تھے۔ سلیم آدھ گھنٹہ ٹھہر کر کام پر چلا گیا تھا اور وہ بالکل تنہا اس گھر میں تھی۔ یہ پہلا موقع تھا جب وہ اپنے گاؤں اور گھر سے باہر ایک اجنبی شہر اور غیر مانوس ماحول میں اس طرح تنہا تھی۔ وہ اب تھک کر نیچے فرش پر بیٹھ گئی تھی اور ایسے میں اسے بے ساختہ ابّا اور امّی یاد آ گئے اور وہ اپنا سر گھٹنوں میں دبا کر دھیرے دھیرے رونے لگی۔ چند منٹ میں سنبھل گئی اور پھر اٹھ کر اور آنگن میں پہنچ کر گھر کا جائزہ لینے لگی۔

نوری نے صبح مکان میں گھستے ہی دیکھ لیا تھا کہ سلیم کے پاس کوئی اثاثہ یا سامان نہیں تھا۔ صرف دو چار پائیاں جن میں سے ایک ٹوٹی پھوٹی اور ایک نئی جو سلیم کل ہی خرید کر ڈال گیا تھا، ایک پانی سے بھرا ہوا مٹکا جسے بھی کل ہی خریدا گیا تھا، ایک لوہے کی زنگ آلود کرسی اور ایک المونیم کا پچکا ہوا میلا سا لوٹا، یہی اس کا سارا اثاثہ تھا۔ ایک کنوارے آدمی کا، جس کا کوئی گھر بار نہیں تھا اور اثاثہ ہو بھی کیا سکتا تھا۔ مگر نوری تو روزمرّہ کے استعمال کا ضروری سامان ساتھ لے آئی تھی اور جب سلیم شام کو کام پر سے آ کر آٹا، لکڑی، دال اور مصالحے لے آیا تو یہ گھر بس گیا تھا اور نوری کے سپنے ایک پیاری سی شکل میں ڈھلنے لگے تھے۔

مگر نوری کے سپنوں کا محل ایک کچّا گھروندا یا ایک ریت کی دیوار ثابت

ہوا۔ اس گھر میں اس نے مشکل سے ایک یا دو راتیں گزاری ہوں گی کہ اسے پتہ لگ گیا کہ سلیم شراب پیتا تھا اور یہ جان کر وہ بڑی خوف زدہ ہو گئی تھی۔ جس روز وہ پہلی دفعہ شراب پی کر گھر آیا تو اُس کا دوست اکرم اُسے گھر تک چھوڑنے آیا تھا۔ مگر اکرم خود شراب پیئے ہوئے تھا اور اس نے نوری کو چھیڑنے کی کوشش بھی کی تھی مگر نوری کا طمانچہ کھاتے ہی باہر نکل گیا تھا۔ سلیم بہت زیادہ پیئے ہوئے تھا اور چارپائی پر گرتے ہی سو گیا تھا۔ نوری رات کے بارہ بجے تک اُس کی اور اپنی روٹی لیے اس کے پاس بیٹھی اور روتی رہی۔ آج وہ بہت دہشت زدہ تھی اور ڈر کے مارے وہ لیٹ بھی نہ سکی، نہ ہی اس نے بتی بجھائی۔ اسے شراب اور شرابیوں سے سخت نفرت تھی۔ جب کوئی رات کے دو بجے سلیم کو ہوش آیا اور اس نے اٹھ کر نوری سے وقت پوچھا اور پانی مانگا تو نوری بولی۔

" میں نہیں جانتی تھی کہ تم شراب پیتے ہو۔ کیا تم نہیں جانتے کہ شراب مسلمانوں کے لئے حرام ہے۔"

" تو کس زمانے کی بات کر رہی ہے"۔ سلیم نے نوری کو گھور کر دیکھتے ہوئے کہا: " شراب آج کل کون نہیں پیتا۔ ارے غم غلط کرنے کے لئے آدمی اور کیا کرے؟"

" رو تو سکتا ہے اور تمہیں کون سا غم ہے۔ دو دن تو تمہاری شادی کو بھی نہیں ہوئے۔"

" تُو نے روٹی نہیں کھائی ہے تو کھالے اور سو جا۔ تُو نہیں سمجھے گی۔"

یہ کہہ کر سلیم پھر لیٹ گیا اور خراٹے لینے لگا۔ نوری نے روٹی اٹھا کر رکھ دی اور بتی بجھا کر لیٹ گئی مگر وہ سو نہ سکی۔ اس نے تہیہ کر لیا کہ وہ حالات کا خود مقابلہ کرے گی اور سلیم کو شراب نہیں پینے دے گی چاہے اس کے لئے اسے کتنی بھی سختی اور مصیبت کیوں نہ جھیلنی پڑے۔ اگلے روز جب سلیم اپنی روٹی کی پوٹلی اور بیڑی کا بنڈل اٹھا کر کام پر جانے لگا، تو نوری نے اسے

صاف کہہ دیا۔

" ایک بات سن لو تمہیں شراب چھوڑنی پڑے گی اور اگر آج کے بعد شراب پی کر آئے تو میں دروازہ نہیں کھولوں گی اور گلی والے تماشہ دیکھیں گے۔"

اور واقعی اس کے چار پانچ روز بعد جب سلیم دیر سے گھر لوٹا اور نوری نے پہلے کھڑکی کھول کر دیکھ لیا کہ سلیم نے اتنی شراب پی رکھی تھی کہ اس کے لئے کھڑا ہونا مشکل ہو رہا تھا تو اس نے دروازہ نہیں کھولا۔ سلیم نے بہت دروازہ پیٹا، لاتیں ماریں اور نوری کو گندی گالیاں دیں، مگر نوری ٹس سے مس نہیں ہوئی۔ پڑوسیوں نے یہ سب تماشہ دیکھا مگر نوری کو اب اس کی پروا نہیں تھی۔ سلیم تھک کر گلی میں ہی دروازے کے پاس لیٹ گیا۔ سلیم تو باہر رات بھر سوتا رہا تھا اور اسے ہوش نہیں تھا مگر نوری رات بھر جاگتی اور روتی رہی تھی۔ اس نے اگلی صبح، دوسروں کے جاگنے سے پہلے ہی دروازہ کھول کر سلیم کو اٹھا دیا اور اسے اندر لے آئی۔ اندر پہنچتے ہی سلیم نے نوری کو مارنے کے لئے ایک لکڑی اٹھائی مگر نوری کڑک کر بولی۔

" اس لکڑی کو فوراً رکھ دو اور ہوش میں آؤ۔ یاد رکھنا کہ میں ایک دیہاتی مسلمان لڑکی ہوں اور قرآن کی تعلیمات میری طاقت ہیں۔ میں ایک وحشی اور بے سمجھ شوہر کو سیدھے راستے پر لانے کے لئے پوری ہمت رکھتی ہوں۔"

نوری کی شادی کے پہلے تین چار برس اسی طرح گزر گئے۔ نوری اپنے گاؤں جاتی تو کبھی سلیم کی برائی نہیں کرتی۔ وہ تو ہمیشہ یہی کہتی کہ وہ سلیم کے ساتھ بہت ہی خوش تھی اور نوری کے والدین اللہ کا شکر ادا کرتے کہ انہیں اتنا اچھا داماد ملا ہے اور نوری واقعی قسمت والی ہے۔ اس عرصے میں نوری کے دو لڑکے ہو گئے تھے جن کے نام اس نے اکبر اور یعقوب رکھے تھے۔ نوری کے بار بار کہنے اور جھگڑا کرنے پر سلیم نے شراب چھوڑی تو نہیں تھی مگر بہت کم کر دی تھی۔ کم از کم وہ شراب پی کر گھر نہیں آتا تھا۔ جب چھوٹا لڑکا یعقوب پیدا ہوا تو

تو اس نے نوری سے وعدہ کر لیا کہ وہ اب باہر بھی شراب نہیں پیئے گا۔ وہ اپنے بچّوں سے بہت محبّت کرتا تھا اور ان کے لئے نئے نئے کپڑے اور کھلونے لاتا تھا۔ بچّوں کی پیدائش کے بعد گھر کا خرچ بھی بہت بڑھ گیا تھا مگر نوری بڑی کفایت شعار تھی اور وہ سارا دن گھر کا کام کر کے خرچ بچا لیتی تھی۔ پھر اس نے گلی کے کئی بچّوں کو اُردو اور عربی پڑھانی شروع کر دی اور اس طرح اسے کچھ آمدنی ہونے لگی مگر کبھی نہ کبھی مالی دقّت ضرور ہو جاتی سب سے اہم بات یہ تھی کہ سلیم بالکل بدل گیا تھا اور وہ نوری اور بچّوں سے اتنا پیار کرتا تھا کہ نوری کے لئے یہ گھر ایک سچ مچ کی جنّت بن گیا تھا!

ایک روز رات کو سلیم کافی دیر سے گھر آیا۔ اُس کے ساتھ اُس کا دوست انور بھی تھا جو پہلے بھی سلیم کے ساتھ کئی دفعہ گھر آچکا تھا اور نوری کو آپا کہتا تھا۔ عام طور پر جب بھی سلیم کا کوئی دوست سلیم کے ساتھ آتا تھا تو نوری بچّوں کو لے کر آنگن میں چلی جاتی تھی۔ اس وقت رات کے گیارہ بجے تھے اور بچّے سو چکے تھے۔ نوری آنگن میں چلی تو گئی مگر دروازے سے لگی ان کی باتیں سننے کی کوشش کرنے لگی۔ آج سلیم اور انور بہت ہی دبی دبی آواز میں کچھ کھُسر پھُسر کر رہے تھے اور نوری کے کانوں میں ایک لفظ بھی نہیں پڑا۔ ہاں اس نے کچھ لوہے کی سلاخوں اور ہتھوڑوں اور چھینیوں وغیرہ کے کمرے میں رکھنے کی آوازیں ضرور سُنیں۔ انور کے جانے کے بعد جب نوری کمرے میں آئی تو اس نے دیکھا کہ انور چابیوں کے کئی گچھے، ایک دو ہتھوڑی، کئی چھوٹی بڑی چھینیاں اور کئی لمبی لمبی سلاخیں جو زمین کھودنے اور سیندھ لگانے کے کام آتی ہیں ایک بوری میں بھر کر چھوڑ گیا تھا۔

نوری ان چیزوں کو دیکھ کر بڑی حیران ہوئی اور اس نے سلیم سے پوچھا۔

"یہ سب کیا ہے؟"

"انور اپنے اوزار چھوڑ گیا ہے۔ کل لے جائے گا۔" سلیم آہستہ سے بولا۔

"تم انہیں اوزار کہتے ہو، یہ تو کسی کارخانے میں کام نہیں آتے۔ اور تم دونوں

آہستہ آہستہ کیا کانا کھوسی کر رہے تھے۔ مجھے تو یہ چوروں کا سامان لگتا ہے۔ سچ بتاؤ کیا انور چوری کرتا ہے؟"

جب نوری سلیم کے پیچھے پڑ گئی اور اُس نے اپنی اور بچوں کی قسم کھلائی تو سلیم مان گیا کہ انور دراصل ایک چور تھا جو نقب زنی کرتا تھا اور اس نے ایک دو دفعہ سلیم کو بھی مال کا لالچ دے کر اپنے ساتھ لے جانے کی کوشش کی تھی مگر سلیم نہیں مانا تھا۔ نوری یہ سُن کر ایک دفعہ تو ڈر سے کانپ اٹھی۔ مگر پھر ہمت کر کے بولی۔

"سنو یہ سامان میرے گھر میں ایک منٹ بھی نہیں رہ سکتا۔ یہ بوری تم اٹھاؤ اور چوک سے رکشا پکڑ کر اسے انور کے گھر ابھی چھوڑ آؤ۔ دوسرے انور سے کہہ دینا کہ کل سے اس گلی میں نہیں گھسے گا۔ میں کسی چور کی آپا نہیں بن سکتی۔ میں تمہیں اپنے بچوں کی محبت کا واسطہ دے کر کہتی ہوں کہ اُسے اس کی بوری لوٹانے کے بعد تم انور سے کوئی تعلق نہیں رکھو گے۔"

" اب رات کو میں کہاں جاؤں۔ کہا نہ کہ کل وہ اسے لے جائے گا تو تو خواہ مخواہ پیچھے پڑ جاتی ہے۔ لا روٹی دے۔" سلیم بولا۔

" نہیں پہلے اس بوری کو دے کر آؤ، پھر آ کر آرام سے روٹی کھاؤ۔ میں نے بھی تو ابھی روٹی نہیں کھائی۔"

" نہیں میں اب نہیں جاؤں گا۔"

" تو تم نوری کو ابھی تک نہیں سمجھے۔ پھر میں برقعہ پہن کر باہر جاتی ہوں۔ میں ایک چور بھائی اور شوہر کو گرفتار کرانے کی اخلاقی جرأت اور حوصلہ بھی رکھتی ہوں اور اس پر میں کوئی آنسو نہیں بہاؤں گی۔"

جب سلیم نے نوری کے یہ تیور دیکھے تو وہ آہستہ سے اٹھا اور بوری اٹھا کر باہر نکل گیا۔ جب ایک گھنٹے کے بعد وہ لوٹا تو نوری نے اطمینان کا ایک لمبا سانس لیا جیسے ایک بڑا بوجھ اُس پر سے اتر گیا ہو۔ اُدھر سلیم سوچ رہا تھا کہ نوری ایک عورت ہے یا کوئی فرشتہ۔ جب اس نے نوری سے شادی کی تھی تو وہ اس کے دلکش

خدوخال اور گداز جسم سے متاثر ہوا تھا اور اس نے سوچا تھا کہ اس نے نوری کو کیا پالیا ایک خزانہ لے لیا تھا۔ مگر اس کے یہ وہم گمان میں بھی نہیں تھا کہ یہ کم عمر دیہاتی لڑکی اپنی ہمت اور اخلاقی جرأت سے اپنی اور اُس کی زندگی ہی بدل ڈالے گی
اُدھر نوری سلیم کے ساتھ روٹی کھاتے ہوئے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کر رہی تھی کہ وہ اپنے شوہر کو بدلنے میں ایک دفعہ پھر کامیاب ہوئی تھی۔ اور اب کے تو سلیم نے پکّا عہد کر لیا تھا کہ وہ کسی برائی میں کبھی نہیں پڑے گا۔

اگلے روز سلیم کی چھٹی تھی، اور دن بڑا سُہانا تھا۔ صبح ہی سے ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی اور اودی اودی گھٹا آسمان پر چھائی ہوئی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے بوندا باندی ہونے لگی۔ بچّے آنگن میں بھیگتے پھر رہے تھے۔ نوری نے چائے کے ساتھ آلو اور پیاز کے پکوڑے بھی بنا لئے اور جب وہ سلیم اور بچّوں کے ساتھ چائے پیتے بیٹھ گئی تو اُسے محسوس ہوا کہ اس نے تو ایک بڑی پیاری ننھّی منّی دُنیا جیت لی تھی اور وہ واقعی بڑی قسمت والی تھی!

الجھن۔؟

اسے کئی مرتبہ خیال آیا کہ وہ لڑکا ہو گئی ہے۔ اس کی کئی باتیں تو واقعی لڑکوں کی مانند تھیں۔ وہ تو اُس کے پیچھے کچھ اس طور پر پڑ گئی تھی جیسے وہ لڑکی ہو اور یہ لڑکا!

رما نے یونہی جھک کر سر گھٹنوں پر رکھ دیا اور پھر اس کوٹھڑی میں تقریباً آدھی جگہ گھیرے ہوئے پرانے سے صندقوں کی اونچی دیوار کو دیکھنے لگی۔

اُسے اپنا پچھلا وسیع مکان یاد آیا۔ اُس نے نظریں جھپکائیں۔ اور پھر اس چھوٹی انتہائی تنگ جگہ کا جائزہ لینے لگی۔

پہلے دن رما کو یہ کوٹھڑی کاٹ کھانے کو دوڑی تھی۔ لبِ سڑک، نالے کے قریب اس کچّی دکان کو جس میں ٹین کے بٹن بنانے کی چھوٹی چھوٹی مشینوں کے اُکھاڑے جانے پر کتنے ہی گہرے گڑھے پڑ گئے تھے، وہ کس طرح اپنے رہنے کی جگہ بنائیں گے۔ وہ نہ سمجھی تھی۔ پھر بھی، جب وہ سب اندر داخل ہو کر ایک چھوٹی سی چارپائی پر بیٹھے تھے تو اسے کچھ تسکین ہوئی تھی۔ ٹپکتے ہوئے بوسیدہ کیمپ سے یہ چھوٹی صندوق نما کوٹھڑی سے کہیں بہتر نظر آئی تھی اور پھر سب نے مل کر اپنا تمام سامان صندوق وغیرہ سب کچھ قرینے سے لگا لیا تھا۔

ایک چھوٹی سی کوٹھڑی میں چار آدمی کس طرح سو سکیں گے، اس خیال نے

انہیں اسی شام کو پریشان کیا تھا۔ گرمیوں میں باہر، مکان کے سامنے، نالے کے کنارے راستے میں چارپائیاں بچھ سکتی تھیں۔ مگر کالی گھٹاؤں اور گرجتے ہوئے بادلوں کے دنوں میں یہ انتظام بالکل ناممکن نظر آیا تھا۔ مگر آس پاس کی گلیوں میں کچھ اپنی جیسے اچھے پڑوسی بھی مل گئے۔ اور ان کی بہت سی مشکلیں آسان ہو گئیں چند قدم پر درزی کی دکان کے برآمدے میں رما کا باپ اور چھوٹا بھائی بارش وغیرہ کی صورت میں سو سکتے تھے۔ درزی نے خود اپنی دکان کے برآمدے کی پیش کش کی تھی۔ کتنا مہربان تھا یہ درزی اب پاس کی گلی میں ہی اس کی ماں اپنی پڑوسیوں میں اپنا دن کاٹ سکتی تھی۔ چھٹی کے روز خاص طور پر جب چاروں کے لئے یہ کوٹھڑی ہی مرکز بنتی تو ان پڑوسیوں کا آرام زیادہ محسوس ہوتا۔ اس کا باپ درزی کی دکان کے برآمدے میں ہی چارپائی بچھا کر لیٹ جاتا۔ اور ماں پڑوس میں بیٹھنے چلی جاتی۔

اور جیسے یہ کوٹھڑی اس کی اپنی ہی رہائش ہو۔ دن کا زیادہ وقت وہ اکیلے ہی اس میں گزارتی۔ اس کے ماں باپ اس پر ضرورت سے زیادہ اعتبار کرتے تھے یا شاید وہ حد سے زیادہ شریف تھے۔ رما کا باپ تو دن بھر دفتر میں رہتا اور بھائی ایک سائیکل والے کی دکان میں پُرزوں سے مغز مار کر شام کو چند ٹکے لے آتا۔ ماں کو تو گلی میں شانتی کی ماں کچھ اتنی اچھی لگی تھی۔ کہ وہ دن کا کتنا ہی حصّہ اس کے ہاں گپ شپ میں گزار دیتی شانتی کی ماں کے گھر سے نکلی تو بنتو کے گھر گھس گئی۔ اس کا یہی کام رہتا۔ صرف رما ہی دن بھر کوٹھڑی میں پڑی رہتی کبھی کبھی، جب وہ اُکتا جاتی، تو خود بھی تالہ لگا کر ماں کے پاس جا بیٹھتی۔

رما ایک دو چکّر بازار کے بھی لگا آیا کرتی تھی۔ کبھی کوئی چوٹی خریدنے، کبھی چوڑیاں دوپٹے کا رنگ اور کبھی کچھ اور۔ وہ زیادہ دیر بازار میں نہ رہتی اور جب تک کہ کوئی جان پہچان کی لڑکی اسے بازار میں یا راہ میں نہ مل جاتی وہ جلد ہی لوٹ آیا کرتی تھی۔ لیکن جب کبھی اُسے دیر ہو جاتی تو اُسے ماں کو یہ سمجھانے میں دیر نہ لگتی کہ اسے اس کی کوئی سہیلی مل گئی تھی جو زبردستی اسے اپنے گھر لے گئی تھی!

رما کے ماں باپ بڑھاپے کی منزل میں داخل ہو چکے تھے۔ اور ویسے بھی چونکہ وہ بالکل سمجھ دار، جوان لڑکی تھی وہ گھر کا سارا کام خود کر لیتی تھی۔ اس کی ماں اکثر گھر میں تذکرہ کرتی کہ اس کی شادی اب جلد ہی کر دی جائے گی۔ مگر وہ ایک عجیب ضد سے کہا کرتی کہ اس کی پڑھائی ادھوری رہ گئی ہے۔ اور وہ اور پڑھنا چاہتی ہے۔ اس کے لئے ___ وہ سلائی کے اسکول والی گلی میں ان دو خوبصورت لڑکیوں کا ذکر کرتی جن کے ساتھ وہ آسانی سے پرائیویٹ کالج میں جا سکتی تھی۔ مگر اس کی کوئی سنتا ہی نہیں تھا!

اس چھوٹے برساتی نالے کے دوسری طرف سامنے کی قطار میں کچھ بہتر مکان تھے مگر اس کی طرف تو دور دور تک چھوٹی چھوٹی دکانیں ہی تھیں۔ دن بھر ان دکانوں کے سامنے سے ادھر ادھر کے لوگ گزرتے اور سامنے کی قطار کا حال بھی اس سے مختلف نہ تھا۔ رما صبح ہی اٹھ جاتی اور جھاڑو دے کر انگیٹھی سلگاتی کیونکہ اس کا باپ صبح ذرا پہلے دفتر جایا کرتا تھا۔ اُسے صرف ایک مشکل تھی۔ کہ اس کا چھوٹا بھائی سولہ سترہ سال کا ہوتا ہوا بھی بالکل کام نہ کرتا تھا۔ اور اسے خود نالے کی دیوار کے آخر پر لگے ہوئے نل سے پانی بھر کر لانا پڑتا تھا۔ ان کی پانی کی مشکل یہاں حل نہ ہوئی تھی۔ کیونکہ دونوں قریب کی گلیوں میں کسی ایسے کے ہاں نل نہ تھا، جہاں ان کی واقفیت تھی۔

رما کی زندگی بالکل یکساں اور قطعی بے کیف تھی اور اگرچہ درزی نے اسے کپڑوں کی کٹائی سیکھنے کو کہا تھا۔ جس کی ماں نے منظوری بھی دے دی تھی مگر اسے یہ تجویز پسند نہ آئی تھی۔ وہ کچھ اداس سا محسوس کرنے لگی تھی۔ اسے بوسیدہ کیمپوں کا وہ وسیع خطہ یاد آیا جہاں اسے اپنی ہی عمر کی کتنی ہی سہیلیاں دن بھر اچھی اچھی باتیں کرنے کو مل سکتی تھیں کتنی زندگی تھی اس کیمپ میں!

وہ غیر محسوس طور پر نالے سے پچھے مکانوں میں زیادہ دلچسپی لینے لگی۔ ان مکانوں میں کچھ اچھے لوگ رہتے تھے۔ سامنے کے تین مکان اسے بالکل آباد نظر آئے۔ کنارے کے مکان میں اکثر چوکھٹ پر بیٹھی ہوئیں اسے دو اپنی ہی طرف کی عورتیں نظر آیا کرتی تھیں۔

اس نے اپنے گھر میں بیٹھے ہوئے کئی مرتبہ توجہ سے ان عورتوں کی طرف دیکھا تھا۔ دونوں عورتیں لباس اور سجاوٹ میں اسے نہایت دلچسپ نظر آئی تھیں اور ذرا اتنی عورت کی دو گڑیا سی سفید لڑکیاں تو اُسے بے حد اچھی لگی تھیں۔ رما نے نالے کی دیوار کے سہارے کھڑے ہو کر سامنے ایک روز انہیں پکارا اور اس کی ان سے واقفیت ہو گئی۔ ایک روز پھر وہ نالے پر سے گھوم کر، سڑک کو پار کر کے ان کے مکان میں بھی ہو آئی۔

جس سڑک سے نالہ پار ہوتا تھا وہ ذرا دُور تھی۔ پھر بھی رما دوسرے تیسرے روز سامنے اُن کے پاس ہو آیا کرتی۔ بیچ کے مکان کو چھوڑ کر تیسرے مکان میں اُسے اپنی ہی عمر کی تین لڑکیاں مل گئی تھیں، جو کہیں پڑھنے جاتی تھیں۔

زندگی میں کچھ دلچسپی پیدا ہو گئی تھی مگر زیادہ نہیں۔ اسے جلد ہی یہ احساس ہو گیا کہ اُسے فالتو سا سمجھا جا رہا ہے۔ شاید اس وجہ سے کہ وہ دن بھر ایک چھوٹی سی کوٹھڑی میں پڑی رہتی تھی اور نہ اس کی شادی ہوئی تھی، اور نہ کہیں وہ پڑھنے جایا کرتی تھی۔ ان بظاہر پرجوش عورتوں نے بھی جنہیں اس نے کئی مرتبہ اپنے خاوندوں سے دھینگا مشتی کرتے دیکھا تھا اس کی ملاقات پر کوئی خاص جوش نہیں دکھایا تھا۔ وہ جیسے بہت مصروف تھیں۔ انہوں نے محض دو ایک جمپر کے نمونے اس سے سیکھے۔ اور وہ تینوں لڑکیاں اپنا معیار شاید زیادہ اونچا سمجھتی تھیں۔ وہ اس کے ہندی کے رسالوں میں دلچسپی لیتی معلوم دیں، نہ اس کی شخصیت میں۔

رما کی سرگرمیاں پھر نالے کی اپنی ہی دیوار کی طرف اپنی ہی کوٹھڑی میں سمٹ گئیں۔ مگر اس کوٹھڑی میں بیٹھے ہوئے اس کی نظریں سامنے وسط کے مکان کی طرف اٹھ جاتیں یہ ایک اچھا اور پکا مکان تھا۔ جس کی ایک کھڑکی عین اس کے سامنے کھلتی تھی۔ یہ کھڑکی یا اس کی کوٹھڑی کچھ اس طور پر واقع تھی کہ وہ اس کمرے کا کافی حصہ وہاں بیٹھی ہوئی بخوبی دیکھ سکتی تھی۔ اس مکان میں ایک خاص قسم کی ہماہمی سی رہتی۔ اگرچہ اس میں اسے کبھی کوئی عورت نظر نہ آئی تھی۔ صبح شام اسے ایک خوبصورت سا لڑکا اس میں نظر آتا جسے اس نے کئی مرتبہ پانی بھرتے ہوئے، پڑھتے ہوئے

یونہی غیر ارادی طور پر دیکھا تھا۔ لیکن جہاں تک رما کا خیال تھا، اس لڑکے کی توجہ اس کی طرف بالکل نہ ہوئی تھی۔

یونہی رما صبح شام اس کوٹھڑی کے بیچ میں سے کمرے کو دیکھنے لگی۔ اس کمرے میں بیٹھا ہوا، یا پڑھتا ہوا وہ لڑکا اکثر اسے نظر آتا۔ نالے کے اس پار اسے یہ عجیب دل چسپی نظر آئی، اور وہ ان جانے طور پر اس میں دلچسپی لینے لگی وہ بھی اس کے بارے میں یقینی طور پر کچھ نہ جان سکی تھی۔ ہاں وہ اُسے کچھ اچھا لگتا تھا۔ اور اسے یقین تھا کہ وہ برا نہیں ہے۔

جلد ہی وہ اپنے آپ کو کچھ پریشان سا محسوس کرنے لگی۔ بازار جانے کی بہ نسبت کوٹھڑی میں وقت گزارنا اس کے لئے زیادہ دل چسپ ہو گیا۔ صبح اور شام تو خاص طور پر اس کے لئے اس بے کیف ماحول میں زندگی سی اچھل جاتی۔ اس کے کام میں ایک تیزی آجاتی، بار بار اس کے کندھوں پر سے دوپٹہ کھسکتا۔ اور وہ ایک جھٹکے کے ساتھ اسے سر پر رکھتی ہوئی کھڑکی کی طرف دیکھتی!

پھر ایک دن جب کھڑکی بند تھی، کھڑکی کے پاس کھیلتی ہوئی ایک چھوٹی سی عیسائی لڑکی کو اس نے اپنی طرف اشارہ کر کے بلایا۔ اس لڑکی کو کئی مرتبہ اس نے اس گھر میں آتے جاتے دیکھا تھا۔ وہ اچھلتی پھاندتی سڑک پر سے ہوتی ہوئی جلد ہی اس کے پاس پہنچ گئی۔ اور رما نے اسے ایک لمبا ریشمی دھاگہ دے کر اس کے بارے میں ایسی کتنے ہی سوال کئے وہ اب اس کے بارے میں کافی جان چکی تھی اور اس کی دل چسپی سنجیدگی اختیار کر گئی تھی۔ اب وہ لڑکا بھی اس کی طرف کافی دیکھتا تھا۔ مگر اس کی نظروں میں ایک جھجک تھی۔ جب رما اس کی طرف دیکھتی تو وہ فوراً نظریں جھکا لیتا۔ تاہم اس کا بھی اسے اس قدر دیکھنا بھلا لگتا۔ اور ایک مرتبہ پھر رما کی دلچسپی نالے کے پرے والے مکانوں کے گرد گھومنے لگی۔

رما اس لڑکے کے بارے میں کچھ سنجیدہ ہی ہو گئی۔ اور اس کا اشتیاق بڑھ گیا کہ وہ ایک مرتبہ اُسے قریب سے دیکھے۔ اس کے لئے اسے زیادہ سوچنا نہیں

پڑا اور وہ ایک آدھ مرتبہ نالے کے اس پار ہو آئی۔ اس کے علاوہ جب وہ تیار سا ہو کر پیدل نکلتا تو وہ بھی اپنی گلی میں سے ہوتی ہوئی اس کے پیچھے پیچھے بازار کی طرف نکل جاتی۔ دو تین مرتبہ وہ ایک دوسرے کے بالکل قریب ہو کر گزرے اور دونوں نے ایک دوسرے کو اچھی طرح دیکھ لیا!

وہ رما کو بہت خوبصورت لگا۔ اس خیال نے یکایک اسے اپنے بارے میں حساس بنا دیا۔ وہ بھی تو بُری نہیں تھی۔ اگرچہ زیادہ خوبصورت نہ سہی۔ اس نے اپنے متعلق زیادہ سوچا۔ اور وہ جلد ہی مطمئن ہو گئی۔ کہ وہ اپنے ذرا بڑے دانتوں کے باوجود دیکھنے میں اچھی لگتی تھی۔

وہ بالکل بے نیاز سا معلوم ہوا۔ کیا وہ کسی بارے میں پہل نہ کرے گا، وہ سوچنے لگی۔ اسے کیمپ کی جوان لڑکیاں اور بادامی باغ کی جوانی کے احساس سے آشنا سہیلیوں کی باتیں یاد آئیں اور خود ــــ خود بھی تو اسے تجربہ تھا کہ لڑکے تو بالکل پیچھے ہی پڑ جاتے ہیں مگر یہ تو بالکل ہی عجیب سا تھا۔

رما بے چین سی ہو گئی۔ وہ خود ہی کیوں نہ کسی روز بول لے؟ مگر دفعتاً اس کے ذہن میں ایک خیال جھلکا۔ ایک دن اس نے پھر اسی عیسائی لڑکی کو بُلایا۔ اور ہمّت کر کے اپنی گیتوں کی کاپی میں سے ایک ورق نکال کر اپنے قلم سے کچھ گھسیٹ ہی دیا۔ اس نے اپنی بے باکی پر غور کیا مگر اس نے کوئی ایسی ویسی بات بھی تو نہیں لکھی تھی۔ وہ اس سے بولنا چاہتی تھی ــــ اور بس!

رما کا خیال تھا کہ اس کا یہ چھوٹا سا پرچہ اس کے لئے کافی ثابت ہو گا۔ اور اسے اب ایک طویل محبت بھرا خط ملے گا مگر وہ اپنا ہی پرچہ واپس پا کر کچھ مایوس سی ہوئی اس نے اس پر ایک طرف پنسل میں لکھ دیا تھا۔ کہ وہ اس سے مل سکتی تھی۔

مگر کہاں، کس طور پر اور کب، یہ اس میں کچھ نہ لکھا تھا۔ ان سب باتوں کی اُمید اسے اس سے تھی۔ اس پرچہ کو واپس پا کر ایک عجیب جذبہ اس کے ذہن پر رینگ آیا جو شرمندگی اور حیرانی کا تھا۔ اس نے اس پرچہ کو فوراً پھاڑ دیا، کھڑکی کی طرف دیکھا، اور

چارپائی پر اوندھے منہ لیٹ گئی۔

وہ خود ہی بول لے گی، رما نے فیصلہ کیا۔ ویسے اس خط سے وہ اب بول تو سکتی تھی نا۔

وہ تو بالکل لڑکا ہو گئی تھی، اس نے مسکرا کر سوچا۔

وہ خراب تو نہیں ہوتی جا رہی تھی۔ اس نے ایک اضطراب میں اُٹھ کر سوچا اور پیشانی پر ایک ترچھی شکن نے مسکراہٹ کو غائب کر دیا۔ اس نے کھڑکی کی طرف دیکھا درزی کے متعلق سوچا اور چارپائی پر رانوں کو اکڑا کر لیٹ گئی۔ پھر وہ اُٹھ بیٹھی اور بغیر ارادی طور پر شلوار کو اونچا کر کے پنڈلی پر کچھ دیکھنے لگی۔ وہ اٹھی اور چوکھٹ پر کھڑی ہو کر سامنے جھانکنے لگی۔ کھڑکی سے پرے سامنے کمرہ خالی سا تھا۔

آج کا دِن کتنا ٹھنڈا تھا۔ رما نے جنوب میں منڈلاتی ہوئی خاکی گھٹا کو دیکھتے ہوئے خیال کیا اور پھر وہ واپس آ کر بیٹھ گئی۔ اس نے آئینہ دیکھا، بالوں کی لٹوں کو ہاتھ سے سنوارا اور ٹھوڑی کو ہتھیلی میں لے کر کچھ سوچنے لگی۔ اس نے ارادہ کیا کہ وہ آج ضرور اس کے پیچھے چلے گی اور راہ میں بول لے گی۔

یکایک ایک اندھیرا سا اس کی کوٹھڑی میں رینگ گیا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا، باہر مکان بھی مٹیالے سے ہو گئے تھے۔ رما چوکھٹ پر پھر کھڑی ہو گئی۔ بادلوں کے تاریک ہجوم نالے پر منڈلا رہے تھے۔ وہ دوڑ کر گلی میں گئی۔ ماں نے اُسے چھت پر سے کپڑے اُتار لانے اور درزی کے برآمدے میں چارپائیاں کھڑی کرنے کو کہا۔ رما جھٹ کپڑے اتار کر لوٹ آئی۔ اور جبو تے سے پر چڑھی ہی تھی۔ کہ زور سے بارش ہونے لگی۔ بوچھاڑ اس طرف کی تھی۔ اس لئے اس نے دروازہ بند کر لیا۔ اور اندھیرا دروازوں میں سے کمرے میں بھر تا رہا۔

کچھ عجیب سے جذبے اس کے ذہن پر چھا گئے۔ اور وہ چھوٹی سی چارپائی پر اوندھی لیٹی رہی۔ بہت دیر تک بارش ہوتی رہی۔ پھر اس نے دروازہ کھولا۔ سامنے کھڑکی میں وہ اس کی طرف گھور کر دیکھ رہا تھا!

چھوٹی چھوٹی بوندیں پڑ رہی تھیں مگر برساتی نالہ کافی دور تک تیزی سے بہہ رہا

تھا وہ اس کی طرف دیکھتی ہوئی آئینہ میں بالوں کو کنگھی کرنے لگی۔ پھر اس نے دوپٹہ اتار پھینکا اور کھڑکی کی طرف دیکھا۔ وہ اس کی طرف اب بھی دیکھ رہا تھا۔

اُسے کچھ سوجھی اور اس نے دروازے کو یونہی بھیڑ دیا۔ گہرے نیلے رنگ کا جمپر اور دوسری شلوار پہنی اور اس پر دوپٹہ۔ اس نے آئینہ میں دیکھا اور پھر ایک دم ذرا تیزی سے دروازہ کھولا۔ وہ سامنے کھڑکی میں نہیں تھا۔ اس نے نالے کے موڑ کی طرف دیکھا وہ آہستہ آہستہ بازار کی طرف جارہا تھا۔ رما نے باہر نکل کر دیکھا۔ بوندیں اب خاموش ہوگئی تھیں، اور بادلوں میں سفیدی اور نیلاہٹ پھوٹ آئی تھی۔ اس نے تالا اٹھایا مگر کچھ سوچ کر پھر رکھ دیا۔ چپل پہن کر اور باہر کنڈا لگا کر رما بازار کی طرف تیزی سے چل دی۔

وہ جلدی ہی بازار میں پہنچ گئی۔ اور ایک منہمک لڑکی کی مانند اس نے تمام بازار کا چکر لگایا۔ مگر وہ اسے نہ ملا۔ وہ کدھر چلا گیا، رما نے ایک لمحے کے لئے سوچا اور ایک دکان پر کچھ اور عورتوں کے ساتھ فینسی کپڑا دیکھنے لگی۔

رما جلدی ہی پھر بازار میں گھومی مگر وہ پھر بھی نہیں ملا۔ وہ اسکول کی طرف کو مڑگئی کالج کی طرف۔ مگر وہ اسے کہیں نظر نہیں آیا۔ اس نے ایک آخری چکر بازار کا لگایا اور مایوس ہوکر تیزی سے گھر لوٹی۔ اُس نے ایک عجیب پریشانی کا احساس کیا۔ جب وہ گلی میں گھسی تو اس کی ماں گھر کے باہر کھڑی تھی۔ رما کو دیکھتے ہی بولی۔

"تو کہاں چلی گئی تھی۔ ساری چارپائیاں باہر ہی بھیگتی رہیں۔"

"چارپائیاں" رما نے ایک ذہنی الجھن میں دُہرایا۔ اور شلوار کے پائینچے اٹھا کر ماں کی طرف دیکھنے لگی!

آئینے کی گرد

شوبھا بی۔ اے پاس کر کے دو سال سے گھر بیٹھی ہوئی تھی۔ اُس کے ماں باپ اُس کے نوکری کرنے کے خلاف تھے اور جلدی سے جلدی اس کی شادی کرنا چاہتے تھے۔ ویسے شوبھا نے ایک دو سرکاری دفتروں میں درخواستیں بھی دی تھیں اور ایمپلائمنٹ ایکسچینج میں اپنا نام بھی رجسٹر کروایا تھا مگر کہیں سے بھی اُس کے لئے کوئی کال نہیں آئی تھی۔ شاید اس لئے کہ بی۔ اے میں اُس کی تھرڈ ڈویژن آئی تھی۔ پرائیویٹ فرموں اور دکانوں میں نوکری کے لئے اُس نے کوئی کوشش نہیں کی کیونکہ اس معاملے میں اُس کی کچھ سہیلیوں کا تجربہ ناخوشگوار تھا۔ اُس کے قدامت پسند ماں باپ بھی اس کو ہرگز ایسی نوکری نہ کرنے دیتے۔

شوبھا کا والد حکم چند ایک جلد ساز تھا جس کی کتابوں کے بازار میں بہت پرانی ایک چھوٹی سی دکان تھی۔ جلد سازی میں اُس کی آمدنی کبھی اتنی نہیں ہوئی تھی کہ وہ خوشحالی کی دہلیز میں قدم رکھتا۔ اُس کی دکان اور مکان دونوں کرایے کے تھے اور مالک مکان ہر سال کرایہ بڑھا دیتا تھا۔ کمر توڑ مہنگائی نے کبھی سر اُٹھانے نہیں دیا تھا۔ اولاد صرف یہی لڑکی شوبھا تھی اور چونکہ کنبہ بڑا نہیں تھا اس لئے اُس کا گزارہ ہو رہا تھا۔ شوبھا کی ماں نے اپنی کفایت شعاری اور عقلمندی سے شوبھا کی شادی

کے لئے تھوڑا بہت کپڑا، کچھ نئے برتن اور ایک دو زیور خرید لئے تھے۔ وہ شروع سے اُس کے لیے کچھ نہ کچھ بچاتی رہی تھی۔ مگر تین سال کی انتھک کوشش کے باوجود وہ شوبھا کے ہاتھ پیلے کرنے میں کامیاب نہیں ہوئی تھی۔ وہ پرانے وقت کی سیدھی سادی عورت تھی اور پوجا پاٹھ میں لگی رہتی تھی۔ وہ ہر سوموار کو برت بھی رکھتی تھی تاکہ شوبھا کے لئے کوئی لڑکا مل جائے۔ اُسے یقین تھا کہ پرماتما اُس کی ضرور کبھی نہ کبھی سُنے گا۔

شوبھا بائیس سال کی بہت سمجھ دار، حلیم اور نہایت شریف لڑکی تھی۔ وہ گھر کے کام کاج میں بہت ہوشیار تھی اور جب وہ دس گیارہ سال کی ہی تھی تو گھر کا سارا کھانا خود ہی بنا لیتی تھی۔ اُس نے کبھی اپنا کوئی کپڑا درزی سے نہیں سلوایا۔ وہ اپنے باپ کے کرتے قمیض اور پاجامے بھی خود ہی سی لیتی تھی۔ سارے پڑوسی اور رشتے دار اُس کی ہوشیاری اور شرافت کی تعریف کرتے تھے۔ اِس کے باوجود شوبھا کو کسی نے ابھی تک پسند نہیں کیا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ گہرے سانولے رنگ کی تھی اور آج کل کے معمولی لڑکے بھی گوری لڑکیاں ڈھونڈتے تھے۔ اگر وہ امیر گھر کی لڑکی ہوتی تو اُس کا سانولا رنگ فیشن اور عمدہ بھڑکیلے لباسوں اور میک اپ میں ایک عجیب دلکشی اختیار کر لیتا مگر شوبھا تو ایک غریب گھر کی لڑکی تھی اور اُس کے ماں باپ کے پاس اُس کی معمولی شادی کرنے کے لئے بھی پورا پیسہ نہیں تھا۔

مگر حقیقت تو یہ تھی کہ شوبھا ایک خوبصورت اور دلکش لڑکی تھی۔ اُس کے رنگ کے باوجود اُس کی تمام سہیلیاں اُسے خوبصورت سمجھتی تھیں۔ شوبھا کو بھی یہ خیال بھی نہیں آیا تھا کہ وہ اِتنی کالی ہے کہ اُس کی شادی بھی مشکل سے ہوگی۔ وہ جب آئینہ دیکھتی تو اُسے خود ہی اپنا چہرہ بڑا پیارا لگتا۔ گھنے سیاہ بال۔ بڑی بڑی بے چین سی بادامی آنکھیں، گول بھرا بھرا خوبصورت متناسب چہرہ، بھرپور مسکراتے ہونٹ اور موتیوں کی طرح سفید ہموار دانت۔ پھر وہ ہری

بھری ٹہنی کی طرح ابھرے جسم کی لمبی لڑکی تھی۔ بھلا خوبصورتی اور کیا ہوتی ہے۔ رنگ تو وہ ہوتا ہے جو ڈھل جاتا ہے یا چھونے پر کسی دوسرے کے لگ جاتا ہو۔ قدرت تو ہر رنگ میں خوبصورت لگتی ہے اور عورت تو قدرت کی ہی شاہکار تخلیق ہے۔ سنگ مرمر، چاہے سفید رنگ کا ہو یا کالے رنگ کا، خوبصورت سنگ مرمر ہی کہلائے گا۔

لیکن جب شوبھا کو مسلسل تین سال تک کسی نے شادی کے لئے پسند نہیں کیا تو اسے خود ہی یہ احساس ہو گیا کہ وہ اپنے گہرے سانولے رنگ کی وجہ سے خوب صورت نہیں سمجھی جاتی۔ لیکن، پھر اُس کی سوچ ایک کروٹ لیتی، جب وہ کالج میں پڑھتی تھی تو لڑکے اُس کی طرف کیوں کھنچتے تھے اور اُس سے بات کرنا کیوں چاہتے تھے۔ اب بھی وہ بازار جاتی ہے تو لڑکے اُس کی طرف مڑ مڑ کر کیوں دیکھتے ہیں۔ پڑوس کے کئی لڑکے اس کی طرف دیکھ کر کیوں مسکراتے ہیں اور اُس سے کچھ دیر بات کرنا کیوں پسند کرتے ہیں۔ وہ سوچنے لگی کہ کیا مرد کی نظر کا آئینہ گرد آلود ہے یا اُس کی فطرت اور ذہنیت کے دو رُخ ہیں، ایک تفریح اور کھلواڑ کا جس کے لئے ہر لڑکی خوب صورت ہے اور ایک خالص کاروباری جس میں شادی بھی شامل ہے اور جس کے لئے مرد نے خوبصورتی کے اپنے اصول تعیّن کر لئے ہیں اور وہ لڑکی کو اس طرح دیکھتے اور پرکھتے ہیں جیسے وہ جذبات سے بھری اور چھلکتی ہوئی گوشت پوست کی معصوم گڑیا نہ ہو بلکہ بازار میں بکنے والی کوئی بے جان شئے ہو جسے خریدتے وقت خوب پرکھا جاتا ہے اور دوسری اشیا سے مقابلہ کیا جاتا ہے!

تقریباً ہر مہینے ہی شوبھا کی ماں یا باپ کہیں نہ کہیں اُس کے رشتے کی بات چیت کرتے اور گھر میں کوئی نہ کوئی پارٹی اُسے دیکھنے آتی مگر مڑ کر کوئی جواب نہ دیتا یا کوئی نہ کوئی بہانہ بنا دیتے۔ اور شوبھا کام سے فارغ ہو کر بیٹھتی تو سوچنا شروع کر دیتی اور پھر یہ سوچ نہ رُکتی۔ اس کا رنگ اپنے دیس کا رنگ ہی تو ہے۔

کالا اور گورا، دونوں رنگ اپنے دیس کے ہیں اور بلاشبہ اپنے دیس میں کالے رنگ کے لوگوں کی بہت بڑی اکثریت ہے۔ پھر کالے رنگ کو اتنی ناپسندیدگی کی نظر سے کیوں دیکھا جاتا ہے اور صرف عورتوں میں۔ پھر مرد کو عورت پر یہ فوقیت کیوں نصیب ہے اور عورت اتنی مجبور کیوں ہے کہ مرد چاہے کتنا بھی کالا کیوں نہ ہو وہ گوری لڑکی ہی چاہے گا۔ وہ لڑکے، جن کی بہنیں اس سے زیادہ کالی تھیں، صرف رنگ کی بنا پر اسے ناپسند کیوں کر گئے تھے؟

لیکن شوبھا آخر ایک نوجوان اور خوبصورت لڑکی تھی۔ اُس کے دل میں ارمان تھے اور آرزوؤں کے پھول کھلے تھے۔ وہ غسل کرنے کے بعد تیار ہوتی اور آئینہ لے کر کنگھی چوٹی کرتی تو ارمان چپکے چپکے مچلنے لگتے اور آرزوئیں ایک پیاری قوسِ قزح بن کر اُس کی نظروں کے سامنے مسکرانے لگتیں اور وہ بے ساختہ خود بھی مسکرا اٹھتی۔ پھر سوچتی سوچتی وہ کسی سرسبز و شاداب جزیرے میں پہنچ جاتی اور اپنے خوابوں کے شہزادے کا انتظار دیکھتی۔ وہ مایوس نہیں ہوئی تھی اور اسے یقین تھا کہ اُس کی زندگی میں ایک دن دبے پاؤں کوئی شہزادہ داخل ہو جائے گا۔ اور اُسے پتہ بھی نہیں لگے گا!

ایک روز حکم چند کی دوکان پر ایک نوجوان لڑکا آیا اور بولا۔

"کیا آپ مجھے اپنی دکان میں جلد سازی سکھا سکتے ہیں؟"

حکم چند نے نظر اٹھا کر دیکھا۔ کوئی اچھے گھر کا پڑھا لکھا لڑکا معلوم ہوتا تھا جو شاید بے کاری کی وجہ سے پریشان تھا۔ حکم چند بولا۔

"بیٹا جلد سازی میں اب کچھ نہیں رکھا۔ دن بھر میں مشکل سے دس بارہ روپے کما پاؤ گے۔ پھر میں تمہیں یہاں کام کرنے کے پیسے نہیں دے سکوں گا۔ کیوں کہ میرا ہی گزارہ مشکل سے ہوتا ہے۔ ہاں لوگوں کے گھروں سے اگر تم کتابیں جلد بندی کے لئے لے آیا کرو گے تو اُن کے پیسے تم رکھ سکتے ہو۔ تمہارا نام کیا ہے اور کہاں تک پڑھے ہوئے ہو؟"

"میرا نام گوتم ہے" وہ لڑکا بولا "میں نے بی۔اے پاس کیا ہے۔ میں بیکاری کا ستایا ہوا ہوں اور میرا اس دنیا میں سوائے ماں کے اور کوئی نہیں ہے۔ میں گلی سناراں میں رہتا ہوں۔ میرے باپ کی صدر بازار میں کتابوں اور کاپیوں کی دکان تھی جوان کے سورگ باش ہو جانے پر بند ہو گئی تھی کیونکہ اس وقت میں پڑھ رہا تھا۔ اب بہت کوشش کی مگر نہ کوئی نوکری ملی اور نہ دکان۔ ماں کے پاس تھوڑا سا روپیہ ہے اور اگر آپ اجازت دیں گے تو میں آپ کی دکان میں کچھ کتابیں اور کاپیاں بھی رکھ لوں گا۔ اُن کی فروخت سے مجھے جو آمدنی ہوگی اُس میں سے کچھ حصّہ میں آپ کو بطور کرائے کے دے دوں گا۔ کیا آپ میری مدد کریں گے۔"

حکم چند اس لڑکے کی شریفانہ شکل و صورت اور گفتگو سے اتنا متاثر ہوا کہ اُس نے ہاں کر دی اور شام کو گھر پہنچ کر اپنی بیوی اور بیٹی سے بھی اس کا ذکر کر دیا۔ حکم چند نے سوچا تھا کہ دکان پر ایک سے دو آدمی اچھے ہوتے ہیں کیونکہ اب جب کبھی وہ بیمار ہو جاتا تھا تو دکان بند ہی رہتی تھی۔

گوتم اگلے ہی دن کوئی ایک ہزار روپے کی کتابیں اور کاپیاں خرید کر اور رکشا میں رکھ کر حکم چند کی دکان پر چلا آیا اور انہیں بہت قرینے سے دکان میں لگا لیا۔ اس طرح سے دکان میں جلد سازی کے علاوہ اسکولوں کی کتابیں اور کاپیاں بھی بکنے لگیں اور حکم چند نے اسی روز ایک نیا بورڈ "حکم چند جلد ساز اور کتب فروش" کا بنوا کر دکان پر لگوا لیا۔

گوتم حکم چند کے گھر آنے جانے لگا اور اس نے چند ہی دنوں میں اپنے سلیقے، تمیز اور حسنِ سلوک سے سب کا دل جیت لیا۔ شوبھا نے گوتم کو جب پہلی دفعہ دیکھا تو اُس کے دل میں نفرت کا ایک جذبہ ابھر آیا تھا کیونکہ گوتم گورے رنگ کا بڑا خوب صورت نوجوان تھا اور وہ اُس خوب صورتی کی جو گورے رنگ سے مزین تھی دشمن ہو چکی تھی۔ مگر گوتم نے شوبھا کو دیکھا تھا تو ایک تعریفی احساس

میں چونک اٹھا تھا۔ اُسے شوبھا پہلی ہی نظر میں بڑی دلکش لگی تھی اور بعد میں جب اُس نے اپنے کمرے کی تنہائی میں شوبھا کے بارے میں سوچا تو اُس کے منہ میں ایک خوشگوار ذائقہ پیدا ہو گیا جیسے اُس نے کوئی عمدہ مٹھائی کھائی ہو۔ وہ اِس نتیجے پر پہنچا کہ اگر شوبھا کا رنگ سانولا نہ ہوتا تو وہ شاید اپنے عمدہ خد و خال کے باوجود اتنی پر کشش نہ ہوتی۔ اُس کی نظروں کے سامنے پتلی نازک ٹہنی پر جھومتا ہوا سیاہ گلاب گھوم گیا جو ہمیشہ اسے سفید گلاب سے بھی زیادہ خوب صورت لگتا تھا اور پھر فوراً اُسے وہ لذیذ سیاہ انجیر یاد آگئی جو کئی سال پہلے اُس نے کشمیر میں دیکھی تھی۔ وہ کروٹ بدل بدل کر شوبھا کے بارے میں سوچتا اور اُسے مختلف شکلوں میں دیکھتا رہا اور بہت دیر تک نہیں سویا۔

گوتم حکم چند کے گھر جاتا تو شوبھا سے بھی بات کرتا۔ حکم چند کے گھر جانے کی اُس کی سب سے بڑی کشش شوبھا ہی تھی جس کی آنکھوں میں اب اسے ایک دل پذیر دحشت اور ویرانی نظر آتی۔ شوبھا کو بھی جلد ہی پتہ لگ گیا کہ گوتم ایک مختلف لڑکا تھا اور وہ اس کی طرف مائل ہوتی چلی گئی مگر ڈری ڈری سہمی سہمی رہتی۔ ایک روز گوتم دن میں دکان سے جلدوں کے لئے گتّہ لینے چلا آیا جو گھر پر رکھا ہوا تھا۔ اس وقت اتفاق سے شوبھا اکیلی تھی کیونکہ پڑوس میں کتھا ہو رہی تھی اور شوبھا کی ماں وہاں گئی ہوئی تھی۔ گوتم کو جب پتہ لگا کہ شوبھا گھر پر اکیلی ہے تو وہ بیٹھا بھی نہیں اور شوبھا سے بولا۔

"تم گتّے کے بنڈل نکال دو۔ میں رکشا لے آؤں۔"

"ایسی بھی کیا جلدی ہے۔" شوبھا مسکرا کر بولی "کیا چائے بھی نہیں پیئں گے۔"

"ماں جی گھر پر ہوتیں تو میں ضرور بیٹھ جاتا اور چائے بھی پی لیتا۔ میں اُن کی غیر حاضری کا فائدہ اٹھانا نہیں چاہتا۔ خاص طور پر جب تم مجھے بہت اچھی لگتی ہو اور میں چاہتا ہوں کہ گھنٹوں تمہارے پاس بیٹھا رہوں۔ سچ تم مسکراتی ہو تو ایسا لگتا ہے کہ کسی گلشن میں پھول کھل رہے ہیں۔ پھر شوبھا تم کتنی اچھی اور نیک ہو۔ شکل

کی خوبصورتی تو اتنی نایاب نہیں ہے مگر دل کی خوب صورتی تو قسمت سے ملتی ہے۔ میں نے تمہارا ذکر ماں سے بھی کر دیا ہے۔"

شوبھا نے شرم سے سر جھکا لیا۔ گوتم اپنی بات کہہ کر فوراً باہر چلا گیا تھا اور شوبھا وہیں کھڑی ایک سوچ میں ڈوب گئی۔ کیا گوتم اُس سے واقعی پیار کرتا تھا یا وہ بھی صرف ایک موقع کا فائدہ اٹھانا چاہتا تھا؟ مگر یہ پہلا موقع تھا کہ کسی نے اسے دل کی گہرائی سے پکارا تھا۔ پھر یہ اُس کا وہم تھا۔ وہ ابھی سنبھل بھی نہ پائی تھی کہ گوتم رکشا لے آیا۔ شوبھا نے کھوئی کھوئی نظروں سے گوتم کو دیکھا۔ گوتم نے خود ہی گتّے کے بنڈل نکالے اور رکشا میں رکھ کر چلا گیا۔

وقت اِسی طرح بیتتا گیا اور گوتم اور شوبھا ایک دوسرے کو زیادہ سے زیادہ چاہنے لگے مگر انہوں نے یہ بھی پسند نہیں کیا کہ وہ چوری چھپے ملیں اور باہر گھومیں پھریں۔ گوتم صرف گھر پر آجاتا اور کچھ دیر شوبھا کی ماں کی موجودگی ہی میں وہ شوبھا سے بات کر لیتا اور دونوں ہنس بول لیتے اور اکٹھے چائے پی لیتے۔ جس روز گوتم گھر نہ آتا شوبھا عجیب عجیب سا محسوس کرتی اور یہی حال گوتم کا ہوتا۔ ایک دن گوتم اپنی ماں کو شوبھا کے گھر لے آیا۔ اُس روز دکان کی چھٹی تھی اور حکم چند بھی گھر پر تھا۔ اس روز شوبھا نے بڑے پیار سے کھانا بنایا۔ اُس کے وہم دگمان میں بھی نہیں تھا کہ آج ایک انہونی سی بات ہو گئی ہے اور دریا خود پیاسے کے پاس چلا آیا ہے۔ گوتم کی ماں شوبھا کے ساتھ گوتم کے رشتے کی بات کرنے آئی تھی اور جب اُس نے شوبھا کی ماں اور حکم چند سے اس کا ذکر کیا تو دونوں کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔ یہ آنسو خوشی کے تھے کیونکہ شوبھا کو گوتم جیسا خوب صورت لڑکا ملے گا وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ شوبھا کی ماں دوڑ کر گئی اور اس نے بھگوان کی مورتی کے سامنے اپنا سر جھکا دیا۔

اور شوبھا اندر گھر کے کسی کونے میں لاج کی ماری چھپ گئی تھی۔ وہ دیر تک اپنے سر کو گھٹنوں پر رکھے بیٹھی رہی اور سوچتے سوچتے سچ مچ خوابوں کے ایک شاداب جزیرے میں پہنچ گئی۔ اُس کا شہزادہ سجا سنورا اُس کے سامنے کھڑا تھا اور اُس کی آرزوئیں پھول بن کر مسکرا اٹھی تھیں۔ وہ اپنے خواب سے اسی وقت جاگی جب گوتم نے چپکے سے اندر آکر پیالے سے اپنا ہاتھ اُس کے ہاتھ پر رکھ دیا تھا۔ مگر شوبھا نے مسکرا کر اپنا ہاتھ چھڑا لیا اور دوڑ کر آنگن میں ماں کے پاس آگئی

عورت ایک پہیلی

دیودت اپنا چھوٹا سا تحفہ ہاتھوں میں لئے، باہر کھڑی ہوئی بھیڑ کو چیرتا ہوا، اندر گھر میں پہنچ گیا۔ اندرا بڑے کمرے میں دلہن بنی عورتوں میں گھری بیٹھی تھی۔ اس نے اپنا تحفہ میز پر رکھے ہوئے دوسرے تحفوں کے درمیان رکھ دیا اور اندرا کو مسکرا کر مبارک باد دی۔ اندرا دلہن کے زرق برق لباس میں آسمان سے اتری ہوئی کوئی اپسرا معلوم دے رہی تھی اور اس کا چہرہ چاند کی طرح چمک رہا تھا۔ وہ دیودت کو دیکھ کر مسکرا دی اور دیودت باہر نکل آیا۔

بارات کے آنے میں ابھی دیر تھی، لیکن دیودت کا بارات کے آنے تک ٹھہرنے کا کوئی ارادہ نہ تھا۔ وہ اندرا کے باپ سے مل ہی چکا تھا اور اس نے اپنا تحفہ اندرا دے دیا تھا۔ اندرا کے ہونے والے شوہر پرکاش کو بھی اس نے دیکھ رکھا تھا، کیوں کہ وہ شادی سے پہلے اندرا کے گھر ایک دو دفعہ دیودت کی موجودگی میں آیا تھا۔ ویسے بھی ان کے ساتھ اس کی کوئی رشتے داری یا دوستی نہیں تھی، سوائے اس کے کہ وہ انہیں دو چار سال سے سرسری طور پر جانتا تھا اور پچھلے سال اس نے اندرا کو کوئی آٹھ نو مہینے ستار سکھایا تھا۔ آج اگر دیودت آیا تھا تو صرف یہ دیکھنے کے لئے کہ اندرا کے چہرے پر اس شادی کے تاثرات کیا ہیں۔ لیکن اس کی امید کے خلاف اندرا تو کسی اور دلہن کے مانند دلہن ہی لگ رہی تھی۔ مسرتوں میں نہایا ہوا

ایک چاند سا چہرہ، اور چاندنی جیسے اس کے سارے وجود پر برس رہی تھی۔ دیودت مشکل سے دو چار منٹ باہر ٹھہرا ہوگا اور پھر چلا آیا۔

واپس آکر وہ اپنے کمرے میں بیٹھ گیا اور سگریٹ سلگا کر سوچنے لگا۔ "شادی بھی کیا عجب شے ہے۔ وہی خوشیاں، وہی شور شرابہ، وہی باجے گاجے، وہی مسرت میں ڈوبی رہیں ـــــ اور وہ ری رسم و لاج کی ماری ہندوستانی عورت! شوہر چاہے بدصورت ہو یا بوڑھا، مگر شادی شادی ہے۔ وہی زرق برق لباس، وہی سج دھج اور وہی مسکراہٹوں کے دیئے۔"

"مگر" اس کی سوچ نے ایک کروٹ لی۔ "ان مسکراہٹوں کے پیچھے آنسوؤں کا طوفان بھی تو ہو سکتا ہے، جسے یہ لاج کی ماری دبائے بیٹھی ہو! یہ زرق برق لباس سلگتے ارمانوں، سسکیوں اور آہوں کا مدفن بھی تو ہو سکتا ہے۔"

اور دیودت یوں ہی بے معنی سی باتیں سوچتا رہا۔ اور ادھر بارات آئی۔ ایک ہنگامہ ہوا اور "دولہا" کو دیکھنے کے لئے بدستور ایک خلقت ٹوٹ پڑی۔ مسرتوں کا جیسے ایک سیلاب امڈ آیا ہو اور پھر آدھی رات کے سناٹے اور چپ چاپ جلتی ہوئی بجلی کی روشنیوں میں منڈپ کے نیچے اندرا کی شادی ہو گئی۔

اندرا شادی کے وقت کوئی ستائیس سال کی ہو گی۔ وہ اب بھی حسین تھی، مگر چند سال پہلے تو اس کے چہرے اور جسم میں ایک مسحور کن کشش تھی۔ جب اندرا کوئی اکیس سال کی تھی، تو اس نے ایم اے کر لیا تھا۔ وہ ذہین اور ہوشیار لڑکی تھی۔ لیکن اس کا باپ کچھ عجیب سے دماغ کا آدمی تھا۔ اس کا اندرا کے بارے میں یہ خیال تھا کہ یہ لڑکی غیر معمولی ذہانت اور قابلیت کی مالک ہے اور اس کا مقابلہ ملک بھر میں کوئی بھی لڑکی نہیں کر سکتی۔ اس نے خود ہی یہ کہنا شروع کر دیا تھا کہ اندرا شادی نہیں کرے گی کیوں کہ اس کے ہم پلہ کوئی آدمی نہیں ہے۔ اندرا پڑھائی کی تکمیل کے بعد، اکیس سے بائیس، بائیس سے تیئس اور تیئس سے چوبیس کی گھر میں ہو گئی اور اس اثنا میں وقت گزارنے کے لئے اس نے سینکڑوں کتابیں ادب اور فلسفے پر پڑھ ڈالی ہوں گی۔ ان

تین برس میں وہ کچھ موٹی بھی ہو گئی۔ بے کیف زندگی اور خشک کتابوں کے مطالعہ نے اس کی خوب صورتی پر بھی اثر ڈالا۔ اس کے مزاج میں خاصی سنجیدگی آگئی۔ پھر وہ ایک کالج میں لیکچرار لگ گئی، مگر اس کی شادی کے بارے میں باپ نے اب بھی کچھ نہیں سوچا۔ اور جب اندرا پچیس سال کی ہو گئی اور اس کی ماں اور دوسرے لوگوں نے زیادہ ہی کہنا شروع کر دیا تو اندرا کے باپ نے اتنا کہا کہ وہ اندرا کی شادی کسی ایسے ویسے کے ساتھ تو نہیں کرے گا لیکن اگر کوئی بہت قابل اور اعلیٰ عہدے پر فائز لڑکا مل گیا تو وہ اندرا کی شادی کر دے گا۔ اندرا کے باپ نے جو خود بھی ایک سرکاری افسر تھا کچھ ادھر ادھر کوشش بھی کی لیکن اب اس منزل پر کوئی اس قسم کا لڑکا ملا نہیں اور کسی اوسط درجے کے لڑکے کے لئے اندرا کا باپ تیار نہیں ہوا۔

اندرا کی عمر بڑھ ہی رہی تھی۔ بدن کچھ اور بھاری ہو گیا اور چہرے کی کشش اور کم ہو گئی اور اب اندرا کے لئے موجودہ زمانے میں اچھا لڑکا ملنے میں بھی دشواری آنے لگی۔ جب وہ ستائیسویں برس میں تھی تو دیودت ان کے گھر میں اندرا کو ستار سکھانے کے لئے آنے لگا۔ دیودت ان کے پڑوس میں ہی کسی کو کئی سال سے ستار سکھانے کے لئے آیا کرتا تھا اور وہ اندرا اور اس کے باپ کو بھی یہاں آنے کی وجہ سے کچھ جانتا تھا۔ اندرا کو میوزک کا شوق تھا۔ اور اس نے ایک روز اپنے باپ سے ستار سیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ اس نے دیودت سے بات کر لی اور دیودت اندرا کو سکھانے آنے لگا۔ وہ تقریباً اندرا کی ہی عمر کا ایک خوبصورت لڑکا تھا جس کی ابھی تک شادی نہیں ہوئی تھی۔ وہ ایم۔اے تھا اور ایک سرکاری دفتر میں ساڑھے تین سو روپے ماہوار پر ملازم تھا۔

یہ بات تو نہیں تھی کہ ستار سکھاتے سکھاتے دیودت اور اندرا کی محبت ہو گئی ہو، لیکن دیودت کو اندرا کئی لحاظ سے پسند آئی۔ اس کی سادگی، طبیعت کی سنجیدگی، چہرے کی معصومیت اور اس کی بنیادی قابلیت نے دیودت کو بڑا متاثر کیا۔ ویسے بھی جب سے دیودت اسے ستار سکھانے لگا تھا، اس کی وہ پرانی

خوب صورتی اور کشش جیسے لوٹنے لگی تھی۔ اندرا کا ردِّعمل دیودت کے بارے میں کیا تھا، یہ وہ نہیں جانتا تھا، کیوں کہ اندرا نے کبھی اسے ظاہر نہ ہوتے دیا۔ پھر دیودت یہ بھی جانتا تھا کہ اندرا کی شادی کہیں طے نہیں ہو پارہی تھی۔ وہ ایک ایسا انسان تھا جسے زندگی کی بنیادی قدروں اور ٹھوس حقیقتوں میں یقین تھا۔ اس نے اپنے ذہن اور تصوّر میں اندرا کو اپنی بیوی کے طور پر سوچا اور پھر اس شادی کے نفع اور نقصان کو تولا اور سب کچھ سوچ کر وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ وہ اندرا کے ساتھ خوش رہ سکے گا۔ شادی میں جہاں تک کسی قسم کے جہیز کا تعلق تھا، اسے نہ اُس کا لالچ تھا اور نہ کچھ ملنے کی توقع تھی، کیوں کہ اندرا کا باپ بارہا یہ اعلان کر چکا تھا کہ اس کی بیٹی اپنی خوبیوں کی بدولت لاکھوں روپے کی ہے اور وہ اس کی شادی بغیر کسی جہیز کے کرے گا۔ یہ سب کچھ سوچ کر اس نے ایک روز اندرا کے باپ کے ایک دوست سے جسے وہ خود بھی جانتا تھا اپنی اس خواہش کا ذکر کر ڈالا اور اس دوست نے اندرا کے باپ سے اس بات کا ذکر کرنے کا وعدہ کیا۔ مگر یہ بات الٹی ہی پڑی۔ اندرا کا باپ اس تجویز کو سن کر ایک تحقیر آمیز ہنسی ہنسا "کہاں اندرا اور کہاں ایک تین ساڑھے تین سو روپے ماہوار کا آدمی۔" دراصل اندرا کے باپ نے اس بات کا بُرا مانا اور اس نے ایک دو دن کے بعد ہی دیودت کو یہ کہلوا دیا کہ اندرا اب ستار نہیں سیکھے گی!

اس کے کوئی دو تین ماہ بعد جب دیودت کے پاس اچانک اندرا کی شادی کا کارڈ پہنچا۔ تو وہ حیران رہ گیا کہ اندرا کی شادی پرکاش سے ہو رہی تھی۔ پرکاش کسی سرکاری دفتر میں ڈپٹی ڈائرکٹر کے عہدے پر فائز تھا اور اس کے پاس اپنی کار بھی تھی لیکن وہ کسی بھی صورت میں چوالیس پینتالیس سے کم کا نہیں تھا۔ دیودت کو یاد آیا کہ اندرا اور اس کی بہنوں اور بھائیوں نے شروع میں پرکاش کو انکل کہہ کر بلایا تھا۔ پرکاش کالے رنگ کا ایک بھاری بھر کم جسم کا آدمی تھا، جس کے چہرے اور بالوں سے آئی ہوئی بزرگی صاف عیاں تھی۔ دیودت کی نظروں میں اس کی شخصیت میں کوئی بھی کشش نہیں تھی جو ایک نوجوان خوبصورت لڑکی کو کھینچ سکے۔

دیودت کو پتہ لگا کہ پرکاش ایک ایسے گھرانے سے تعلق رکھتا تھا جس کا بمبئی میں بڑا بزنس تھا۔ وہ یہاں کار کے علاوہ ایک کوٹھی کا مالک تھا اور اس کے پاس اپنا لاکھوں روپیہ تھا۔ اس نے اندرا کو قبول کرتے ہوئے ایک قیمتی ہیرے کی انگوٹھی نہ صرف اندرا کو دی تھی بلکہ ایک ایک ہیرے کی انگوٹھی اپنی سالیوں کو بھی دی تھی۔ خیال تھا کہ وہ شادی میں اندرا کو اتنا زیور چڑھائے گا کہ لوگ حیران رہ جائیں گے۔ ویسے بھی وہ بہت پڑھا لکھا آدمی تھا اور ولایت اور یورپ ہو آیا تھا۔ اندرا کے باپ کی یہ باتیں سن سن کر اس کے دوست اسے مبارک باد دے رہے تھے کہ وہ اندرا کے لئے اتنا اچھا "لڑکا" پانے میں کامیاب ہوا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی کچھ چہ می گوئیاں بھی ہو رہی تھیں۔ کچھ لوگ کہتے تھے کہ پرکاش کی یہ دوسری شادی ہے اور اس کی بیوی کوئی سات سال ہوئے مر گئی تھی جس سے ایک لڑکی ہے جو نینی تال میں پڑھ رہی ہے، کچھ کا کہنا تھا کہ پرکاش کی دو شادیاں پہلے ہو چکی ہیں اور ایک کو اس نے چھوڑ دیا تھا اور دوسری خود بھاگ گئی تھی۔

"یہ تو سب ٹھیک ہے۔" دیودت نے سوچا، مگر شادی کیا صرف جگمگاتی خیرہ کن روشنیوں، زرق برق لباسوں، زیورات کی چمک، بے ہنگم شور اور موسیقی کا ہی مجموعہ ہے، کیا یہ دو دلوں کا ملاپ اور ارمانوں کا سنگم نہیں ہے؟ کیا صرف کار، کوٹھی اور دولت سے کسی کی روح کی پیاس بجھ جائے گی؟ بھڑکتے جذبات اور ارمانوں کی آگ کیسے سرد ہو گی؟ رگ رگ میں لپکتے دوڑتے جوانی کے شراروں کا کیا ہوگا؟"

دیودت یہ سب کچھ بے زاری اور شکست خوردگی کے عالم میں نہیں سوچ رہا تھا۔ اندرا سے تو اسے صرف ایک ہمدردی تھی اور اسی ہمدردی کے جذبے کے تحت، اور کیوں کہ اندرا ایک اچھی لڑکی تھی، وہ اندرا سے شادی کرنے کے لئے تیار ہو گیا تھا۔ اس کے اپنے لئے تو ایک سے ایک اچھی لڑکی کا رشتہ آ رہا تھا۔ ہاں وہ نفسیاتی طور پر یہ جاننے کا ضرور خواہش مند تھا کہ اندرا پر اس شادی کا ردِ عمل کیا ہو گا۔ اندرا کے باپ کے کہنے کے مطابق اندرا خوشی سے پرکاش سے شادی

کر رہی تھی، کیوں کہ وہ ایک نوجوان "ناپختہ" لڑکے کی بجائے ایک سمجھ دار، سنجیدہ آدمی سے شادی کرنے کی آرزو مند تھی۔ مگر دیودت کو یقین تھا کہ چونکہ اندرا ضرورت سے زیادہ باپ کے زیرِ اثر تھی، اس لئے اس رشتے کی منظوری میں باپ ہی کا سب سے بڑا ہاتھ تھا۔

مگر نہیں، اندرا تو زیورات سے لدی، زرق برق کپڑوں میں ملبوس وہی جانی پہچانی دلہن تھی اور اس کے چہرے پر شادی کی تمام دلی مسرتوں کا وہی جمکیلا ہالہ تھا یا شاید وہ حقیقی ردّعمل کو جاننے کے لئے وقت سے بہت پہلے پہنچ گیا تھا!

تین چار مہینے بعد کی بات ہے۔ اس اثنا میں اندرا کئی دفعہ میکے آئی بھی اور چلی بھی گئی۔ دیودت نے اب اس کے پڑوس میں بھی ستار سکھانا چھوڑ دیا تھا، اس لئے کسی سے کوئی ملاقات نہ ہو سکی۔ ایک اتوار کو شام کے چار پانچ بجے اس نے اندرا کی کوٹھی پر جانے کا ارادہ کیا۔ پتہ اسے معلوم ہی تھا۔ وہ بس میں بیٹھ کر وہاں پہنچ گیا۔ یہ ایک شان دار کوٹھی تھی اور اندرا، پرکاش اور ایک دو اور آدمیوں کے ساتھ باہر ہی لان میں بیٹھی تھی۔ وہ جھجکتے جھجکتے داخل ہوا۔ اندرا اسے دیکھتے ہی کرسی سے اٹھ کر اس کی طرف بڑھی اور اسے لے آئی۔ یہ لوگ کافی پہلے سے ہی پی رہے تھے۔ اندرا نے کافی کی ایک پیالی دیودت کو بھی دی۔ وہ کوئی پندرہ منٹ وہاں بیٹھا ہو گا۔ اس عرصے میں اس نے اندرا کی طرف کئی بار دیکھا۔ اندرا کے چہرے پر کسی نئی شادی شدہ عورت کی مانند بے حد رونق تھی۔ وہ اس وقت ایک سفید قیمتی ساڑی اور بغیر آستینوں کے سفید مہین بلاؤز میں بہت دل کش لگ رہی تھی۔ جیسے کسی گلشن میں بہت سے بیلے کے پھول کھلے ہوں۔ اس نے اپنے چہرے پر نہایت اعلیٰ میک اپ کر رکھا تھا۔ سادگی اور معصومیت کی جگہ سنگار اور آتشی لپک نے لے لی تھی۔ دیودت کو ایسا محسوس ہوا کہ اس کی نظروں میں ایسے شعلے تھے کہ وہ جدھر دیکھتی تھی ایک آگ سی لگ جاتی تھی۔ اس کے چہرے پر اداسی یا پچھتاوے کا نام تک نہیں تھا۔ بلکہ وہ ہر لحاظ سے فاتح اور کامران نظر آ رہی تھی۔ اس کی آواز میں ایک دل آویز کھنک

تھی اور وہ بار بار ایک دل فریب مسکراہٹ کے ساتھ پرکاش کی طرف دیکھ رہی تھی۔
دیودت گھر واپس پہنچا تو سگریٹ سلگا کر پھر سوچنے لگا، "اس دیس میں ہر شادی کتنی کام یاب ہے!"
"لیکن" اس کی سوچ نے پھر کروٹ لی، "یہ ہندوستانی عورتیں سینے میں اپنے غم کو چھپائے رکھیں گی اور دوسروں پر اسے کبھی ظاہر نہ ہونے دیں گی۔ شادی ایک ایسا ہی حسین فریب ہے۔"
"ویسے۔" اس نے پھر سوچا۔ "میں اندرا کے چہرے پر ان تاثرات کو پڑھنے شاید پھر وقت سے بہت پہلے پہنچ گیا تھا۔ پھر پرکاش کو ابھی بوڑھا بھی تو نہیں کہا جا سکتا۔ کئی سال کی جوانی تو اس میں ابھی ہوگی، اور پھر دولت بھی تو ایک قسم کی جوانی ہی ہے جس میں نشہ اور طاقت جوانی سے کہیں زیادہ ہے۔ اور ایک عورت کے لئے تو خاص طور پر!"
اس کے بعد اسے اندرا کئی مہینوں کے بعد ملی۔ وہ دیپک ہوٹل کے سامنے اپنے جوتوں پر پالش کرا رہا تھا کہ اندرا نے اس کے قریب آکر اسے "ہیلو" کہا۔ پرکاش اس کے ساتھ تھا۔ دونوں شاید ہوٹل سے نکلے تھے اور اب سامنے پارک کی ہوئی اپنی کار کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اندرا کے چہرے پر پہلے سے بھی زیادہ رونق تھی۔ اس کے گلے میں سچے موتیوں کا ایک سفید ہار جھلملا رہا تھا۔ اس کے یاقوتی ہونٹ گلاب کی دو ایسی پنکھڑیاں لگ رہے تھے، جنہیں کاٹ کر ہونٹوں کی شکل بنا دیا گیا ہو۔ جہاں اندرا کی آنکھوں میں شباب اور جوانی کے شرارے تیر رہے تھے وہاں پرکاش کچھ زیادہ بوڑھا لگ رہا تھا اور اس کے چہرے پر بسیرا کرنے والی سنجیدگی میں ایک اداسی سی گھلی ملی تھی۔ اندرا مشکل سے کچھ لمحے رکی ہوگی دیودت سے "کبھی آئیے" کہہ کر وہ سڑک پار کر گئی۔ اس نے پرکاش کا بازو تھام رکھا تھا اور دیودت کو ایسا محسوس ہوا کہ وہ کسی اڑن کھٹولے میں سفر کر رہی تھی!
"کاش میں اندرا کے دل میں جھانک سکتا" اس نے وہیں کھڑے کھڑے

سوچا۔" کیا اس کے دل میں بھی مسرتوں کے وہی ڈیرے ہیں جو اس کے چہرے کی تابانی سے عیاں ہیں۔"

دیودت کی اٹھائیسویں سال گرہ اس کے لئے کئی خوشیاں لے آئی۔ اسے دفتر میں ترقی بھی مل گئی اور اس کی شادی بھی ہوگئی۔ وہی باجے گاجے، وہی شور اور ہنگامہ اور وہی بے ہنگم موسیقی اور دو روحوں کا ملاپ ہوگیا۔ اس کی بیوی کانتا کوئی تئیس سال کی حسین لڑکی تھی۔ دیودت خود بھی خوب صورت تھا۔ اس حسین جوڑے کو ہر طرف سے خوب مبارک باد ملی۔ شادی کیا ہوئی، زندگی میں ایک عجیب ہی مسرت بھر گئی۔ ان دونوں کے لمحے لمحے میں قوس قزح کے رنگ بھر گئے۔ ایک روز جب کانتا اس کے سامنے بیٹھی تھی اور وہ چند خوش آگیں تصورات میں ڈوبا ہوا اس کے حسین چہرے کو تک رہا تھا تو وہ سوچنے لگا، "اگر میں کانتا سے پندرہ بیس سال بڑا ہوتا تو بھی کیا شادی اتنی ہی حسین ہوتی۔ شاید نہیں، اور شاید ہاں۔ شادی بھی کیا جادو ہے!" اور اس کے ساتھ ہی وہ مسکرا دیا۔

کانتا نے پوچھا، "کیا سوچ رہے ہیں؟"

"یہی کہ تم کتنی حسین ہو، دنیا کتنی رنگین ہے، شادی کتنی اچھی ہے۔"

اس کے بعد کچھ ایسا اتفاق ہوا کہ دیودت کو اندرا کہیں نظر نہ آئی۔ دراصل دونوں کی زندگیاں، سطح اور راستے اتنے مختلف تھے کہ جب تک دیودت ارادہ کر کے ہی اندرا کی کوٹھی پر نہ جائے، اِدھر اُدھر ملنے کا موقع کم ہی تھا۔ اندرا اس کی شادی پر بھی نہیں آئی تھی۔ اسی طرح کوئی دو سال گزر گئے ہوں گے۔ پھر ایک روز جب دیودت کے ساتھ کانتا بھی تھی، ایک سینما شو کے ختم ہو جانے پر نکلتی ہوئی بھیڑ میں دیودت کو اوپر سے اترتی ہوئی اندرا نظر آگئی۔ اس کے ساتھ پرکاش اور پرکاش کا وہ دوست بھی تھا جو دیودت کو اندرا کی کوٹھی پر ایک دفعہ پہلے بھی نظر آیا تھا۔ پرکاش کچھ زیادہ کم زور اور بجھا بجھا سا تھا اندرا کچھ زیادہ جوان زیادہ شاداب نظر آرہی تھی۔ اس نے بہت ہی بھڑکیلے اور جذبات کو اکسا دینے

والے کپڑے پہن رکھے تھے۔ دیودت ذرا پیچھے رک گیا اور اس طرح وہ لوگ اس کے آگے آگے باہر نکل گئے۔

وہ گھر آ کر سوچنے لگا، "عورت بھی عجیب پہیلی ہے۔ بظاہر کتنی خوش اور باطن میں ۔۔ لیکن باطن کی بات کسے معلوم ہے۔ اُف یہ شادی بھی کیا جادو ہے یا شاید یہ بھی ایک پہیلی ہے!"

پھر کچھ عرصے کے بعد جب دیودت کے یہاں ایک لڑکے نے جنم لیا تو دیودت کو اندرا کا خیال آیا۔ اس کے ابھی تک کوئی بچہ نہیں ہوا تھا۔ ویسے یہ شاید کوئی ایسی اہم بات نہ تھی، یا شاید ہو۔ کچھ وقت اور گزر گیا اور پھر دیودت کو پتہ لگا کہ پرکاش اپنی کسی بیماری کے علاج کے لئے ولایت گیا ہوا ہے، مگر اندرا ساتھ نہیں گئی تھی۔ یہ بات اسے کچھ عجیب سی لگی۔ ایک جگہ یہ بھی سننے میں آیا کہ اندرا اور پرکاش کی آپس میں کچھ ناچاقی بھی ہو گئی ہے۔

کچھ ہی دنوں کے بعد دیودت کو اندرا کچھ عجیب سے حالات میں نظر آئی۔ وہ اور کانتا کچھ شاپنگ کرنے کے بعد دیپک ہوٹل کے سامنے سے گزر رہے تھے۔ رات کے کوئی نو بجے ہوں گے کہ اچانک ایک جوڑا لڑکھڑاتا ہوا دیپک ہوٹل سے باہر نکلا۔ یہ اندرا تھی۔ مگر اس کے ساتھ اس کے شوہر کی بجائے شوہر کا وہ دوست تھا جسے دیودت نے کئی بار ان کے ساتھ دیکھا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان دونوں نے کافی پی رکھی تھی۔ اندرا نیم عریاں مغربی لباس پہنے ہوئے تھی اور اس کے چہرے پر پہلی مرتبہ بے زاری اور وحشت چھائی ہوئی تھی۔ انہیں سنبھالے ہوئے کوئی اور آدمی تھا۔ دیودت نے باہر کھڑے ہوئے ہوٹل کے ایک بیرے سے پوچھا کہ یہ کیا معاملہ ہے تو وہ بولا، "صاحب اور میم دونوں نے پی رکھی ہے۔ ادھر دونوں ایک دوسرے کی بغل میں ہاتھ دیئے ناچ رہے تھے کہ ایک اور صاحب نے میم کو کچھ چھیڑ دیا۔ بس جھگڑا ہوتے ہوتے بچا ہے۔ ہمارا اسسٹنٹ منیجر انہیں ٹیکسی تک چھوڑنے جا رہا ہے۔ یہ میم جب کبھی آتی ہے

کوئی نہ کوئی اسے چھیڑ دیتا ہے۔"

اندرا اور وہ آدمی سامنے ٹیکسی میں بیٹھ چکے تھے۔ دیودت کی نظروں کے سامنے چھ سال پہلے کا وہ دن بیت گیا جب باجوں گاجوں، شور شرابے اور بے ہنگم موسیقی کے درمیان ایک ضدی باپ نے اپنی معصوم اور اچھی بیٹی کو دولت کی چمک سے مرعوب ہو کر ایک ایسے شخص کے حوالے کر دیا تھا جو شوہر کی بجائے اس کا چچا ہو سکتا تھا وہ سوچ میں ڈوبا ہوا وہیں کھڑا ہو گیا۔ اب بھی اس کی نظروں کے سامنے زرق برق کپڑوں میں ملبوس اور زیورات سے لدی اندرا عورتوں کے درمیان دلہن بنی بیٹھی تھی اور اس کا چہرہ چاند سا چمک رہا تھا۔

کانتا بولی۔" چلئے نا! کیا سوچ رہے ہیں ؟"

" کچھ نہیں۔ چلو جلدی سے، کبھی بس نہ نکل جائے۔ دیپ جاگ گیا ہو گا تو ماں جی کو پریشان کر رہا ہو گا۔"

" کیا آپ اس عورت کو جانتے تھے ؟"

" ہاں کچھ کچھ۔ گھر چل کر تمہیں بتا دوں گا۔ آج مجھے ایک پہیلی کا جواب مل گیا جو برسوں سے مجھے پریشان کر رہی تھی۔ بس جیسے کسی نے آج میرا کانٹا یا پھانس نکال دی ہو۔ لو جلدی چلو۔"

اور وہ دونوں تیزی سے بس کے اڈے کی طرف بڑھے لیکن کانتا سوچنے لگی " یہ کیا ماجرا ہے، ان کا اس عورت سے کیا تعلق تھا، کیسا کانٹا اور کیسی پھانس ؟"

تین چہرے تین تاثر

بس سہ پہر کے وقت لمپا پہنچ گئی اور میں سب سے پہلا مسافر ہوں گا جو فوراً اُتر پڑا۔ جنگلات اور پہاڑیوں میں سے ہوتا ہوا یہ سو میل کا راستہ بڑا تھکا دینے والا ثابت ہوا اور جس وقت میں اُترا تو میری اور گرد اور دھول میں لٹے ہوئے بس کے پہیوں کی حالت ایک ہی تھی۔ اندرونی طور پر شاید میں بدتر محسوس کر رہا تھا کیونکہ جہاں پہیئے گھومتے رہے تھے وہاں میں اپنی ٹانگیں پیٹ سے جوڑے رہا تھا۔ میں نے جلدی سے اپنا سوٹ کیس اور بستر اُتروایا اور ایک مزدور کے سر پر رکھوا کر اپنے ہوٹل کی طرف روانہ ہو گیا۔ مجھے زیادہ نہیں چلنا پڑا۔ کیونکہ ہوٹل سامنے نظر آنے والی پہاڑی پر ہی تھا، مگر یہ چھوٹا سا راستہ بھی بالکل بے کیف اور سنسان تھا بس سے اُترے ہوئے مسافروں میں سے کوئی بھی ہمارے ساتھ نہیں آ رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا لمپا گاؤں کی آبادی کسی سمت ہماری پُشت پر تھی اور مسافر اپنا اپنا سامان پیٹھ پر لاد کر اُسی سمت روانہ ہو گئے تھے۔

ہوٹل اندر سے کافی ٹھنڈا تھا، بل کلرک یا منیجر باہر برآمدے میں ہی ایک معمولی سی میز کرسی لگائے بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے میرے قدموں کی آواز سُنتے ہی نظریں اُٹھائیں اور مسکرا کر ہندوستانی میں میرا خیر مقدم کیا۔ وہ ایک

چھوٹے قد مگر گٹھیلے جسم کا خوبصورت جوان تھا، جس کے سبب جیسے سُرخ اور گول گالوں کے نیچے تراشی ہوئی مونچھوں کی ایک بھوری لکیر تھی وہ ایک معمولی سا ٹھنڈا کوٹ پہنے ہوئے تھا اور کافی چُست تھا۔ میں نے ہوٹل کے رجسٹر میں دستخط کیے اور منیجر نے دستخط کو غور سے دیکھا اور پڑھ کر بولا " مسٹر قاسم علی ۔۔۔ اوہو آپ کالمپونگ کے رہنے والے ہیں۔"

" ہاں ۔۔۔ مگر اب وہاں نہیں رہتا۔"

منیجر نے غور سے مجھے نیچے سے اوپر تک دیکھا اور مجھے محسوس ہوا کہ وہ شاید مجھ سے اب کچھ اور سوال پوچھے گا یا کوئی اِدھر اُدھر کی بات موسم یا سفر کے بارے میں کرے گا۔ مگر اُس نے ایسی کوئی بات نہیں کی۔ اُس نے مجھ سے پوچھا کہ کیا میں نے دوپہر کا کھانا کھالیا تھا اور میرے نہ کرنے پر اُس نے بتایا کہ ہوٹل کے کچن میں تو اب کچھ نہیں رہا تھا، مگر وہ میرے غسل کرنے کے بعد کچھ نہ کچھ انتظام کر دے گا۔ اس کے بعد اُس نے زور سے آواز دی۔ " لاچو، لاچو" اور ایک نوکر اندر سے نکلا اور منیجر نے اُسے میرا سامان چار نمبر کمرے میں لے جانے کا حکم دیا۔

یہ کمرہ کچھ عجیب سا تھا۔ نہ مستطیل نہ مربع۔ یہ ایک تکون سے زیادہ مشابہ تھا۔ اس میں دو کھڑکیاں تھیں۔ ایک میں سے لمبا کی مشہور پہاڑی نظر آتی تھی اور دوسری میں سے ایک چھوٹا سا عبادت خانہ جس کو اس وقت دیکھ کر یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ مندر تھا یا گرجا۔ کیوں کہ اس کے اوپر کوئی بھی ایسا واضح نشان نہیں تھا۔ اس عبادت خانے کے پس منظر میں ایک بہت ہی اونچی نوکیلی پہاڑی تھی جو حد نظر تک ہرے ہرے کانٹے دار درختوں سے چھپی ہوئی تھی۔

میں نے اپنے چہرے اور ہاتھوں کی گرد کو دھویا اور اپنے کپڑے بدل کر باہر آگیا اب منیجر کے ساتھ ہوٹل کا مالک بھی بیٹھا ہوا تھا۔ وہ چھلے ہوئے چقندر کی طرح سُرخ، چپٹی ناک والا اور بھاری بھرکم آدمی تھا۔ اس کے کپڑے اس کے منیجر کی طرح ہی معمولی تھے۔ مگر اُس کی مونچھیں گھنی اور کونوں پر سے نیچے گری ہوئی

تھیں۔ منیجر نے میرا تعارف اس سے کرایا اور وہ یہ کہہ کر میرا کھانا چند منٹ میں تیار ہو جائے گا چلا گیا۔ میں نے ایک سگریٹ سلگایا اور ایک منیجر کو بھی پیش کیا ایک کش لگاتے ہوئے میں نے اُس سے پوچھا "تمہارا نام کیا ہے؟"

"سوما۔"

"سوما! ___ تو کیا تم لمبی نہیں ہو؟"

"لمبی ہی ہوں مگر لاڈینی۔"

تہذیب و تمدن سے دُور اس علاقے میں بھی ذات پات کی تمیز تھی۔ لمبی یہاں کے اصلی باشندے تھے اور لاڈینی باہر سے آکر بسے ہوئے لوگ تھے جو عام طور پر مزدوری کرتے اور بکریاں پالتے تھے۔ لمبی اپنے آپ کو اُن سے اونچا سمجھتے تھے اور اپنی رشتہ داریاں ان میں نہیں کرتے تھے۔ میں حیران ہوا کہ سوما لاڈینی ہوتا ہوا بھی ہوٹل کا منیجر تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا وہ باہر کافی گھوما ہے اور کچھ پڑھ لکھ گیا تھا۔ میں نے اُس سے پوچھا "سوما تمہیں یہاں کتنی تنخواہ ملتی ہے؟"

"تیس کویاں اور کھانا۔"

ایک کویاں تقریباً ایک روپے کے برابر تھا۔ میں نے قدرے حیرانی سے کہا۔ "یہ تنخواہ تو ایک منیجر کے لئے بہت کم ہے۔"

"میں منیجر تو نام کا ہوں۔ بس جو آتا ہے اس کا پتہ رجسٹر میں نوٹ کرکے کمرہ دے دیتا ہوں اور کوئی خاص کام نہیں ہے۔"

"اس سے پہلے تم کیا کرتے تھے؟"

"میں بیرا تھا۔ کالمپونگ میں کافی عرصے رہا۔ کلکتے، برما اور چیٹا گانگ میں بھی رہا ہوں۔"

"او ہو چیٹا گانگ بھی رہے ہو۔ خاص چیٹا گانگ میں؟"

"اس کے پاس ایمن پور میں۔"

"ایمن پور میں! سچ؟"

" جی ہاں میں وہاں دو سال رہا۔ اس کی گلی گلی میں گھوما ہوں۔"

" میری بیوی ایمن پور کی تھی سوما۔"

" اچھا ۔۔۔ تب تو آپ ہمارے اپنے آدمی نکلے۔"

میں نے بات آگے نہیں بڑھائی کیونکہ مجھے بھوک لگ رہی تھی۔ سوما سمجھ گیا اور اُس نے خود ہی انگلی سے پیچھے کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے دیکھا کہ اندر کمرے میں ایک لاڈینی لڑکی میز پر کھانا لگا رہی تھی۔ اس نے ایک رنگین قمیص کے نیچے ایک رنگین تہمد باندھا ہوا تھا اور ہاتھوں میں لاکھ کے سرخ کڑے تھے جو ہر لاڈینی عورت پہنتی تھی۔ وہ ننگے پاؤں ایک بلی کی سی خاموشی اور مصروفیت کے ساتھ اپنا کام کر رہی تھی۔ کھانا لگا کر وہ لڑکی غائب ہو گئی اور میں اب اندر جا کر کھانا شروع کر سکتا تھا۔ میں فوراً جا کر بیٹھ گیا اور پہلے میں نے ایک بھوکے چوہے کی طرح ہر چیز کو دیکھا اور سونگھا۔ مجھے ذرا سا افسوس ہوا کہ شہد، پھلوں اور میٹھی مکئی والے اس علاقے میں بھی مجھے ڈبل روٹی، اُبلے ہوئے انڈے اور گوشت ہی کھانے کو ملا۔ چونکہ مجھے بھوک بہت لگی ہوئی تھی۔ میں نے اُسے جلد جلد ختم کیا۔ بہرحال کافی بہت عمدہ تھی۔ میں کھانے سے فارغ ہو کر سیدھا اپنے کمرے میں جا کر لیٹ گیا۔

میں کافی دیر سوتا رہا ہوں گا کیوں کہ جب سوما میرے کمرے میں آیا تو بالکل اندھیرا ہو چکا تھا اور وہ چراغ جلا رہا تھا۔ میں نے اُسے کرسی پر بیٹھنے کو کہا۔ سوما نے میرا شکریہ ادا کیا اور اپنے پیکٹ میں سے مجھے ایک سگریٹ پیش کیا۔ اور ایک خود سلگایا۔ میں نے پوچھا " سوما کیا تمہارے ہوٹل میں یہی کھانا ملتا ہے۔"

" کیا آپ کو پسند نہیں آیا" اس نے حیرانی سے پوچھا " خیر رات کو آپ کو بہت اچھا کھانا ملے گا۔"

" نہیں یہ بات نہیں۔ میری خواہش تھی کہ لمبا میں لمبی کھانا کھاؤں۔ یعنی کالی مکی کی روٹی، اس پر مکھن کی تہہ، کلفے کا ساگ، کالی مرچ اور یہاں کی بیر۔"

" اوہو" سوما نے مسکرا کر کہا " تو یہ بات ہے۔"

اور یہ کہتے ہی اس نے زور سے کسی کو آواز دی اور وہی خادمہ داخل ہوئی جس نے میرا کھانا لگایا تھا۔ سوما نے لمپی بولی میں جلد جلد اسے کچھ کہا اور وہ مسکرا کر نکل گئی اور اس کے کوئی دو گھنٹے بعد میں نے اپنی پسند کا لمپی کھانا مزے لے لے کر کھایا اور بیئر بھی پی۔ ظاہر تھا کہ یہ کھانا سوما نے اپنے یا کسی کے گھر سے خاص طور پر میرے لئے منگوایا تھا۔

کھانے کے بعد میں سوما کے ہمراہ کمرے سے باہر نکلا۔ کنارے کے ایک کمرے میں کچھ شور ہو رہا تھا۔ ہم دونوں اندر گئے۔ میں نے دیکھا کہ کچھ لمپی ایک میز پر جھکے ہوئے سیاہ کوڑیوں کو ہاتھ سے پھینک کر جوا کھیل رہے تھے۔ ان لوگوں نے غور سے میری طرف دیکھا مگر اپنا کھیل کھیلتے رہے۔ یہ ہندوستانی نہیں سمجھتے تھے اور سوما نے مجھے بتایا کہ لمپی عام طور پر جوئے کے عادی ہیں اور یہ جوا ان کی سماجی اور مذہبی رسوم کا ایک حصہ بن چکا ہے۔ اس نے یہاں تک بتایا کہ یہ لوگ جوئے میں اپنی لڑکیاں تک ہار جاتے ہیں اور اسے برا نہیں سمجھتے بشرطیکہ جیتنے والا اس لڑکی سے شادی کر لے۔ میں غور سے چند منٹ تک یہ کھیل دیکھتا رہا۔ یہ ہندوستان میں کوڑیوں سے کھیلے جانے والے چوپڑ یا لکڑی کے ایک کھڑے تختے پر کوڑیاں مار کر کھیلے جانے والے جوئے سے ملتا ہے۔ اگرچہ بالکل ویسا نہیں ہے۔ دراصل یہ جوا شمالی تبت کا ہے اور اُدھر کے ایک لمبے دورے کے دوران مجھے اسے کھیلنے کا اتفاق ہوا تھا۔ میں اس کی رموز اور چالوں تک سے واقف تھا۔ میں نے چند ہی منٹ میں دیکھ لیا کہ یہ لوگ اگرچہ کافی مشاق ہیں مگر اس کی گہری چالوں سے واقف نہیں ہیں اور میرے لئے ان کو ہرانا معمولی بات تھی۔ مگر مجھے نہ پیسہ چاہیئے تھا اور نہ میں وقت ضائع کرنے کے لئے آمادہ تھا۔ میں تھوڑی دیر ویسے ہی دلچسپی سے دیکھتا رہا اور پھر سوما کے ساتھ باہر آ گیا۔

میرا پروگرام لمپا میں کوئی سات روز رہنے کا تھا۔ میں لمپا کی ایک ایک چیز اُس کے باشندوں کے خصائل، تہوار اور رسوم کے بارے میں جاننا چاہتا تھا۔

میں نے سوما سے کہا کہ وہ اپنے فالتو وقت میں مجھے یہاں کی سیر کرائے اور اس کے ہمراہ میں یہاں کافی گھوما پھرا۔ میں نے سوما کو بہت ہی دلچسپ آدمی پایا اور میں نے احساس کیا کہ اگر لمپیا میں سوما نہ ملتا تو میری سیر ادھوری اور بے مزہ رہتی۔

تیسرے دن کی بات ہے۔ سوما دن ڈھلے میرے پاس آیا اور کہنے لگا کہ میں آپ کو ایک لمپی کے گھر لے جاؤں گا جو میرا واقف کار ہے۔ میں نے اُسے دو بیئر کی بوتلیں لانے کے لئے کہا اور ہم نے ایک ایک بوتل پی۔ یہاں کی بیئر بڑی تیز ہوتی ہے اور ایک بوتل دو بلکہ تین بوتلوں کی تسکین پہنچاتی ہے۔ ہم دونوں بیئر کی ہلکی ہلکی گرمی لیئے باہر نکلے۔ سوما نے خادمہ کے کان میں کچھ کہا اور ہم نیچے اُتر آئے۔ چاروں طرف شام کا گہرا دھندلکا پھیلا ہوا تھا اور پہاڑیوں پر سے اُترتا ہوا اندھیرا تیزی سے بڑھ رہا تھا۔ آسمان میں چند تارے بھی پھوٹ آئے تھے اور ایک پھیکا سا چاند دُور کونے میں لٹکا ہوا تھا۔ ہم دونوں جھومتے ہوئے سامنے کی پہاڑی پر چڑھ گئے اور پھر گیدڑوں کی طرح دبکے دبکے جھاڑیوں میں پھنستے پھنساتے نیچے اُترے۔ یہاں دامن میں چند جھونپڑیاں تھیں جن کے اندر تیل کی کپیاں روشن تھیں اور جن کے دہانوں میں سے دھواں باہر نکل رہا تھا۔ سوما اور میں ایک پگڈنڈی پر ہو لیئے اور شاید ہم دو کوس سے زیادہ چلے ہوں گے کہ ایک بڑے گاؤں کی کانپتی ہوئی روشنیاں گہری تاریکی میں بجھتے اور جلتے جگنوؤں کی طرح چمکیں۔

سوما ایک درخت کے سہارے کھڑا ہو گیا۔ اتنا چلنے سے ہمارا بیئر کا سرور ختم ہو چلا تھا آسمان تاروں سے بھر چکا تھا۔ چاند اب اوپر کھسک آیا تھا اور آسمان کی کنواری گوری بن کر چمک رہا تھا۔ سوما نے سگریٹ کا پیکٹ نکالا اور ہم دونوں نے سگریٹ سُلگائے۔ سوما بولا "جس لمپی کے گھر ہم جائیں گے وہ یہاں کا سب سے بڑا جوئے باز ہے اس کا نام باز بیر دہے ہے اور وہ لاڈ بٹیوں سے نفرت کرتا ہے۔"

"تو تمہیں اس کی کیا پروا ہے۔" میں نے بیئر کے ہلکے سرور میں کہا۔

"اس کی ایک نوجوان لڑکی ہے اور وہ بڑی خوبصورت ہے" یہ کہہ کر سوما

مسکرا کر میری طرف دیکھنے لگا اور بولا "اس کا نام شانتی ہے اور میں اس سے محبّت کرتا ہوں۔"

سوما نے تیرتے ہوئے چاند کی طرف دیکھا اور میں نے محسوس کیا کہ اس کی آنکھوں میں محبّت کی چمک تھی۔ میں نے اسے بازو سے پکڑا اور ہم آگے بڑھ گئے سوما نے ایک مکان پر دستک دی جو پتھروں کا بنا ہوا ایک اچھا بڑا مکان تھا۔ دروازہ کھلتے ہی سوما اندر گھس گیا اور اس نے مجھے آنے کو کہا۔ ایک لمبی ڈیوڑھی والا یہ ایک خاصا بڑا اور سجا سجایا کمرہ تھا۔ بیچ میں ایک بہت بڑی میز تھی جس کے گرد پانچ آدمی بیٹھے ہوئے جوا کھیل رہے تھے۔ میرے دیکھتے ہی ایک ادھیڑ عمر کا تنومند شخص اُٹھ کر آگے بڑھا۔ سوما بولا "یہ میرے دوست مسٹر قاسم علی ہیں۔ کالمپونگ سے آئے ہیں ___ اور یہ ہیں بازبیرو میرے دوست۔"

"ہیلو مسٹر قاسم علی" بازبیرو نے مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا اور مجھے خوشی ہوئی کہ بازبیرو بھی ہندوستانی اور شاید انگریزی جانتا تھا۔ اس نے مجھے ایک کرسی پر بیٹھنے کو کہا اُس کے بعد اُس نے پاس رکھے ایک بڑے شیشے کے جام میں سے ایک گلاس میں بیئر انڈیلی اور مجھے پیش کی۔ میں نے شکریہ ادا کیا مگر میں یہ دیکھ کر بڑا حیران ہوا کہ اس نے سوما کو بیئر پیش نہیں کی۔

سب لمبی مجھے حیرانی سے دیکھ رہے تھے، انہوں نے اپنا کھیل روک لیا تھا اور کوڑیاں اُن کی ہتھیلیوں میں بند تھیں۔ میں نے کہا "آپ سب کھیلیں۔ ہم دیکھیں گے۔"

"آپ کو کھیلنا پسند ہے؟" بازبیرو نے پوچھا۔

"کچھ کچھ!"

"تو آئیے۔"

"مگر میں ایک سے کھیلوں گا اگر آپ سب کا مزہ کرکرا نہ ہو تو صرف آپ مجھ سے کھیل لیں۔ مگر ٹھہریئے میرے پاس تو صرف سو پچاس کوڑیاں ہوں گے۔"

"تو ایک دو بازی ہی سہی چونکہ آپ مہمان ہیں اس لئے میں کوڑی دوسری منگواتا ہوں۔"

بازبیرد نے زور سے آواز دی اور اندر سے ایک لڑکی آئی۔ یہ بلاشبہ شانتی تھی۔ کیوں کہ اس کے آنے سے کمرے میں ایک بجلی سی کوند گئی تھی۔ اور ستوما کی آنکھیں سب سے زیادہ چندھیائی رہتیں۔ وہ ایک تنگ کسی ہوئی چولی اور نیچے ایک گہرے سیاہ رنگ کا تہمد پہنے ہوئے تھی۔ چولی اور تہمد پر بڑے بڑے سفید ستارے ٹنکے ہوئے تھے اور اس پس منظر میں اس کا چہرہ کسی تاروں بھری رات کا مہتاب لگ رہا تھا۔ اس کے کانوں میں سفید ہڈی کے بڑے بڑے کنڈل لٹک رہے تھے اور اس کے گال اور ہونٹ دہکتے ہوئے سرخ انگارے تھے۔ وہ کوئی بیس اکیس سال کی ہوگی اور اس کی جوانی کی طغیانی اس کی آنکھوں سے ٹپکتی مستی اور اس کے سینے کے بے باک ابھار سے صاف ظاہر تھی۔ اس نے میری طرف غور سے دیکھا اور بازبیرد سے بات کرتے ہی لوٹ گئی اور ہڈی کا ایک ڈبہ لے آئی جس میں سے چودہ بہت بڑی چکنی اور بالکل نئی کوڑیاں نکلیں۔ کوڑیاں دیتے ہی وہ پھر اندر چلی گئی۔ بازبیرد بولا۔
"آپ پہلے چلیں۔ جیت یا ہار آٹھ سے ہوگی۔"

"ٹھیک ہے مگر پہلے مجھے کچھ ہاتھ یونہی پھینکنے دیں۔" میں نے کہا۔

میں نے چند بار کوڑیاں پھینک کر ہاتھ ٹھیک کیا۔ اس کے بعد میں نے ایک اور تجویز پیش کی کہ کوڑیاں صرف جیتنے والا پھینکے گا۔ بازبیرد نے اسے فوراً منظور کر لیا۔ کچھ تو میں واقعی اس جوئے میں ماہر تھا اور کچھ قدرت نے ساتھ دیا۔ میں ہاتھ پر ہاتھ جیتتا رہا اور کوئی دو گھنٹے میں ہی پانچ سو کویاں جیت گیا۔ بازبیرد نتیجے سے بے پروا جھنجھلا کر کھیل رہا تھا اور اس نے دو مرتبہ اندر سے کویاں منگوائے۔ اس کے ساتھی بھی حیران تھے۔ بازبیرد کے پاس گھر میں اس وقت پانچ سو کویاں ہی تھے اور میں اٹھنا چاہتا تھا مگر اس کے ساتھیوں نے اپنے اپنے کویاں اسے دے دیئے جو ڈھائی سو کے قریب تھے مگر میرا ہاتھ جما ہوا تھا اور اگر بازبیرد ایک

بازی جیتتا تھا تو اس کے بعد میں لگا تار پانچ سات ہاتھ تک کوڑی ہاتھ سے نہیں چھوڑتا تھا مزید دو گھنٹے میں یہ کویال بھی میں جیت گیا۔ بازیرد کی پیشانی پر پسینہ پھوٹ آیا اور اُس نے مجھ سے پوچھا۔ "پانچ سو کویال مجھے سونے پر دید و گے؟"

" مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے مگر رات بہت ہو گئی ہے اور ہمیں ہوٹل واپس پہنچنا ہے پھر کبھی سہی۔" میں بولا۔

" تو کل آنا"۔

" کل کی بجائے پرسوں رکھیں۔ کل میرا ارادہ اپنے کام کو ختم کرنے کا ہے۔ پرسوں کی پکّی ہے۔"

" اچھا آپ کی مرضی۔ مگر پرسوں پوری تیاری سے آئیں۔ بڑا کھیل ہو گا اِدھر یا اُدھر۔"

" اچھا تو اب اجازت دیں.... " کہتے ہوئے میں اور سوما چھ لمبیوں کو حیران اور مضمحل چھوڑ کر باہر آ گئے۔ ہمارے پاس آٹھ سو کویال کی بھاری تھیلی تھی میں نے باہر نکلتے ہی کہا۔ "سوما مجھے تو یہ ڈر لگ رہا ہے کہ یہ لوگ اتنے ہیں ہم پر حملہ نہ کر دیں۔"

" نہیں ایسی اُمید لمبیوں سے کبھی نہ کریں چاہے یہ ہزار ہوں اور آپ اکیلے یہ جوئے میں کنگال ہو جائیں گے مگر کوئی بد دیانتی یا بزدلی نہیں کریں گے۔"

ہم تیز تیز چلنے لگے۔ میں نے تھیلی سوما کو پکڑا دی اور وہ خوشی سے اس طرح جھوم کر چلنے لگا جیسے اُس نے بیئر کی کئی بوتلیں چڑھالی ہوں۔ رات بہت ہو گئی تھی اور جھاڑیوں میں جھینگروں کا ساز بج رہا تھا۔ سوما نے ایک لمبی گانا شروع کر دیا۔ ہم کوئی آدھی رات گئے ہوٹل پہنچے ہوں گے۔ میں تھک کر چور ہو گیا تھا اور جاتے ہی سو گیا۔

اگلے دن مجھے اپنا کام کرنا تھا جس کے لئے مجھے سوما کی ضرورت نہیں تھی میں صبح ہی نکل گیا اور شام کو لوٹا۔ سوما فوراً گرم گرم کھانا لے آیا اور کھاتے

کے بعد ہم نے اگلے دن جانے کا پروگرام بنایا۔ یہ فیصلہ ہوا کہ ہزار کویاں لے کر چلیں گے ہار گئے تو جیتی ہوئی رقم نکال کر کوئی ڈھائی سو کویاں گھر سے ہار دینگے میں نے سوما سے کہا کہ وہ اگلے دن پانچ بجے آجائے اور چار بیر کی بوتلیں بھی لے آئے۔

ایک دفعہ پھر میں اور سوما اندھیرے کی چادر کو چیرتے ہوئے پہاڑی سے نیچے اُتر رہے تھے۔ لیکن اب کے ہمارے قدم شیروں کے قدموں کی طرح جھاڑیوں کو روندتے ہوئے پڑ رہے تھے کیوں کہ ہمارے سینے بیر سے گرم تھے اور ہمارے پاس ہزار کویاں کی تھیلی تھی۔ سوما آج خاص طور پر بن سنور کر آیا تھا اور اُس نے جنگلی پھولوں کا تیز عطر اپنے کپڑوں پر چھڑکا ہوا تھا۔ نیچے کی جھونپڑیوں کو پار کرتے ہی اُس نے گانا شروع کر دیا اور ہم جھاڑیوں کے بیچوں بیچ بل کھاتی ہوئی پگڈنڈی پر جو چاندنی میں نہائی ہوئی شفاف دودھیا لکیر معلوم دیتی تھی، جھوم جھوم کر چلنے لگے۔

بازبیرد کا دروازہ آدھا کھلا تھا اور ہم ذرا سا کھٹ کھٹا کر اندر چلے گئے بازبیرد کی محفل جمی ہوئی تھی اور وہ اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ بیٹھا ہوا میز پر کوڑیاں پھینک رہا تھا۔ ہمارے بیٹھتے ہی اُس نے اپنے نیچے سے تھیلی نکالی اور سکوں کی ایک بڑی ڈھیری اپنے سامنے لگا دی۔ ڈیڑھ دو ہزار کویاں سے کم نہیں ہوں گے۔ میں نے سوما سے تھیلی لی اور اپنے سامنے بھی ایک ڈھیر لگا لیا۔ بازبیرد نے کوڑیاں آگے کرتے ہوئے کہا کہ پچیس کویاں سے کم کی بازی نہیں ہو گی چونکہ میں نے بازبیرد کو ان کوڑیوں پر اپنا ہاتھ سدھاتے ہوئے دیکھ لیا تھا، میں نے کہا "آج بڑا کھیل ہے نئی کوڑیاں منگوا لیں۔"

" یہ کل والی ہی ہیں جن پر آپ جیتے تھے۔"

" میرا خیال ہے بدل ہی لیں

" اچھا ـــــ مگر پھر بیچ میں نہیں بدلی جائیں گی۔"

بازبیرد نے نئی کوڑیاں منگوا لیں اور کھیل شروع ہو گیا۔ میں نے کوڑیاں پھینکیں

مگر ٹھیک نہیں پڑیں اور میں ہار گیا۔ باز بیرد نے لگاتار کئی بازیاں جیت لیں اور جب میرا ہاتھ آیا تو آتے ہی پھر چلا گیا۔ باز بیرد بڑی ہوشیاری سے کوڑیاں پھینک رہا تھا۔ میں نے کوڑیوں کو بڑا جما جما کر پھینکا مگر اُلٹی ہی پڑیں۔ میں دیکھتے ہی دیکھتے تین سو کویال ہار ہو گیا مگر پھر پانسہ پلٹا اور میرا ہاتھ آیا۔ میں نے بیر کا ایک گلاس ایک ہی گھونٹ میں ختم کر دیا اور جھنجلا کر کوڑیاں پھینکیں جو ٹھیک پڑیں۔ اس کے بعد میں جیتتا چلا گیا۔ باز بیرد کا ہاتھ اکھڑ گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ میرے ہاتھ پر کوڑیاں چڑھ گئی ہیں اور جیسے رکھ کر پھینک دیتا ہوں ٹھیک پڑ جاتی ہیں میں نے نہ صرف اپنے تین سو کویال واپس لے لئے بلکہ دو سو کویال باز بیرد کے بھی جیت لئے۔

باز بیرد ہارتا چلا گیا۔ اُس کے آگے رکھی ہوئی سکوں کی ڈھیری چھوٹی سے چھوٹی ہوتی چلی گئی اور اس کے ساتھ ساتھ اس کا چہرہ بھی سکڑتا چلا گیا۔ اس کے ساتھیوں کے چہروں پر ہوائیاں اُڑنے لگیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا باز بیرد کی اونچی اور بڑی ڈھیر میں اُن کے کویال بھی لگے ہوئے تھے۔ جب باز بیرد کے پاس کوئی دو سو کویال رہ گئے ہوں گے تو باز بیرد رُکا۔ اُس نے بیر کا ایک گلاس پیا اور کوڑیاں مجھ سے لے کر انہیں غور سے اُلٹ پلٹ کر دیکھا۔ اس کے ایک ساتھی نے بھی جُھک کر کوڑیوں کو ہاتھ میں لے کر دیکھا۔ میں نے کہا۔ "کوڑیاں تو آپ کی ہی ہیں۔"

"ٹھیک ہے چلئے۔"

اور جیسے ٹمٹماتا ہوا دیا ایک دفعہ بُجھنے سے پہلے بھڑکتا ہے، باز بیرد بھی ایک دفعہ چمکا اور اُس نے لگاتار کئی ہاتھ جیتے۔ مگر قسمت اُس کا ساتھ نہیں دے رہی تھی اور اُس کی کوششوں اور اس کے ساتھیوں کی دعاؤں کے باوجود وہ پوری رقم ہار گیا۔

ہمیں کھیلتے ہوئے کئی گھنٹے ہو گئے تھے اور میں اُٹھنا چاہتا تھا مگر باز بیرد نے ٹھہرنے کا اشارہ کیا اور اندر گیا۔ تھوڑی دیر میں وہ ایک چمکتا ہوا خنجر ہاتھ لئے نمودار ہوا۔ میں فوراً اپنی کرسی کو گراتا ہوا اپنے قدموں پر اُچھلا اور اپنے

بجائے میں کرسی اٹھانے ہی والا تھا کہ باز بیرد بولا "مہمان، باز بیرد کو اتنا کمینہ مت سمجھو۔ آرام سے بیٹھو۔"

اُس کے اتنا کہنے پر بھی میرا خوف دور نہیں ہوا مگر باز بیرد نے خنجر میرے سامنے رکھتے ہوئے کہا "مجھے صرف تین سو کوپال دے دو ۔۔۔ اس کا دستہ سونے کا ہے میں نے اپنی تمام پونجی رکھ کر یہ رقم اکٹھی کی تھی۔ بس یہ خنجر باقی ہے"

" میں نے تین سو کوپال دے دیئے مگر باز بیرد بدنصیب تھا اور وہ ایک ہاتھ بھی نہ جیت سکا۔ وہ اپنا سر گھٹنوں میں دبا کر بیٹھ گیا۔ مجھے رحم آیا اور میں نے جیتے ہوئے ڈھیر کا ایک بڑا حصہ اُس کی طرف بڑھا دیا اور بولا "باز بیرد یہ لو، یہ میں خوشی سے لوٹاتا ہوں۔"

باز بیرد نے سر اٹھایا۔ جیسے اُس کے زخموں پر کسی نے نمک چھڑک دیا ہو۔ اُس نے وہ ڈھیری اپنے دونوں ہاتھوں سے اتنی تیزی سے میری طرف پھینکی کہ بہت سے سکّے نیچے اِدھر اُدھر گر پڑے۔ وہ تقریباً چیخ کر بولا "میں یہ بھیک ہرگز نہیں لوں گا۔" پھر وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا "مگر ابھی آپ کو جانے نہیں دونگا۔" ایک بازی اور ہوگی اور یا تو میں اپنی آخری پونجی بھی ہار جاؤں گا اور یا اپنا ہارا ہوا مال واپس لے لوں گا۔ یہ لمبیوں کی رسم ہے، ان کی عزت ہے، اس میں کوئی بھیک نہیں کوئی شرم نہیں، میری بیٹی شاشی میرا آخری داؤ ہے، میں جیت گیا تو قاعدے کے مطابق آپ کو میری ساری رقم لوٹانی ہوگی اور اگر میں ہار گیا تو شاشی کا ہاتھ آپ کے ہاتھ میں پکڑا دوں گا اور آپ کو یہ عزت مجھے بخشنی ہوگی۔ بولئے منظور ہے؟"

" دوست،" میں نے کہا "اگر یہ داؤ ضروری اور جائز ہے تو میں پیچھے نہیں ہٹنا چاہتا۔ مگر آپ کی لڑکی نوجوان ہے اور میں تقریباً بوڑھا ہو چکا ہوں۔ اس کے علاوہ میری ایک شادی ہو چکی ہے اور اگرچہ میری بیوی اب زندہ نہیں ہے مگر میں دوسری شادی نہ کرنے کا عہد کر چکا ہوں۔ کیا آپ مجھے ایک اور تجویز پیش کرنے کی اجازت دیں گے؟"

" کیا "

" یہ کہ اگر میں جیت گیا تو مجھے یہ حق مل جائے کہ میں شاشی کا ہاتھ جس کے ہاتھ میں چاہوں پکڑا دوں، تمہارے بھائی اور لڑکی کے چچا کی حیثیت سے ـــــ وہ نوجوان میرا دوست ہی ہے وہ نوعمر اور حسین ہے۔"

باز بیرو اور اُس کے ساتھی چونک گئے، باز بیرو سمجھ گیا اور فوراً بولا " مگر سوما تو لاڈینی ہے۔"

" لیکن میرے پیارے دوست، وہ انسان تو ہے، وہ لاڈینی پیدائش سے ہے اور اس میں اس کا کیا قصور ہے؟ مگر وہ نوجوان ہے، خوبصورت ہے اور بڑا نیک دل ہے۔ اور پھر میں بھی تو لمبی برادری کا نہیں ہوں۔ جب آپ مجھ سے اپنی لڑکی بیاہ دینے میں کچھ بُرا نہیں سمجھ رہے تو سوما نے کیا قصور کیا ہے؟"

" آپ مجھے بڑی الجھن میں ڈال رہے ہیں" باز بیرو جھجک رہا تھا۔

" سب سے بڑی بات یہ ہے کہ سوما، شاشی کو دل و جان سے چاہتا ہے۔" میں نے اپنی آخری دلیل پیش کی۔

باز بیرو چند لمحوں کے لئے سوچتا رہا، پھر اُس نے بیر کی ایک بوتل اٹھائی اور اُسے ایک ہی سانس میں چڑھا گیا۔ اس کے بعد وہ آہستہ سے بولا " آپ نے مجھے بھائی کہا ہے، مجھے منظور ہے۔"

باز بیرو نے یہ کہہ کر شاشی کو بلایا اور اُسے پاس بٹھالیا۔ اُس نے شاشی سے لمبی میں کچھ بات کی اور شاشی سوما کی طرف دیکھ کر مسکرا دی۔ وہ آج بلا کی حسین لگ رہی تھی۔

میں نے کوڑیاں باز بیرو کی طرف بڑھا دیں۔ یہ سات ہاتھوں پر مشتمل آخری بازی تھی اور ہار جیت چار ہاتھوں پر طے تھی۔ ایک طرف شکست در شکست کے پس منظر میں امید و بیم کی لہریں اور ایک آخری والہانہ کوشش تھی اور دوسری طرف نہ صرف خوش قسمتی کا چراغ روشن تھا بلکہ دو محبت بھرے دلوں کے ارمان تیل بن کر اس کی

جوت کو اور تیز کر رہے تھے۔ باز بیرو نے بے خوفی اور خندہ پیشانی سے بازیاں کھیلیں مگر قسمت کو اُسے ہرانا تھا اور وہ ہار گیا۔

باز بیرو نے کھڑے ہو کر ایک بلند قہقہہ لگایا اور مجھ سے ہاتھ ملا کر بولا۔ "یہ شادی کی مبارک شب ہے۔ آپ سب کو مبارک۔"

ہم سب ایک دائرے میں کھڑے ہو گئے۔ باز بیرو شاشی کو لے کر ادھر آیا اور اُس نے اس کا ہاتھ سوما کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔ سب نے مبارک باد کہا اور کمرے میں ایک شور سا مچ گیا۔ صرف پھولوں کے ہار کی کمی تھی مگر سوما اور شاشی کے مسکراتے ہونٹوں سے پھول ہی پھول برس رہے تھے۔ میں نے جلدی سے ڈھائی سو کوپال اپنی ہتھیلی میں ڈالے اور باقی ساری ڈھیری دولہا اور دلہن کے آگے شادی کے تحفے کے طور پر بڑھا دی۔ اتنے میں باز بیرو اندر سے ایک بڑا شیشے کا مرتبان اٹھا لایا تھا اور وہ بڑے جوش و خروش سے مہمانوں کو بیر دے رہا تھا!

اور اس کے دو دن بعد جب میں لمپیا سے جانے لگا، کبھی واپس نہ آنے کیلئے تو مجھے بس تک چھوڑنے کے لئے سوما، شاشی اور باز بیرو تینوں آئے۔ سب مسافر بس پر چڑھ چکے تھے اور میں بس کے دروازے پر کھڑا تھا۔ بس چلنے والی تھی اور زندگی کے چند عجیب و غریب دن ماضی کے دھندلکے میں ڈوبنے والے تھے۔ میرے سامنے لمپیا میں بیتے ہوئے سات دنوں کی پوری اور ناقابل فراموش کہانی کھڑی تھی۔ تین چہرے تھے اور تین تاثر۔ سوما جس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی گنگا جمنا بہہ رہی تھی، شاشی جو الہڑ سی بن کر مسکرا رہی تھی اور باز بیرو بہادر اور فراخ دِل لمپی جو مجھ سے ابھی ابھی جھنجھوڑ کر بغل گیر ہوا تھا اور جس کے چہرے پر ڈوبتے ہوئے سورج کا سکون تھا!

اُجالا

اگرچہ وہ اب خود ایک بڑا افسر تھا مگر اس کی چند بچپن کی عادتیں جن کا تعلق اسکی اس وقت کی مفلسی اور بے پرواہ زندگی سے تھا، ابھی تک اس سے نہیں چھوٹی تھیں ان میں سے ایک عادت سڑکوں پر ایک عام آدمی کی طرح تنہا گھومنے بلکہ آوارہ گردی کرنے کی تھی۔ اس کے پاس اب اپنی کار تھی لیکن اس نے سڑکوں اور بازاروں میں پیدل گھومنا اور بھیڑ بھڑکے میں ڈنڈا پکڑ کر بس میں سفر کرنا نہیں چھوڑا تھا۔ وہ اکثر کہا کرتا تھا کہ یہ کار ایک بند شیشے کا چلتا پھرتا گھر ہے جس میں آزادی نام کو بھی نہیں تھی۔ وہ گھر سے باہر قدم رکھتے ہی دروازہ کھول کر اس میں بیٹھ جاتا اور جیسے وہ اس دنیا سے بالکل الگ تھلگ ہو وہ اس میں بند ہو کر سڑکوں کو طے کرتا ہوا دفتر پہنچ جاتا اور دفتر سے شام کو اٹھتا تو اسی طرح اس بند گھر میں بیٹھ کر سڑکیں عبور کرتا ہوا گھر پہنچ جاتا اس کے مقابلے میں وہ بھیڑیں تھیں جو سڑکوں پر ایک دوسرے سے کندھا بھڑاتی ہوئیں، سائیکلوں پر آپس میں بات کرتی ہوئیں، بسوں میں ایک دوسرے کو دھکا دیتی ہوئیں، ایک شور و غل اور گپ شپ کے ماحول میں، زندگی کی ریل پیل میں اپنے آپ کو شریک کرتی ہوئیں بڑھتی رہتیں۔ وہ لوگ حقیقی زندگی سے کتنا قریب تھے اور وہ کتنی دُور۔ کئی دفعہ تو وہ اپنی کار سے اتنا بیزار ہوتا کہ وہ اس میں سے اُتر کر گھر میں داخل

ہونے کی بجائے کھلی سڑک پر بھاگ جاتا اور کچھ دور تک چلتا ہی رہتا۔ اسے بالکل ایسا ہی محسوس ہوتا جیسے وہ کسی قید سے آزاد کر دیا گیا ہو اور ایک کھلی اور آزاد ہوا میں سانس لے رہا ہو۔

ایک روز وہ اسی طرح ایک سڑک پر پیدل جا رہا تھا۔ دراصل وہ سڑک کے دائیں طرف جوں جوں کوٹھیاں گزر رہی تھیں وہ ان میں رہنے والوں کی نام کی پلیٹیں پڑھ رہا تھا۔ اچانک وہ ایک نام پڑھ کر رک گیا۔ یہ رام داس ایگزیکٹو انجنیئر (ریٹائرڈ) کا بورڈ تھا۔ وہ وہیں کھڑا ہو گیا اور اس نے وہ بورڈ کئی دفعہ پڑھا۔ اس نے کوٹھی میں داخل ہوتے ہوئے ایک بوڑھے نوکر کو روک کر پوچھا۔

"سنو، یہاں رام داس ایگزیکٹو انجنیئر رہتے ہیں؟"

"جی ہاں!"

"کہاں کے رہنے والے ہیں؟"

"پنجاب کے"

اس نے پھر پوچھا۔ "تم یہاں کب سے نوکر ہو؟"

"میری تو ساری عمر ہی صاحب کے ساتھ گزری ہے۔"

"کیا صاحب امرتسر بھی رہے ہیں؟"

"ہاں چار سال ہم لوگ امرتسر بھی رہے۔ یہ بائیس تیئس برس پہلے کی بات ہے۔"

"گورے رنگ کے چھوٹے سے قد کے ہیں نا؟"

"جی ہاں، آپ نے ملنا ہے تو اندر آجائیں۔ صاحب باغ میں ہی بیٹھے ہوں گے۔"

"مجھے صاحب سے ملنا تو ہے لیکن میں پھر آؤں گا۔ میں یہاں پاس ہی رہتا ہوں۔"

وہ یہ کہہ کر آگے بڑھ گیا اور بائیس تیئس برس پہلے کا بچپن کا زمانہ اس کی آنکھوں کے سامنے گھوم گیا۔ وہ اس وقت کوئی سولہ سال کا تھا۔ پتلا، دبلا کمزور سا لڑکا جس نے ابھی ابھی میٹرک پاس کیا تھا لیکن جس کے پاس پڑھائی جاری

رکھنے کے لئے پیسے نہیں تھے۔ ایک صبح وہ مسکین سی صورت بنائے اپنے باپ کے ہمراہ رام داس ایگزیکٹو انجنیئر کی کوٹھی میں گھسا تھا جن کے بارے میں یہ مشہور تھا کہ وہ غریب طلبا کی مدد کرتے ہیں۔ انجنیئر صاحب نے اس کے نتیجے کا کارڈ دیکھ کر اور اس کی ہوشیاری اور چال چلن کے بارے میں اس کے اسکول کا سرٹیفکیٹ پڑھ کر اسی وقت سو روپے اس کی کتابوں کے لئے اور بیس روپے مہینہ اس کا وظیفہ مقرر کر دیا تھا۔ ان کی اس امداد سے اس نے پہلے ایف۔ اے اور پھر بی اے کر لیا تھا۔ اس تعلیم کے سبب وہ ان مقابلے کے امتحانوں میں بیٹھ سکا تھا جنہیں پاس کر کے وہ آج ایک اچھی پوزیشن میں تھا وہ وقتاً فوقتاً انجنیئر صاحب کو اظہارِ تشکّر کے احسان مندانہ خط لکھ دیا کرتا تھا۔ مگر انجنیئر صاحب نے کبھی اس کے خطوط کا جواب نہیں دیا تھا۔ ہاں اسے یہ وظیفہ آخر تک ملتا رہا تھا۔

وہ وہاں سے چلا آیا اور اس نے سوچا کہ ایک دو دن میں وہ اپنی کار میں اپنی بیوی کے ساتھ اپنے محسن اور مربّی سے ملنے آئے گا۔ اور وہ یقیناً یہ دیکھ کر خوش ہوں گے کہ ایک غریب لڑکا جس کی انہوں نے مالی امداد کی تھی آج ایک خوش حال اور کامیاب افسر ہے۔ معاً اسے یہ بھی خیال آیا کہ چوں کہ وہ اب اس قابل تھا کہ وہ اس وظیفے کی رقم کو لوٹا سکے تو شاید یہ مناسب ہوگا کہ وہ انجنیئر صاحب سے جنہیں اب ریٹائرڈ زندگی میں روپے کی ضرورت ہوگی، اس رقم کو واپس کرنے کی خواہش ظاہر کرے۔ گھر پہونچ کر اس نے محسوس کیا کہ وہ آج بہت مسرور تھا کیونکہ اسے اتفاقیہ اپنے اس محسن کا پتہ لگ گیا تھا جسے اس نے اکثر یاد کیا تھا۔

وہ دو دن کے بعد اپنی نئی نیلے رنگ کی کار میں اپنی بیوی کے ساتھ رام داس انجنیئر کی کوٹھی میں داخل ہوا آج چھٹی تھی اور اس وقت صبح کے نو بجے تھے موسم خوشگوار تھا۔ اس بوڑھے نوکر نے اسے پہچان لیا اور انہیں فوراً انجنیئر صاحب کے پاس لے گیا۔ اس وقت وہ ہاتھ میں ایک پھاوڑا لئے باغ میں زمین کھود رہے تھے۔ کار کی آواز سن کر اور ان لوگوں کو اپنی طرف آتا ہوا دیکھ کر وہ رک

گئے تھے اور انہیں پہچاننے کی کوشش کر رہے تھے۔ نوکر نے تین بید کی کرسیاں وہیں بچھا دیں اور وہ وہیں بیٹھ گئے۔ اگرچہ بڑھاپے اور جوانی کا فرق موجود تھا مگر اس نے پہچان لیا کہ یہ وہی انجنیئر تھے جنہوں نے اس کی زندگی بنادی تھی۔ وہی گورا رنگ اور وہی فربہ جسم۔ اس نے اُٹھ کر اور تعظیماً اُن کے پاؤں چھو کر کہا۔

" آپ میرے محسن اور مربی ہیں۔ میرا نام کرشن کمار ہے اور آپ جب امرت سر میں تھے تو آپ نے مجھے کالج کی پڑھائی کے سلسلے میں مدد دی تھی۔ اگر متواتر چار سال تک آپ کی مدد نہ ملتی تو آگے نہ پڑھ سکتا اور زندگی میں وہ کامیابی نہ ملتی جو مل گئی ہے۔ میں یہیں ہوں۔ اتفاق سے آپ کا پتہ چلا تو جذبۂ احسان مندی نے اُکسایا کہ آپ کی قدم بوسی کو چلا آؤں۔"

انجنیئر صاحب مسکرا کر رہ گئے اور بولے۔

" برخوردار مجھے کچھ یاد نہیں۔ میں ملازمت کے زمانے میں دس بارہ لڑکوں کو وظیفے دیا کرتا تھا مگر کبھی کسی کے بارے میں کچھ زیادہ جاننے کی کوشش نہیں کی تھی مجھے یہ جان کر بڑی خوشی ہوئی کہ آپ اب اچھی پوزیشن میں ہیں اس لئے پرماتما کا شکر ادا کیجیے۔ آپ کا یہ خیال غلط ہے کہ میری تھوڑی سی امداد سے آپ اس درجے کو پہنچے۔ میں خود غریب تھا اور ایک نیک آدمی کی مدد سے پڑھا تھا۔ جب اس قابل ہوا میں نے بھی کچھ غریب لڑکوں کی مدد کر دی۔ اسی طرح چراغ سے چراغ جلتا ہے اس میں کسی کے احسان کی کوئی بات نہیں۔ مجھے تو کبھی اس بات کا خیال تک نہیں آیا۔"

اس نے محسوس کیا کہ انجنیئر صاحب کے چہرے پر ایک ایسا اطمینان اور بشاشت تھی جو بہت کم لوگوں میں دیکھنے میں آتی ہے اس نے جھجکتے ہوئے کہا۔

" آپ نے صحیح فرمایا، لیکن احسان تو احسان ہے اور کبھی بھلایا نہیں جا سکتا۔ آپ کی بے پایاں عنایت کے سبب میں کچھ حاصل کرنے کے قابل ہوا۔ جہاں تک احسان کا تعلق ہے میرا یہ عقیدہ ہے کہ یہ کبھی کسی صورت میں نہیں چکایا جا سکتا۔ اگر

آپ اجازت دیں تو میں اس قابل ہوں کہ وہ رقم لوٹا دوں۔ میں یہ بات کہہ کر ایک پریشانی اور ندامت محسوس کر رہا ہوں لیکن ساتھ ہی مجھے ایک گناہ کا احساس بھی ہوتا ہے کہ میں اس قابل ہوتا ہوا بھی وہ رقم نہ لوٹاؤں۔ میں آپ سے اس بیباکی بلکہ گستاخی کے لئے معافی کا خواستگار ہوں۔"

اس پر انجینیر صاحب خوب ہنسے اور پھر سانس لے کر بولے۔

" عزیز میں نے کچھ باتوں کو ایک فریضہ جان کر کیا ہے اور مجھے ان سے بے پناہ مسرت ملی ہے۔ میری عمر آپ سے اگر زیادہ نہیں تو دوگنی ضرور ہوگی۔ اب جبکہ میں قبر میں پاؤں لٹکائے ہوئے ہوں میں بے حد مطمئن اور مسرور ہوں اور اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ زندگی میں حقیقی مسرت خدمت، قربانی اور راست روی میں ہے۔ آپ یقیناً وہ روپیہ مجھے لوٹا کر میری مسرت کو چھیننا نہیں چاہیں گے۔ میری پنشن کوئی چار سو روپے ہے۔ لڑکے دونوں انجنیر ہیں، شریکِ حیات کو گزرے کئی برس ہو گئے ہیں۔ مجھے صرف دو سو روپیہ مہینہ درکار ہے جس میں سو روپے اس نوکر کی تنخواہ اور سو روپے میرا اپنا خرچ شامل ہے۔ باقی کے دو سو روپے مہینے کے وظیفے میں ابھی تک دے رہا ہوں۔ میں تو یہ کہوں گا کہ اگر آپ کسی قابل ہیں تو پرماتما کا شکر ادا کیجیے اور کسی اور کی مدد کر کے چراغ سے چراغ جلاتے چلے جائیے۔"

وہ اور اس کی بیوی اپنے ہونٹوں پر مسکراہٹ لئے چپ چاپ سن رہے تھے۔ انہیں محسوس ہوا کہ وہ کسی عام آدمی سے بات نہیں کر رہے تھے۔ انجنیر صاحب دو منٹ چپ بیٹھے رہے جیسے کچھ سوچ رہے ہوں۔ پھر بولے۔

" خوشیاں اور اطمینان جگہ جگہ ہیں بشرطیکہ انسان انہیں ڈھونڈ پائے۔ جب میرے پاس کار تھی تو میں نے کبھی اکیلے سفر نہیں کیا تھا۔ میں ہمیشہ کسی راہ چلتے کو جو اس طرف جاتا ہوتا تھا اس میں بٹھا لیا کرتا تھا۔ مجھے اس ذرا سی بات میں بھی بڑی مسرت ملتی۔ اب کار تو میرے پاس نہیں ہے، اور اس کی مجھے ضرورت بھی نہیں مگر مسرتوں اور اطمینان خزانے میرے پاس جوں کے توں موجود ہیں۔ پرماتما

کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔"

اس کے کچھ ہی دیر کے بعد کرشن کمار اپنی بیوی کے ساتھ کار میں بیٹھا ہوا اس کوٹھی سے باہر نکل رہا تھا۔ وہ آج ہر روز کی مانند کچھ بیزار، کچھ ناخوش نہیں تھا بلکہ اس کے چہرے پر ایک خاص طمانیت برس رہی تھی۔ جیسے اس نے مسرت اور اطمینان کے کچھ راز پا لئے ہوں۔ اس کی بیوی نے کہا۔

" آپ کے انجنیئر صاحب ایک عظیم انسان ہیں۔ آپ نے چراغ سے چراغ جلانے والی بات پر غور کیا۔"

کرشن کمار کھویا ہوا سا تھا۔ جیسے احساسات میں ڈوبا ہوا ہو۔ اچانک چونک کر بولا۔

" ہاں میں اسی بات پر سوچ رہا ہوں اور میں نے اپنے ذہن میں فیصلہ بھی کر لیا ہے۔ چراغ سے چراغ جلتے رہیں تو اُجالا ہمیشہ رہے گا۔"

چاند ستارے

ظفر کوئی اٹھائیس سال کا تھا۔ وہ دل و دماغ کی بہت سی خوبیوں کا مالک تھا اور شاید ہی کوئی آرٹ ہو جو اُسے نہ آتا ہو۔ وہ ایک اچھا شاعر، مغنی اور فنکار تھا اُس کے اشعار، گیتوں اور تصویروں میں دُنیا بھر کا حُسن اُبھر آیا تھا۔ بہت ہی لطیف احساس رکھنے والے ظفر کے سینے میں لڑکیوں کے دل کی طرح ایک نرم اور حسّاس دل بھی تھا۔ جس میں جذبات کی ایک دُنیا آباد تھی۔

وہ فطرتاً رُومان پسند تھا۔ اُسے ہر خوب صورت لڑکی اپنی طرف کھینچتی تھی اور اُس سے محبّت کرنے کے لئے اُس کا دل مچلتا تھا۔ لیکن وہ اُن خوب صورت چہروں کو صرف دل اور آنکھوں سے پیار کرتا تھا۔ یا اُن کے کسی پہلو کو اپنے اشعار اور اپنی تصویروں میں سمو دیتا۔ اُس کے سینے میں ایک درد سا اُٹھتا رہتا۔ ایک مدّھم مدّھم سی آنچ سُلگتی رہتی۔ لیکن وہ کسی لڑکی کی محبت نہیں پا سکا تھا۔ قدرت نے اُس کے ساتھ ایک عجیب ستم کیا تھا کہ وہ بہت بد صورت تھا۔ اُس کا چہرہ چیچک کے بیشمار داغوں سے بھرا ہوا تھا۔ جب وہ چھوٹا ہی سا تھا اُس کے چیچک نکل آئی تھی جس نے اُس کے چہرے کو مکروہ بنا دیا تھا۔ اور جیسے یہی کافی نہیں تھا وہ بڑا ہو کر اپنے کالج میں لڑکوں کی دو پارٹیوں کے درمیان ایک

لڑائی میں اُلجھ گیا تھا اور ایک لڑکے نے اُس پر چاقو سے حملہ کر دیا تھا۔ اُس حادثے نے اُس کے گالوں پر زخم کے کئی نشان چھوڑ دیئے تھے۔

ظفر اکثر سوچا کرتا کہ قدرت نے اُس کے ساتھ کتنا ظلم کیا ہے۔ کاش اُس کے سینے میں احساس سے معرّا ایک دل ہوتا۔ معمولی سا دل۔ جس میں جذبات کی آندھیاں نہ چلتیں۔ ارمانوں کے طوفان نہ اُٹھتے۔ اور اس لمبی چوڑی ستم پرور دُنیا میں وہ ایک بے حس آدمی کی طرح جی لیتا۔ لیکن یہ سوچ تو اُس کے دُکھ کا مداوا نہیں تھی۔ اُس کے دل میں جذبات کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر خشک نہیں ہوا تھا۔ وہ اپنے اشعار اور فن کے سانچوں میں حُسن کو ڈھالتا رہا۔ اور اُس کا دل خون کے آنسو روتا رہا۔

جمیلہ، شاہدہ اور طلعت ایک دُوسرے کے بعد اُس کی زندگی میں آئیں اور اُس کے دل کی دہلیز میں قدم رکھے بغیر لوٹ گئیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ان میں سے کوئی بھی اُس کے قریب نہیں آئی تھی۔ وہ ایک خوش فہمی میں مبتلا اُنہیں اپنے قریب سمجھتا رہا۔ ڈرتا ڈرتا وہ اُن کی طرف بڑھا تھا۔ لیکن وہ کھلکھلا کر ہنسی تھیں۔ اور پیچھے ہٹ گئی تھیں۔ ظفر اِس دُنیا میں یکسر اُداس، بالکل تنہا رہ گیا تھا۔ ایک بدصورت آدمی کے ساتھ کیسا رُومان، کیسی محبت۔ اُس کا فن بھی اُسے دائمی خوشی نہ دے سکا۔ اُسے کئی بار محسوس ہوا کہ اُس کا فن صرف اُس کے آنسوؤں کو تھامنے کے لئے قدرت کا عطا کیا ہوا ایک دامن تھا۔ اور جب وہ جمیلہ، شاہدہ اور طلعت کو بھول گیا تو رشیدہ نے اُس کے دل کے دروازے پر دستک دی۔ یہ ایک انجانی، اَن دیکھی لڑکی تھی۔ جو کچھ عجیب ہی حالات میں اُس کے دل کو گُدگُدا گئی

ایک روز شام کی ڈاک سے آئی ہوئی چٹھیوں میں اُسے ایک نیلے رنگ کا لفافہ ملا۔ جس پر پتہ کسی لڑکی کے ہاتھ کا لکھا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ اُس نے کچھ سوچتے ہوئے آہستہ آہستہ لفافہ کھولا۔ لکھا تھا۔

" فن کار!

اگر بارگاہِ عالی میں غزل اصلاح کے لئے ارسال کردوں تو؟......

بس زیادہ کیا لکھوں۔ کیونکہ فنکار کی مصروفیت کا تمام عالم میں جواب نہیں۔

مس رشیدہ"

ظفر نے یہ خط کئی بار پڑھا۔ خط گوالیار سے آیا تھا۔ اور رشیدہ نے اپنا پورا پتہ لکھا تھا۔ وہ سوچنے لگا۔ یہ لڑکی شاید ملازم ہے۔ اور تنہا یا دوسری لڑکیوں کے ساتھ رہتی ہے۔ یا پڑھتی ہو اور ہوسٹل میں رہتی ہو۔ کیونکہ اپنے گھر سے مردوں سے اس طرح خط وکتابت کرنا عام طور پر لڑکیوں کے لئے مشکل ہی تھا۔ اگرچہ وہ شاعر کی حیثیت سے کافی مقبول تھا۔ لیکن اُسے حیرت ہوئی کہ کوئی لڑکی اُس سے اصلاح کے لئے درخواست کرے۔ بہرحال اُس کی رومانی طبیعت ایک بار اور مچلی۔ اور اُسی شام اُس نے رشیدہ کو یہ جواب لکھا۔

"ڈیر مس رشیدہ!

آپ نے تو مجھے فنکار مخاطب کر کے اپنی خلاصی کرلی۔ لیکن مجھے ایک اُلجھن میں ڈال دیا۔ اگر آپ مجھ سے چھوٹی ہیں (ظاہر ہے چھوٹی ہی ہوں گی) تو آپ کو محترمہ لکھنا مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ "آپ" عمر کے فرق کے باوجود ایک بے ضرر سا لفظ ہے۔ اس لئے تم کی بجائے آپ لکھنے میں مجھے کوئی تامّل نہیں۔ پھر بھی آپ کو مخاطب کرنے میں انگریزی کے سہارا لے رہا ہوں اور یہ ایک ناقابل اعتراض طرزِ تخاطب ہے۔

میں حیران ہوں کہ آپ نے مجھے اس قابل کیسے سمجھ لیا کہ آپ کے اشعار پر اصلاح دے سکوں گا۔ بہرحال غزل شوق سے بھیج دیجئے۔ دیکھ لوں گا۔ میرا خیال ہے آپ شعر خوب کہتی ہوں گی۔ کیونکہ دریا کو کوزے میں بند کرنا آپ کو آتا ہے۔ (آپ کے خط میں ایک ہی فقرہ اور وہ بھی نامکمل!)

کچھ اپنے بارے میں بھی لکھئے۔ آپ کیا کرتی ہیں۔ یعنی کہیں ملازم ہیں یا پڑھ رہی ہیں۔ مجھے آپ کے بارے میں تفصیل سے معلوم کر کے بہت ہی خوشی

ہو گی۔ اور آپ کے اشعار کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔ اور واقفیت یوں بھی بُری نہیں۔

جواب کا منتظر

ظفر"

یہ خط لکھنے کے بعد ظفر کی بے تابی کچھ اور بڑھ گئی۔ وہ رشیدہ کے بارے میں سوچتا رہا۔ اُس نے تصوّر میں رشیدہ کی شکلیں بنائیں اور مٹا دیں۔ یہ دل بھی کم بخت کتنا چنچل ہوتا ہے۔ جذبات تھے کہ طوفانی لہروں کی طرح بڑھتے اور اُمڈتے چلے آ رہے تھے۔ اور اس کا دل اُن لہروں میں کاغذ کی ایک چھوٹی سی ناؤ کی طرح بہا جا رہا تھا۔

خط کا جواب تین چار روز میں ہی آ گیا۔ یہ خط اور بھی دلچسپ تھا۔

"مکرمی!

مکتوب ملا۔ بے حد مسرت ہوئی۔

آپ نے اپنے ایک جملے سے مجھے شرمندہ کر دیا ہے۔ "آپ شعر خوب کہتی ہوں گی۔" آپ کے اِن الفاظ میں کتنا یقین مستور ہے۔ لیکن یہاں اِس کے بالکل برعکس ہے۔ بندہ پرور! اچھا لکھتی ہوتی تو اصلاح کیوں درکار ہوتی؟ اب مجھے غزل بھیجنے میں بہت ڈر لگ رہا ہے۔ شرم بھی آ رہی ہے۔ لیکن اِس خط کے جواب کے بعد غزل ارسال کروں گی۔

"اور واقفیت یوں بھی بُری نہیں!" جی ہاں واقعی بُری نہیں۔ آپ اپنے سے زیادہ واقف کرا دیں تو عین عنایت ہو گی۔ اِس یک طرفہ واقفیت میں بہت لطف رہے گا۔ آپ کس آفس میں کام کرتے ہیں؟ وغیرہ وغیرہ۔ یہ وغیرہ وغیرہ اِس لئے کہ مدّاح کا فرض ہے کہ وہ فنکار کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جانے۔ اور فنکار بے چارہ کس کس کو جانے!

اور ہاں سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کو کیسے مخاطب کروں؟ ظفر بابو، ظفر صاحب وغیرہ کا طرزِ تخاطب تو بہت غیر فصیح معلوم ہوتا ہے۔ شاہ ظفر کیسا رہے گا؟

بس اجازت دیجئے۔

رشیدہ

یہ خط بھی ظفر نے بیسیوں بار پڑھا۔ رشیدہ ایک دلچسپ لڑکی معلوم ہوتی ہے۔ اُس نے مسکرا کر سوچا، اپنے بارے میں کچھ بھی نہ بتا کر میرے بارے میں سب کچھ جاننا چاہتی ہے۔ اور پھر بہت شوخ اور بے باک بھی معلوم ہوتی ہے شاہ ظفر کی ترکیب میں اُس کی طبیعت کی شگفتگی اور چلبلا پن صاف ظاہر ہے یہ تو دوسرے ہی خط میں بے تکلّف ہو گئی تھی۔ لیکن، اُس نے ایک ذہنی کروٹ لے کر سوچا، اُس بے چاری کو کیا پتہ کہ شاہ ظفر اور اس بے چارے غریب ظفر میں شعر گوئی اور درد و غم کے سوا کچھ بھی مشترک نہیں ہے۔

ظفر نے اس خط کا جواب ذرا تفصیل سے دیا۔ اور اپنے بارے میں بہت سی باتیں بتا دیں۔ لیکن سب اچھی اچھی۔ اُس نے رشیدہ سے پھر اُس کے بارے میں پوچھ لیا۔ اِس خط میں ظفر نے زیادہ بے تکلفی کا لہجہ اختیار کر لیا تھا۔ اور اُسے یقین تھا کہ یہ لڑکی اِس بے تکلّفی کا بُرا نہیں مانے گی۔ اور جہاں تک بے تکلفی کا تعلّق تھا پہل تو دراصل رشیدہ نے خود ہی کی تھی۔ وہ اِس خط کے جواب کا انتظار کرتا رہا۔ اور جب خط کا جواب آیا تو اُس کی مسّرت کی انتہا نہ رہی۔ اُس نے ایک اُمید وبیم کی کیفیت میں لفافہ کھولا۔ یہ خط تو پہلے سے بھی زیادہ دلچسپ تھا۔ مگر اس میں رشیدہ نے ایک اور ہی پہلو اختیار کر لیا تھا۔ اُس نے لکھا تھا۔

"ظفر صاحب! آپ کا خط ملا۔ آپ نے تو واقعی مجھے بڑی کشمکش میں مبتلا کر دیا ہے۔ ورنہ غزل کب کی آپ کے پاس پہنچ گئی ہوتی۔ اب میں یہ چاہوں گی کہ آپ میرے متعلق خوش فہمی ہی میں مبتلا رہیں۔ خدا کی قسم میں نے جو غزل کہی ہے بڑی غیر معیاری ہے اور میں نے اُسے نہ بھیجنے ہی کا فیصلہ کر لیا ہے۔ جی ہاں یہ تو میں بھی تسلیم کرتی ہوں کہ میں بہت اچھّے خط لکھتی ہوں۔ تمام سہیلیاں بھی تعریف کرتی ہیں۔ آپ کی تعریف کا بہت بہت شکریہ!

آپ نے اِسی ایک خط میں ایک ہزار باتیں دریافت کی ہیں۔ اُن کے لئے

ایک ہزار پیراگراف کون بناہے ؟ لیجیئے سلسلہ وار ایک ہی پیرے میں جواب دے رہی ہوں میں آپ کی غزلیں اور نظمیں کئی سال سے مختلف پرچوں میں پڑھ رہی ہوں آپ کی آواز ریڈیو سے نشر ہونے والے کئی مشاعروں میں سُنی ہے۔ خدا نظر بد سے بچائے۔ آپ کی آواز بھی آپ کے اشعار کی طرح پیاری ہے۔ کسی کی تعریف کرنے کا آرٹ مجھے نہیں آتا۔ ورنہ آپ کی شان میں ایک قصیدہ لکھ دیتی۔

میری شوخی اور شگفتگی کی بھی خوب رہی۔ اب تو میں نے اپنی تمام شوخیاں برباد کردی ہیں۔ پھر بھی میں کچھ لکھنے بیٹھتی ہوں تو نہ جانے کب اور کہاں، کس دروازے سے شوخی اور شرارت دبے پاؤں داخل ہوجاتی ہے اپنے بارے میں آپ کو ایک بات اور بتاؤں کہ میری شخصیت شوخی اور بیباکی بس انہیں دو عناصر سے مل کر بنی ہے۔ آپ ہر وقت خوش رہتے ہیں یہ میرے لئے بہت خوشی کی اطلاع ہے ورنہ بےچارے شاعر، بےچارے صرف محرومی ہی کی تصویر ہوتے ہیں۔!

میری خواہش ہے کہ آپ اپنی بیوی سے مجھے متعارف کرادیں، تاکہ میں انہیں بھی خط لکھ سکوں۔ آپ پہلے خوش نصیب ہیں جن سے میں نے اپنے بارے میں اتنی تفصیل سے گفتگو کی ہے۔ براہ کرم اِن تمام باتوں کو اپنے ہی تک محدود رکھیں۔ مسِز کو آداب کہیئے۔ آپ کے چاند ستاروں کو بےشمار پیار۔

آپ کی ـــــ رشیدہ'

ظفر بیوی اور چاند ستاروں کے بارے میں پڑھ کر حیران رہ گیا۔ سوچ سوچ کر وہ اِس نتیجے پر پہنچا کہ رشیدہ اِس طرح لکھ کر صرف یہ جاننا چاہتی ہے کہ وہ شادی شدہ ہے یا نہیں۔ جہاں وہ رشیدہ کی ذہانت پر مُسکرایا، وہاں ایک اُداسی نے بھی اُسے جکڑ لیا۔ ایک ہنسی خوشی سے بھرپور شادی شُدہ زندگی گزارنے کے ارمان کس کے دل میں نہ ہوں گے۔ زندگی کے اندھیرے اور بےکیفی میں چاند ستاروں کی روشنی کی تمنا کسے نہ ہوگی۔

اُس کے ذہن پر ایک بوجھل پن، ایک غبار پھیلتا رہا۔ اُس کے ابا نے اُسکی

شادی کے لئے کتنی کوشش کی تھی۔ لیکن اُسکی بدصورتی کسی کو نہیں بھائی تھی۔ اور ابا بے چارے اُس کے سر پر سہرا دیکھے بغیر چل بسے تھے۔ ابا کے بعد امی نے کوشش کی تھی لیکن وہ بھی یہ ارمان سینے میں دفنائے ابا سے جا ملی تھیں۔ اور اب جب ماں باپ کا سہارا بھی چھوٹ گیا تھا تو اُس کے سینے میں بھی یہ ارمان سو گئے تھے آج رشیدہ نے یہ عجیب سی بات لکھ کر اُس کے خوابیدہ ارمانوں میں ایک درد آمیز ہلچل مچادی تھی۔ اُس نے رشیدہ کو خط اس طرح شروع کیا۔

"مانا کہ تم ایک ذہین فنکار ہو۔ لیکن ایک کم ذہین اور دور افتادہ شاعر کو اپنی غیر معمولی ذہانت اور فلک رس قوّتِ متخیلہ کا تختۂ مشق تو نہ بناؤ۔ کس کی بیوی اور کون سے چاند ستارے؟ فی الحال تو تم نے جو یہ بے شمار پیار چاند ستاروں کو بھیجا ہے وہ میں نے اپنی ہی جھولی میں ڈال لیا ہے۔ (اس دُنیا میں اتنا پیار کب اور کیسے ملتا ہے) اور بیوی کے نام کا آداب تمہیں ہی لوٹا دیتا ہوں"

ظفر نے اِس خط میں اور کئی باتیں بھی لکھیں۔ جو لکھنی چاہیئے تھیں وہ بھی۔ جو نہیں لکھنی چاہیئے تھیں وہ بھی۔ اُس نے ایک جگہ یہ بھی لکھ دیا۔

"تمہیں ابھی تک دیکھا نہیں ہے۔ لیکن ذہن نے تمہاری ایک تصویر بنالی ہے سوچتا ہوں، کیا کسی کو دیکھے بغیر اُس سے محبت ہو سکتی ہے؟ بہرحال اس سے پہلے کہ کوئی حادثہ یا ہماری ملاقات ہی میری اس ذہنی تصویر کو مٹا دے اُسے رقم کرنے کو جی چاہتا ہے۔ سُن لیجیے ـــ بیس سے پچیس سال تک کی ایک ذہین لڑکی جو کسی کے ہوش و حواس اُڑانے میں رہزن کی سی تیزی رکھتی ہو (یعنی صرف ایک دو خطوں ہی میں) پتلی دُبلی گھنیری پلکوں اور بڑی بڑی آنکھوں والی، سلونی اور صبیح لڑکی جو ایک اچھی دوست اور ایک زیادہ اچھی اور کامیاب بیوی ثابت ہو سکتی ہے۔"

اور خط دلکتابت ہی میں ان جذبات نے محبت کے لاتعداد بیج بو دیئے جو ایک بڑی ہریالی میں پھوٹ آئے۔ اور زندگی میں چاروں طرف بہار ہی بہار، حسن ہی حسن نظر آنے لگا۔ رشیدہ بھی ظفر کی طرف کھنچ گئی اور ایک بہت ہی طویل اور

جذباتی خط میں اُس نے بھی اظہارِ محبت کر دیا۔ اس روز ظفر کی مسرت کی کوئی انتہا نہ رہی اور وہ رشیدہ کے اِس فقرے کو کہ "آپ نے میرے خیالوں میں قوسِ قزح کے رنگ بھر ہی دیئے ہیں۔ میری زندگی میں بھی بھر دیجئے۔" بار بار پڑھ رہا تھا۔ اس نے رشیدہ کو ایک خوابوں سے زیادہ حسین خط میں اپنی ایک فوٹو بھیجنے کے لئے بھی لکھ دیا۔ رشیدہ نے اپنی تصویر بھیج دی اور ایک محبت بھرے خط میں لکھا۔

"جب دل ہی آپ کو دے بیٹھی ہوں تو شکل چھپانے سے کیا فائدہ؟ لیکن یہ تصویر ڈرتے ڈرتے بھیج رہی ہوں۔ جہاں تک ذہن گواہی دیتا ہے آپ خود بہت حسین ہوں گے۔ اور پتہ نہیں آپ کو یہ تصویر پسند آئے گی یا نہیں بہر حال جیسی بھی ہے بھیج رہی ہوں۔ خدارا اپنی بھی ایک چھوٹی سی تصویر بھیج دیجئے آپ کو دیکھنے کی ایک بے پناہ خواہش کب سے دل میں دبائے بیٹھی ہوں۔"

ظفر بار بار ان فقروں کو پڑھتا رہا۔ یہ ایک بہت ہی خوب صورت لڑکی کی تصویر تھی۔ ایک متناسب حسین چہرے پر نگینوں کی طرح جڑی ہوئی بڑی بڑی آنکھیں ظفر کو اس طرح دیکھ رہی تھیں جیسے مدت سے اُسے جانتی ہوں۔ اُن آنکھوں میں محبت کی ایک ضیا روشن تھی۔ تمناؤں کے چراغ جل رہے تھے۔ کلیاں کھلی تھیں اور پھول تھے۔

ظفر نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اُس کے دل میں ایک طوفان اُمڈ آیا تھا۔ اور آنکھوں کو بھینچنے کے باوجود دل کی گہرائیوں سے رِس رِس کر بے شمار آنسو اُن میں سمٹ آئے تھے۔ اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے چاروں طرف گہرا اندھیرا چھا گیا ہو۔ وہ اپنی آنکھوں کو اپنی باہوں میں چھپائے دیر تک لیٹا رہا۔ پھر اُس نے رشیدہ کے تمام خطوط اکھٹے کئے اور ایک کاغذ کے پُرزے پر یہ سطریں گھسیٹ دیں۔

"تمہارے تمام خطوط اور تصویر لوٹا رہا ہوں، تمہارا احسان کبھی نہ بھولوں گا کئی بار خیال آیا کہ یہ خط و کتابت بند کر دوں۔ لیکن جیسے کسی دلچسپ ناول کو شروع کر کے اُسے ختم ہی کرنے کو جی چاہتا ہے میں تمہیں خط لکھتا رہا۔ اور آج اِس کہانی کا انجام بھی ہو گیا ہے اِس خط و کتابت کو بڑھا کر میں نے یقیناً ایک گناہ کیا ہے۔ لیکن میں مجبور سا ہو گیا تھا۔

خدا کے لئے مجھے معاف کر دو۔ میں یہ گناہ اب زندگی بھر نہیں کروں گا۔

قدرت نے مجھے ایک بے حد بدصورت آدمی بنایا ہے۔ میرے چہرے پر چیچک کے اَن گنت داغ اور زخموں کے کئی نشان ہیں۔ تم جیسی حسین لڑکی کو یہ چہرہ دکھانا بھی گناہ ہے۔ خدا سے دعا ہے کہ تمہاری زندگی میں واقعی قوس قزح کے رنگ کھلیں۔

تم نے ایک خط میں میری بیوی اور میرے چاند ستاروں کا ذکر کیا تھا۔ جو میرے نہیں تھے۔ آج محسوس ہوتا ہے کہ میں نے اُس کی تردید کر کے بڑی غلطی کی تھی۔ میری بیوی اور میرے چاند ستارے بھی ہیں اور میری زندگی میں تمہارے آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ دوسری بات ہے کہ میری بیوی اور میرے چاند ستارے خیالی ہیں۔ مگر پھر اس دُنیا میں ہر چیز ہی حقیقی تو نہیں ہے۔"

ظفر کو یہ خط لکھ کر ایسا محسوس ہوا جیسے ایک کہانی، ایک کتاب ختم ہو گئی تھی۔ یا وہ کسی بڑے سفر کے بعد گھر لوٹ آیا ہو۔ اُس نے میز پر سے آئینہ اُٹھا کر اُس میں اپنے آپ کو دیکھا۔ اُس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور اُس کی آنکھیں سُرخ تھیں۔ جیسے وہ بہت دیر سے رو رہا ہو۔ یا کسی سُرخ آندھی میں گھر کر اُس میں سے ابھی نکلا ہو۔

اُس نے سامنے کی کھڑکی کھولی اور باہر جھانکنے لگا۔ ایک خالی خالی، اُجڑا آسمان اس شوریدہ اور بے رونق دُنیا کے سینے میں چھپی ہوئی اُداسی اور ویرانی کی عکاسی کر رہا تھا۔ اِس آسمان میں چاند اور ستارے بھی تھے۔ زمین پر چلنے پھرنے والے ستاروں سے کہیں زیادہ منوّر اور دیرپا۔ وہ بہت دیر تک اُن ننھے ننھے آنکھ جھپکتے ہوئے ستاروں کو دیکھتا رہا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ ننھے مُنّے بچّے بن گئے۔ وہ سب اپنی جگنو سی آنکھیں مٹکا رہے تھے۔ یہ سب چاند ستارے اُسی کے تو تھے ــــ!!

یہ بیمار جذبے

سدھیر نے جب اپنے نئے دفتر کا چارج لیا اور اپنے اسٹاف میں کام کرنے والوں سے ملا تو ایک لڑکی ورشا کو دیکھ کر وہ کچھ ٹھٹک سا گیا۔ یہ بات نہیں تھی کہ ورشا کو اُس نے پہلے کہیں دیکھا تھا یا اُس کے ساتھ کوئی ایسی داستان وابستہ تھی جسے اُس نے سُن رکھا تھا، بلکہ اس لئے کہ وہ اُسے بہت دلکش لگی تھی۔ بظاہر ورشا گورے رنگ کی اوسط درجے کی لڑکی تھی، پتلی دُبلی، چھوٹے سے قد کی لیکن خوبصورتی یا دلکشی کے بارے میں سدھیر کا اپنا ایک انوکھا معیار تھا اور وہ اپنی نظروں، ذہن اور دل سے جس لڑکی میں کوئی خاص بات دیکھ لیتا تھا، تو اُس کا پہلا ردّ عمل یہ ہوتا تھا کہ وہ چونک سا جاتا تھا جیسے یہ پہلی لڑکی ہو، جس میں یہ وصف یا خوبی ہے۔ جب دفتر کے ہیڈ کلرک نے ورشا کا تعارف اُس سے کرایا تھا تو ورشا نے بے حد دلفریب مُسکراہٹ سے اُس کی طرف دیکھا تھا اور سدھیر ٹھٹک کر رہ گیا تھا اور اُن چند ہی لمحوں میں اُس نے ورشا کی آنکھوں اور ہونٹوں میں بھی مسحور کُن کشش تلاش کرلی تھی۔ اُسی دن جب ورشا ایک فائل رکھنے کے لئے سُدھیر کے کمرے میں داخل ہوئی اور فائل رکھ کر جلدی سے نکل گئی تو سُدھیر نے دیکھا کہ ورشا کی چال میں بھی ایک دل آویز لچکیلا پن اور تیزی ہے جو کسی کو آسانی سے دیوانہ بنا سکتی ہے۔

سُدھیر کوئی پینتیس سال کا ایک خوبصورت اور قابل افسر تھا جس کے چہرے اور شخصیت میں بے حد کشش تھی۔ اُسے اپنی خوبیوں کا پورا احساس تھا اور ان خوبیوں نے لڑکیوں کے معاملہ میں اُسے ایک خود اعتمادی عطا کردی تھی۔ فطری طور پر وہ حسن و عشق کا دلدادہ تھا اور ہمیشہ نوجوان اور خوبصورت لڑکیوں میں دلچسپی لیتا رہا تھا۔ کالج ہی کے دنوں میں اُسے ایک لڑکی سے والہانہ عشق ہو گیا تھا مگر وہ لڑکی اس کی نہ بن سکی تھی۔ پھر جب وہ تعلیم سے فارغ ہوا اور مقابلے کے امتحان میں کامیاب ہو کر ایک سرکاری افسر بن گیا تو اُس کے ایک دو سال بعد ہی اُس کی شادی ہو گئی۔ اس کی عمر اُس وقت چھبیس سال کی تھی۔ اُس کی بیوی مدھو بہت خوبصورت اور پُر کشش تھی اور اب اُس کے دو بڑے پیارے بچے تھے۔ سدھیر اپنی بیوی سے بہت پیار کرتا تھا اور اپنی گھریلو زندگی میں بہت خوش اور مطمئن تھا لیکن پھر بھی کسی بھی خوبصورت لڑکی سے اس کا واسطہ پڑ جاتا تو وہ اُس کی طرف کھنچ جاتا اور دل ہی دل میں اُسے چاہنے لگتا اور اُسے حاصل کرنے کی پوری کوشش کرتا۔ ایسا بھی ہوتا کہ وہ ایک ہی وقت میں کئی لڑکیوں سے پیار کر رہا ہوتا اور اُنہیں پانے کے منصوبے بناتا رہتا۔ مگر وہ بہت احتیاط اور بہت فنکارانہ انداز سے کرتا تھا اور اُس کی اِس طرح کی کسی بھی بات کا کسی کو پتہ نہ چلتا۔ لیکن اس کی کسی لڑکی میں دلچسپی کبھی کوئی حادثہ نہ بنی۔ اُس کا ہر عشق کچھ منزلیں طے کر لیتا اور پھر اُس لڑکی کا یا اُس کا کسی اور دفتر میں تبادلہ ہو جاتا یا کسی خاص منزل پر وہ لڑکی سدھیر کے ارادے کو بھانپ لیتی اور اُس سے بولنا بند کر دیتی۔ ایک بات جو سُدھیر کے معاملہ میں ہمیشہ کبھی نہ کبھی حائل ہوتی وہ اُس کا شادی شدہ ہونا تھا۔ مگر وہ اپنی فطرت سے اتنا مجبور تھا کہ جس دفتر میں بھی ہوتا کسی نہ کسی لڑکی میں اُلجھ جاتا۔ شاید اس کے بغیر سدھیر کی زندگی ادھوری رہتی اور اُس کی شخصیت مکمل نہ ہو پاتی۔

ورشا سُدھیر کے دفتر ہی کی ایک کلرک تھی مگر سُدھیر کا اُس کے ساتھ براہِ راست کوئی واسطہ نہ پڑتا۔ کبھی کبھی ورشا کے سیکشن کا انچارج چھوٹا افسر ورشا

کو کوئی کاغذ یا فائل سدھیر کے کمرے میں رکھنے کو کہہ دیتا تو ورشا اُس کے کمرے میں آجاتی لیکن سدھیر اپنی فائلوں میں اتنا منہمک رہتا یا اُس کے پاس اُس وقت کوئی بیٹھا ہوتا کہ وہ ورشا کو زیادہ دیکھ بھی نہ پاتا اور ورشا ایک بلّی کی سی خاموشی اور تیزی کے ساتھ کاغذ یا فائل رکھ کر چلی جاتی۔ مگر دن بھر میں ایک دو بار اُس کا آمنا سامنا ضرور ہو جاتا۔ کبھی سُدھیر ہی کوئی فائل لینے سیکشن میں چلا جاتا یا برآمدے میں آتے جاتے وہ کبھی مل جاتی۔ ایسے میں سدھیر جب ورشا کی طرف دیکھتا تو وہ اپنے مخصوص دلفریب انداز میں مُسکرا دیتی اور بہت دیر تک سدھیر ورشا کے بارے میں سوچتا رہتا تھا۔

جوں جوں وقت گزرتا گیا اور دن مہینوں میں بدلتے رہے، ورشا سدھیر کے دل و ذہن پر چھاتی رہی۔ انہوں نے ایک دوسرے سے تفصیل سے کبھی کوئی بات نہ کی تھی۔ مگر سُدھیر ورشا کے حسین چہرے اور جسم کے بارے میں تقریباً ہر روز ہی سوچتا رہا تھا۔ کچھ دنوں سے وہ زیادہ پریشان ہو گیا تھا اور رات کو بھی جب مدھو سو جاتی تو وہ ورشا کے بارے میں سوچتا رہتا اور اُس سے بات کرنے اور اُس کے نزدیک آنے کے منصوبے بناتا رہتا۔ ایک دن اُس نے ورشا سے زیادہ تعلق قائم کرنے کے لئے کسی بہانے سے اُسے اپنے کمرے میں بُلوا بھیجا۔ جب وہ اندر داخل ہوئی تو اُسی دلفریب انداز میں مسکرائی۔ آج وہ گہرے نیلے رنگ کی نئی وضع کی سلی ہوئی شلوار قمیص پہنے ہوئے تھی۔ اُس کی لپ اسٹک کا رنگ چاکلیٹ سے ملتا تھا۔ وہ سدھیر کی میز کے پاس آکر کھڑی ہو گئی۔ کچھ لمحوں کے لئے سدھیر کے ہوش و حواس گم ہو گئے۔ ورشا سدھیر کے بالکل سامنے اُس کی میز سے لگی کھڑی تھی۔ آج وہ اُسے بہت ہی خوبصورت لگی۔ سدھیر بولا۔

"بیٹھو نا۔"

ورشا اُس کے سامنے پڑی کرسی پر بیٹھ گئی۔ اُس نے ورشا کو ایک چٹھی دے دی کہ اس کی دو کاپیاں ٹائپ کر دینا اور پھر بات شروع کرنے کے لئے بولا۔

" ورشا تم کہاں رہتی ہو ؟ "

" رام نگر میں " اُس نے مُسکراکر جواب دیا۔

اور وہ دونوں جلد ہی ایسی بے تکلفی سے باتیں کرنے لگے جیسے بس اِسی موقع کے منتظر تھے۔ صرف چند ہی منٹ کی بات چیت میں انہوں نے ایک دوسرے کے بارے میں بہت سے ذاتی سوال پوچھ لیئے۔ اِس شاندار آغاز کا سہرا بلاشبہ سدھیر کے سر تھا کیونکہ سدھیر جاذب نظر ہونے کے علاوہ گفتگو کرنے کے اعتبار سے ایک فن کار تھا اور اُس کے بات کرنے کے انداز میں ایک جادو سا تھا۔ ورشا کی شادی ہوگئی تھی۔ اُس کے دو سال کا ایک لڑکا بھی تھا۔ اُس کا شوہر کسی بینک میں کلرک تھا۔ یہ بات کہ ورشا شادی شُدہ ہے۔ سدھیر کے لئے کوئی زیادہ معنی نہیں رکھتی تھی اور اِن معلومات سے اُس کے جوش و خروش میں کوئی کمی نہ آئی۔ اُس کی ورشا کے ساتھ اِس بے حد خوشگوار بات چیت کا خاتمہ جبھی ہوا جب سدھیر کے کمرے میں دو اور افسر داخل ہو گئے۔

سدھیر ایک ذمّے دار افسر ہونے کے باوجود ذہنی طور پر ایک ناپختہ نوجوان تھا۔ اِس کی ایک وجہ تو شاید دفتر میں دو آدمیوں سے اُس کی دوستی تھی۔ اُس کے یہ دو دوست اشتیاق احمد اور ستیش تھے۔ یہ دونوں اُسی بلڈنگ میں مگر کسی اور دفتر میں کام کرتے تھے۔ لنچ کے گھنٹے میں یہ دونوں سدھیر کے کمرے میں آجاتے تھے اور پھر تینوں لڑکیوں کی باتیں کرتے رہتے۔ اشتیاق احمد اور ستیش سدھیر کی رنگین اور بے حد دلچسپ باتیں کہ کس لڑکی کے ساتھ کیا بات اور کتنی ترقی ہوئی سننے آتے تھے۔ شاید اشتیاق احمد اور ستیش کے لئے تو یہ بات چیت ذہنی عیّاشی اور تفریح کے بہترین لمحے مہیّا کرتی مگر سدھیر سنجیدگی سے اپنے ہر عاشقے کو کامیابی کی منزل کی طرف لے جانے کے لئے منصوبے بناتا رہتا یہ اور بات تھی کہ شاید ہی مکمل کامیابی نے کبھی اس کے قدم چومے ہوں۔ اُن دنوں لنچ کے وقت میں اُن تینوں کی گفتگو کا موضوع تین لڑکیاں تھیں جو سدھیر کے ذہن پر بیک وقت

چھائی ہوئی تھیں۔ یہ تھیں اپنی اہمیت کی ترتیب سے۔ اُس کے اپنے دفتر کی ورشا، اُس کے پچھلے دفتر میں کام کرنے والی لڑکی اسمار اور ایک انجانی اور ان دیکھی لڑکی سیما جس کے ساتھ ایک دن بالکل ایک حادثے کے طور پر غلط نمبر مل جانے سے فون پر اُس سے بات ہو گئی تھی۔ سیما کی آواز میں بے حد شیرینی اور شوخی تھی اور وہ جلترنگ کی سی مترنم آواز سیدھی سدھیر کے دل میں اُتر گئی تھی۔ سیما کسی دفتر میں ٹیلی فون آپریٹر تھی۔ اور اس نے بہت بیباکی سے سُدھیر کو اپنا نام بتا دیا تھا اور اُس سے جلد ہی ملنے کا وعدہ بھی کر لیا تھا۔ سیما کے پوچھنے پر سدھیر نے جھوٹ بول دیا تھا کہ ابھی اس کی شادی نہیں ہوئی ہے۔ اسمار کے ساتھ تو وہ اپنے پچھلے دفتر ہی میں کافی آگے بڑھ گیا تھا۔

ایک دن دفتر ہی میں ورشا سے بہت پُر لطف اور امید افزا بات ہوئی مگر ورشا کے جاتے ہی وہ آج کی اُس پُر لطف شام کے بارے میں سوچنے لگا جس میں ناز سنیما پر اُس کی سیما سے ملاقات ہوگی۔ اس کے لئے آج اُسے دفتر میں کافی دیر تک بیٹھنا پڑے گا کیونکہ سیما کی چھٹی شام کو ساڑھے سات بجے ہوتی تھی اور اُس سے آٹھ بجے ملنے کا وعدہ کیا تھا۔ سدھیر سات بجے تک تو دفتر ہی میں بیٹھا رہا اور پھر ساڑھے سات بجے ناز سنیما پہنچ گیا۔ مگر سیما کے آنے میں ابھی آدھ گھنٹہ باقی تھا، وہ بے مقصد اِدھر اُدھر پھرتا رہا۔ ٹھیک آٹھ بجے وہ سنیما پر لوٹ آیا۔ سیما نے اُسے بتا دیا تھا کہ وہ ہرے رنگ کی ساڑی پہنے ہوگی۔ اُس کے ہاتھ میں سُرخ رنگ کا پرس ہوگا۔ اور وہ اسے فرسٹ کلاس کی بکنگ کی کھڑکی کے پاس ملے گی۔ ہرے رنگ کی ساڑی پہنے، ایک لڑکی فرسٹ کلاس کی بکنگ کی کھڑکی کے پاس ادھر کی طرف پیٹھ کئے کھڑی تھی اور دیوار پر لگی ہوئی پکچر کی تصویروں کو دیکھ رہی تھی۔ سُدھیر نے اُس کے ہاتھ میں سُرخ رنگ کے پرس کو دیکھ لیا۔ وہ اُس کے برابر جا کر کھڑا ہو گیا۔ سیما نے فوراً ہی مڑ کر دیکھا اور بڑے یقین کے ساتھ ہیلو سدھیر! کہا۔

سدھیر سیما کو لے کر اوپر بنے ریستوران میں جا کر بیٹھ گیا تھا لیکن وہ سیما کو دیکھ کر بہت مایوس ہوا تھا۔ ٹیلی فون پر سیما کی پائل کی جھنکار سے ملتی آواز اور کسی بہتی مچلتی ندی یا جھرنے کی آواز کی طرح نقرئی ہنسی اس حقیقی سیما سے کوئی مناسبت نہ رکھتی تھی۔ ان دنوں سیما کی جو تصویر سدھیر نے اپنے ذہن میں بنا لی تھی وہ اُسے دیکھتے ہی چکنا چور ہو گئی تھی۔ سیما ایک کمزور جسم کی، معمولی خدوخال کی کالی عورت تھی جس کی عمر بھی تیس پینتیس سال سے کم نہ تھی۔ پھر بھی سدھیر ریستوران کی میز پر سیما کے سامنے بیٹھ کر مسکراتا رہا کیونکہ وہ خود تو حسین تھا اور ایک حسین مرد یا عورت، اپنے ساتھی کی شکل وصورت سے بے نیاز ہو کر خود نمائی کی کوشش میں مسکراتا ہے۔ وہ ریستوران میں مشکل سے بیس پچیس منٹ بیٹھے ہوں گے۔ سدھیر کی مسلسل مسکراہٹ سے سیما کے دل میں ایک بھروسہ یا امید پیدا ہو گئی کہ وہ اُسے پھنسا لے گی۔ مگر وہ بہت ہوشیار اور تجربے کار عورت تھی اور اس چھوٹی سی پہلی ہی ملاقات میں اس نے محبت کے مختلف نظریوں پر سدھیر سے بات کر لی اور اُسے صاف کہہ دیا کہ وہ ایک لمبی بے مقصد محبت کی راہ جسے وہ آوارگی سے تعبیر کرے گی کے مقابلے میں فوری شادی کو زیادہ پسند کرے گی اور اس نقطے پر پہنچتے ہی اُس نے سدھیر سے جو دیکھنے میں پچیس چھبیس سال کا نوجوان لگتا تھا یہ سوال پوچھ لیا کہ اس نے اب تک شادی کیوں نہیں کی تھی؟

سدھیر اُس دن رات کو ساڑھے نو بجے گھر پہنچا۔ وہ جب کبھی اپنے آپ کو اس طرح کی ذہنی عیاشی اور آوارگی میں مبتلا کرتا تو ایک عجیب ندامت اور اُداسی کا احساس اُسے جکڑ لیتا مگر یہ احساس وقفے کے اعتبار سے بہت ہی عارضی ثابت ہوتا۔ لیکن آج وہ خاص طور پر مضمحل اور غمگین تھا اور اُس نے شدت سے محسوس کیا کہ یہ اُداسی شاید کبھی ختم نہ ہو گی کیونکہ آج وہ ایک بہت گھٹیا اور بازاری سطح پر اُتر آیا تھا۔ اُس کی بیوی مدھو گھر پر اُس کا انتظار کر رہی ہو گی اور بہت پریشان ہو گی کیونکہ آج اُسے بہت ہی زیادہ دیر ہو گئی تھی۔ جب سدھیر گھر پہنچا تو اُس نے

واقعی مدھو کو بے حد پریشانی کی حالت میں پایا۔ دونوں بچّے ابھی تک جاگ رہے تھے حالانکہ وہ ہر روز آٹھ ساڑھے آٹھ بجے سو جایا کرتے تھے۔ سدھیر نے پہلے بچّوں کو پیار کیا، پھر مدھو کو دفتر سے اتنی دیر میں آنے کی جھوٹی وجہ بتائی اور اُس کے بعد مدھو کے ساتھ کھانے کی میز پر بیٹھ گیا۔ وہ کھانے کی میز پر ایک کھویا کھویا سا انسان تھا۔

اُس دن سُدھیر بہت رات تک نہ سویا۔ اُس کی بیوی خوبصورت اور اعلیٰ تعلیم یافتہ ہی نہ تھی بلکہ اپنے شوہر اور بچّوں پر جان چھڑکتی تھی اور یہ گھر اس کی جنّت تھا۔ اس کے مقابلے میں سدھیر ایک بے روح حسین بُت تھا۔ اُس کی شادی ہوئے نو دس برس ہو گئے تھے لیکن اُس کا ذہن اب بھی کتنا مریض، کتنا زنگ آلود تھا کہ دس سال کی ہنسی خوشی سے بھرپور زندگی بھی اُسے اُجلا نہ کر سکی تھی۔ مدھو تھک ہار کر سو چکی تھی مگر سُدھیر اُس کے پاس ہی لیٹا ہوا اپنی اخلاقی بے راہ روی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ آج اُسے ایک شدید غیر ذمّے داری بلکہ گناہ کا احساس ہوا۔ اتنے میں مدھو کروٹ بدل کر اُس کے بالکل قریب آگئی تھی اور اس نے پیار سے اپنا بازو سدھیر کے سینے پر رکھ دیا تھا۔ وہ چاند کی طرح دُھلی دُھلی، اُجلی اور کلی کی طرح معصوم تھی سُدھیر نے بہت پیار سے اُس کا ہاتھ اپنے سینے پر سے ہٹائے بغیر اُس کی طرف کروٹ لے لی۔

ایک رفیق کی موت

دھرماکو بیس برس ہوئے میری زندگی میں داخل ہوا تھا۔ اُن دنوں میں شملہ میں تھا، جہاں میں نے ایک فوجی یونٹ میں سبزی کی سپلائی کا ٹھیکہ لے رکھا تھا۔ مجھے ایک دیانت دار آدمی کی ضرورت تھی، جو منڈی سے سبزی خرید کر سیدھا یونٹ میں سپلائی کر آئے۔ اور کسی نے مجھ سے دھرماکو رکھنے کی سفارش کر دی تھی۔ دھرما ایک جفاکش پہاڑی آدمی تھا، جس نے شروع شروع میں گھریلو ملازم کے طور پر کام کیا تھا۔ بعد میں اپنے کچھ عرصے رکشا چلائی، اور اب کئی برس سے سبزی منڈی میں کام کر رہا تھا۔ اُس وقت اس کی عمر پچیس سال کی ہوگی۔ وہ سُرخ و سفید گول چہرے اور مضبوط جسم کا ایک سادہ لوح آدمی تھا۔ جب میں نے اُس سے پوچھا تھا کہ کیا تنخواہ لوگے تو اس نے ایک عجیب سا جواب دیا تھا۔ "مجھے صبح کی چائے، دو وقت کی روٹی اور ایک آنہ روز بیڑی کے لئے چاہیئے اور دس روپیہ مہینہ ماں کو بھیجنے کے لئے۔ بس یہی میری تنخواہ ہے۔"

میں نے دھرما کو بغیر کچھ طے کئے رکھ لیا تھا۔ میرا کاٹھ بازار میں ایک چھوٹا سا مکان تھا۔ یہ مکان کبھی کسی گلشن کی طرح خوب صورت تھا، مگر جب سے میری بیوی کا انتقال ہوا تھا یہ مکان مجھے ایک قبرستان لگتا تھا،

اور اُس کا اُجاڑپن اور در و دیوار سے ٹپکتی ہوئی نحوست مجھے کاٹ کھانے کو دوڑتی تھی۔ کانتا صرف تین سال کی رفاقت کے بعد ہسپتال میں ایک مرے ہوئے بچے کو جنم دے کر چل بسی تھی اور میں اُس سے بات بھی نہیں کر سکا تھا۔ جب وہ زندہ تھی تو میں خود ہر روز سبزی خریدتا اور یونٹ میں سپلائی کرتا تھا۔ لیکن اُس کی موت کے بعد کوئی کام کرنے کو میرا جی نہیں چاہتا تھا۔ دھرما نے نوکر ہوتے ہی سارا کام ہاتھ میں لے لیا۔ گھر کا سارا کام یعنی چائے بنانا، پانی گرم کرنا، روٹی بنانا، برتن صاف کرنا، بازار سے چیزیں لانا اُسی کے ذمہ تھا۔ اس کے علاوہ وہ صبح سویرے منڈی سے سبزی خریدتا اور یونٹ میں دیکر آتا۔ وہ رات کے دس گیارہ بجے سے پہلے کبھی نہیں سوتا تھا۔ اور سونے سے پہلے میرے پاؤں بھی دباتا تھا۔ کسی قسم کی بے ایمانی اس کو چھو کر بھی نہیں گئی تھی۔ اور اس نے کبھی مجھ سے ماں کو روپے بھیجنے کے علاوہ ایک پیسہ بھی تنخواہ کا نہیں لیا۔ بہت جلد میں یہ محسوس کرنے لگا کہ وہ میرا نوکر نہیں دوست تھا۔

شملہ میں ویسے میرے کئی دوست تھے۔ ایک امرت تھا جو ڈپٹی کمشنر کے دفتر میں ایک خاص پوزیشن کا مالک تھا۔ اُس کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ بہت رشوت لیتا تھا۔ لیکن میری اور اُس کی دوستی اُس کی دفتری زندگی سے بالاتر تھی۔ اس کا اپنا ایک تین منزلہ مکان تھا اور اُس میں اتنا قیمتی اور اعلیٰ سامان تھا کہ اُس کی تنخواہ والا آدمی اُن کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ امرت ولائتی شراب بھی پیتا تھا۔ جو اُسے آسانی سے رشوت میں مل جاتی تھی۔ جب تک کانتا زندہ رہی امرت مجھے شراب پینے کے لئے راغب نہ کر سکا۔ لیکن کانتا کے مرنے کے ایک مہینے بعد ہی میں نے اُس کے ساتھ شراب پینا شروع کر دیا تھا۔ آمدنی میری بھی معقول تھی اور اسے کہیں نہ کہیں خرچ بھی کرنا تھا۔ دوسرا دوست خالد تھا۔ وہ ایک اچھا شاعر تھا۔ شروع میں اُس کی اسی خوبی نے مجھے کھینچا تھا۔ مگر بعد میں معلوم ہوا کہ خالد کو جوا کھیلنے کا شوق بھی تھا۔ جوئے اور شاعری میں مجھے

کوئی مناسبت نظر نہیں آئی اور اب تک مجھے ایسا کوئی شاعر نہیں ملا تھا جو جوئے کا بھی عادی ہو۔ لیکن خالد جتنا اچھا شاعر تھا اتنا ہی اچھا برج بھی کھیلتا تھا۔

لیکن سب تنگ دست آدمیوں کی طرح خالد کی قسمت بھی خراب تھی۔ وہ رات کو جوئے میں قرض لئے ہوئے پیسے ہار دیتا۔ خالد شادی شدہ تھا اور اس کے دو بچے تھے لیکن وہ ہر وقت کھویا کھویا سا رہتا تھا اور ایسی باتیں کرتا تھا جیسے اُس کی اب بھی کوئی محبوبہ تھی یا شاید وہ اپنی محبوبہ کو ابھی تک نہیں بھول سکا تھا۔ یہ فن کار بھی بڑے عجیب ہوتے ہیں جن کے دِل میں بسی ہوئی محبوبہ کبھی نہیں مرتی۔ خالد نے کانتا کی موت کے بعد مجھے جُوا کھیلنا سکھا دیا تھا۔

تیسرا دوست رام سرن تھا۔ یہ شملہ کا ایک بڑا بزنس مین تھا۔ مال روڈ پر ہی اُس کی دو بڑی دکانیں تھیں۔ کئی ہزار روپے ماہوار کی آمدنی تھی۔ اس کے دو شوق تھے۔ ایک جوتشیوں کو اپنی جنم پتری اور ہاتھ دکھانا، اور دوسرا بزنس میں بے ایمانی کے نئے نئے گر آزمانا۔ اگر مجھے پیسے کی زیادہ ضرورت پڑتی تو رام سرن سے بے ایمانی کے کچھ گر سیکھ لیتا۔ لیکن جوتش اور پیشن گوئی میں یقین نہ رکھنے کے باوجود میں اُس کے ساتھ ایک روز اُس کے جوتشی کے پاس بھی پہنچ گیا اور اُس نے میرا ہاتھ دیکھتے ہی بتا دیا کہ میری بیوی کو مرے ہوئے صرف چھ مہینے گزرے ہیں اور یہ کہ میری دوسری شادی ناگزیر ہے، مگر میں اتنا بدقسمت ہوں کہ وہ بیوی بھی نہیں بچے گی اور میری تمام زندگی بغیر رفیق کے گزرے گی!

کانتا کے مرنے کے بعد مجھ میں جو ایک نمایاں تبدیلی آئی وہ یہ تھی کہ میں ہر شام کو اپنے مکان میں اپنے دوستوں کو اکٹھا کر لیتا اور گیارہ بارہ بجے تک خوب ہا ہو ہوتی رہتی یا یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ میرے دوستوں کو ایک ایسا ٹھکانہ مل گیا تھا جہاں وہ آرام سے بیٹھ کر تاش کھیل سکتے تھے، اور شراب پی سکتے تھے۔ امرت، خالد اور رام سرن کے علاوہ اُس محفل میں اور بھی کئی آدمی آنے لگے۔ میرے دوستوں کا حلقہ وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا۔ یہ سب لوگ وہ تھے جو رات کے گیارہ بارہ بجے اپنی سوتی ہوئی یا انتظار میں جاگتی ہوئی بیویوں کو اٹھا کر کھانا کھانے میں لطف محسوس کرتے تھے اور اُس وقت تک شراب سے اپنے کلیجے چھلنی کرتے رہتے تھے۔ میں پہلے سگریٹ نہیں

پیتا تھا، مگر اب ان دوستوں کی صحبت میں سگریٹ بھی پینے لگا۔ دراصل میں یہ محسوس کرنے لگا تھا کہ سگریٹ اور شراب کا چولی دامن کا ساتھ ہے اور ایک کا مزہ دوسرے کے بغیر نہیں آتا۔

ہماری ان محفلوں کا سب سے زیادہ بوجھ دھرما پر پڑتا تھا۔ اُسے کڑاکے کی سردی میں بھی کبھی چائے اور بار بار نیچے بازار جاکر سگریٹ کے پیکٹ لانے پڑتے تھے مگر اُس نے کبھی اُف تک نہیں کی۔ ہم نے کئی دفعہ بچی ہوئی شراب دھرما کو پینے کے لئے دینا چاہی، مگر اُس نے ہمیشہ کانوں کو ہاتھ لگا کر انکار کر دیا۔ میری طرح دھرما کی زندگی میں بھی جہاں تک جذبات اور احساسات کی آسودگی کا تعلق تھا کوئی سُکھ نہ تھا۔ اس کی شادی تک نہیں ہوئی تھی اور نہ کبھی شاید اُس نے اس کے بارے میں سوچا تھا۔ وہ اپنے کام میں مست رہتا تھا اور اپنی محنت میں وہ مسرت پا لیتا تھا جو ہم اپنی عیاشی میں کھو دیتے تھے۔ بعض اوقات مجھے یہ محسوس ہوتا تھا کہ میری زندگی دھرما کے مقابلے میں کہیں زیادہ حقیر تھی، کیونکہ جہاں وہ اَن پڑھ ہوتے ہوئے بھی قابلِ قدر قوتِ ارادی کا مالک تھا، وہاں میں آرزوؤں کے طوفان میں خس و خاشاک کی طرح بہہ گیا تھا اور میں نے اپنے غم کا مداوا کرنے کے لئے کئی مشغلوں میں فرار کی راہیں ڈھونڈلی تھیں۔

ایک روز دھرما کے گاؤں سے ایک آدمی آیا اور اُس نے یہ خبر دی کہ اس کی ماں بہت بیمار ہے اور اُس کے بچنے کی کوئی اُمید نہیں تھی۔ یہ سنتے ہی دھرما گھبرا گیا اور اُس نے اسی وقت مجھ سے اپنے گاؤں جانے کی اجازت مانگی۔ میں نے اُسے سو روپے دیے اور اُس نے اُسی وقت اپنی گٹھڑی باندھی اور اپنے گرد کمبل لپیٹ کر جانے کو تیار ہو گیا۔

"ماں اب نہیں بچے گی بابوجی" وہ بار بار کہہ رہا تھا۔ پھر چلتے ہوئے اُس نے رندھے ہوئے گلے سے کہا "میرا ماں کے سوا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے مگر دکھ یہ ہے کہ اُس کی سیوا نہ کر سکا بابوجی، اِس دنیا میں سب کچھ مل جائے گا، ماں نہیں ملے گی۔"

دھرما چلا گیا، اور میری زندگی میں پھر ایک خلا پیدا ہو گیا۔ شام کی محفلوں کے باوجود یہ گھر پھر سُونا اور منحوس نظر آنے لگا۔ میں نے کھانا ہوٹل میں کھانا شروع کر دیا اور سبزی خود خریدنے لوور یونٹ میں سپلائی کرنے لگا۔ اُس وقت مجھے دھرما کی اہمیت کا شدید احساس

ہوا۔ ایک مہینہ بڑی مشکل سے کٹا۔ آخر ایک بڑی ٹھنڈی شام کو دھرما کانپتا اور سکڑتا ہوا واپس آگیا۔ اُس کا سر منڈا ہوا تھا اور داڑھی بڑھی ہوئی تھی۔ وہ دہلیز میں بیٹھ کر آہستہ سے بولا "ماں کی دس پندرہ دن سیوا کی، مگر پچھلی پورن ماشی کو وہ گزر گئی۔ اب اس دنیا میں آپ کے سوا میرا کوئی نہیں۔"

میں نے اُسے اٹھا کر اپنے پاس چارپائی پر بٹھا لیا۔ اسٹوو پر چائے چڑھی ہوئی تھی میں نے اُسے گرما گرم چائے کی پیالی دی۔ پھر نیچے ہوٹل سے اُس کے لئے کھانا منگوانا چاہا مگر اُس نے انکار کر دیا اور اسی طرح کمبل میں لپٹا لپٹایا دوسرے کمرے میں جاکر سو گیا۔ تھوڑی دیر میں میں نے جاکر دو کمبل اور اس کے اوپر ڈال دیئے۔

دھرما کے واپس آنے کے تقریباً ایک مہینے بعد ہی میرا ٹھیکہ خلاف توقع ختم ہو گیا میں نے ٹینڈر بھرا تھا اور بڑی کوشش کی کہ اگلے سال کا ٹھیکہ بھی مجھے مل جائے مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ بعد میں پتہ چلا کہ میرے دوست رام سرن نے یہ ٹھیکہ اپنے کسی رشتہ دار کو دلوا دیا تھا، مگر یہ سُنی سنائی بات تھی اور مجھے اس کا یقین نہیں آیا اور نہ میں نے رام سرن سے اس کا ذکر کیا۔ لیکن یہ فکر ضرور لاحق ہوئی کہ اب کیا کیا جائے کچھ عرصے سے دوستوں کی محفلوں میں خرچ اتنا ہو رہا تھا۔ اس میں جوئے میں ہاری ہوئی رقمیں بھی شامل تھیں۔ کہ پیسہ بچنے کا سوال ہی نہیں تھا۔ ایک دو مہینے تجویزیں بنانے اور سوچنے میں گزر گئے۔ جب دوستوں کو یہ علم ہوا کہ میرا ٹھیکہ چھوٹ گیا ہے تو انہوں نے خود ہی آنا جانا کم کر دیا۔ کسی آدمی نے خبر دی کہ لوئر مال پر ایک دکان بک رہی ہے کیوں کہ مالک شملہ چھوڑ کر باہر جا رہا تھا۔ اُس کے لئے دس ہزار روپے کی ضرورت تھی اور میرے پاس صرف پانچ ہزار تھے۔ میں اسی شام کو امرت اور رام سرن کے پاس پہنچا اور اُن سے مدد مانگی۔ مگر اُن دوستوں نے یہ کہہ کر معذرت چاہی کہ صرف چند روز ہوئے انہوں نے اپنا روپیہ کہیں لگا دیا تھا اور میں نے اُن سے پہلے کیوں نہیں کہا۔

میں شملہ میں دو مہینے اور رہا ہوں گا۔ پھر کوٹ دوارہ سے ایک واقف کار کی چٹھی آئی، کہ وہاں کے جنگلات میں لکڑی کاٹنے کا ٹھیکہ مجھے مل سکتا تھا اور اُس کے لئے پانچ چھ ہزار روپے کا سرمایہ ہی کافی تھا۔ میں کوٹ دوارہ پہنچا حکام سے ملا اور وہ ٹھیکہ مجھے مل گیا۔ میں نے واپس آکر اپنے مکان کی سب چیزیں بیچ دیں اور دھرما کو لے کر کوٹ دوارہ پہنچ گیا۔ وہاں پہنچتے ہی میں نے کام شروع کر دیا۔

کوٹ دوارہ میں مجھے نئے دوست مل گئے سیٹھ منا لال، برج بہاری اور مشتاق علی

میرے مکان میں اُن کی بھی محفلیں لگنے لگیں۔ یہ سب کے سب پہلے سے شراب اور تاش کے دلدادہ تھے اس لئے شملہ کی زندگی یہاں بھی دُہرائی جانے لگی۔ یہ کوئی عجیب بات نہیں تھی۔ کیوں کہ نا موں کے اختلاف کے ساتھ ہر شہر میں مُنا لال، برج بہاری اور مشتاق علی ہوتے ہیں۔ لیکن اس جگہ ایک عجیب بات بھی ہوئی تھی اور وہ یہاں تین سال رہنے کے بعد ہوئی۔ میری واقفیت ایک استانی رادھا سے ہو گئی وہ میری ہی عمر کی ایک خوب صورت بیوہ تھی۔ یہ واقفیت پہلے پسندیدگی کے جذبے اور پھر رفاقت میں بدل گئی۔ ہم دونوں نے شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس فیصلے کا سب سے زیادہ خیر مقدم دھرما نے کیا۔ میں نے ایک روز کورٹ میں رادھا سے شادی کر لی۔ اور اس طرح جوتشی کی وہ بات بھی پوری ہو گئی کہ میری دوسری شادی ضرور ہو گی۔ اگر یہی اتفاقات جوتشیوں کی باتیں نہ بن جائیں تو جوتشیوں کو کون پوچھے گا۔

رادھا نے میری خواہش پر نوکری چھوڑ دی میرے مکان میں دوستوں کی محفلیں جمتی رہیں۔ اگرچہ اب اتنی باقاعدگی سے نہیں۔ میں نے کوشش کی کہ شراب چھوڑ دوں مگر یہ نہ چھوٹ سکی۔ جب تک شراب پینے والے دوست تھے، شراب کے چھٹنے کا سوال ہی نہیں تھا اور ایسے دوست جتنی آسانی سے مل جاتے ہیں اتنی ہی مشکل سے چھٹتے ہیں۔ رادھا نے شروع شروع میں اعتراض کیا مگر آہستہ آہستہ وہ بھی سمجھ گئی کہ میں اس زندگی کا عادی ہو گیا تھا۔ آمدنی اس ٹھیکے میں بھی معقول تھی۔ دھرما صبح کو تھوڑا بہت گھر کا کام کاج کر کے سیدھا میرے لکڑی کی چرائی کے کام پر چلا جاتا اور دن ڈھلے لوٹتا اور آتے ہی پھر گھر کے کام میں جٹ جاتا۔ اُس کی محنت، اُس کے خلوص، اُس کی سادگی اور اُس کی بے لوث خدمت میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ وہ اب بھی رات کو سونے سے پہلے میرے پاؤں دباتا تھا۔ اُس کی ماں چونکہ مر چکی تھی، اس لئے وہ اب کوئی تنخواہ بھی نہیں لے رہا تھا۔ بلاشبہ وہ اس گھر کا ایک فرد بن گیا تھا اور میں اکثر سوچتا تھا کہ اب بھی چند انسان ایسے ہیں جن کی خوبیوں اور قدروں کو وقت کی دورنگی اور دوسروں کی خود غرضی بھی زنگ آلود نہیں کر سکتی۔

ہم کوٹ دوارہ میں دس سال رہے ہوں گے نویں سال کے آخر میں جب ہم اُمید کھو چکے تھے تو ہمارے یہاں ایک خوبصورت بچی ہو گئی۔ ہم نے اُس کا نام میرا رکھا۔ میرا کے ہوتے ہی زندگی میں ایک نئی اور انوکھی دلچسپی پیدا ہو گئی۔ دھرما تو میرا کا شیدائی تھا۔ پھر یہاں ہمارا کام ختم ہو گیا اور اب کے ہمیں اُس جگہ سے بھی ستر اسی میل پرے ایک ایسے علاقے میں جانا پڑا جہاں سال میں

نو مہینے برف باری ہوتی تھی۔ روزی کی تلاش بھی آدمی کو کہاں کہاں لے جاتی ہے۔ اُس مقام پر کچھ سڑکیں بن رہی تھیں اور مجھے ایک چھوٹا سا ٹھیکہ مل گیا تھا۔ ہمیں یہاں اپنے کام کے پاس ہی ایک چھوٹی سی فوجی بارک میں رہنے کی جگہ مل گئی تھی۔ اُس بارک میں اب بہت سے سویلین اور کچھ ٹھیکے دار رہتے تھے۔ دو چار دن میں ہی اُس جگہ پر بھی میرے نئے دوست بن گئے۔ رام ناتھ خلیل اور بختاور۔ اتنی اونچائی، دوری اور اجاڑپن میں بھی دوستی کا معیار مختلف نہیں تھا۔ شراب اور تاش یہاں بھی یکساں مقبول تھے۔

ایک روز سہ پہر کو جب میں اور دھرما گھر سے کوئی ایک میل دور اپنے کام پر بیٹھے ہوئے تھے تو اچانک موسم خراب ہو گیا۔ تیز اور تند طوفانی ہوا خوفناک سیٹیاں بجاتی ہوئی چلنے لگی اور تیز بارش چادروں کی صورت میں تقریباً ہم پر ٹوٹ پڑی۔ چاروں طرف گھُپ اندھیرا چھا گیا تھا۔ ایک گھنٹہ میں یہ طوفان تھما تو برف پڑنے لگی۔ ہم نے اپنے اپنے اوور کوٹ پہنے، سر کو ڈھانپا اور طوفانی لالٹین ہاتھ میں تھامے گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔ تاریکی میں ڈوبی ہوئی بارک سنسان اور اجاڑ پڑی تھی کیونکہ سب لوگ اندر گھروں میں دُبکے ہوئے تھے۔ بارش بند ہو گئی تھی اور برف ایک پُر اسرار آواز کے ساتھ آہستہ آہستہ گر رہی تھی اور بارک کی ٹیڑھی میڑھی چھتیں برف کی سفید چادر اوڑھے ایسی لگ رہی تھیں جیسے بہت سے مُردے کفن اوڑھے اپنی قبروں میں سے نکل کر کھڑے ہو گئے ہوں۔ میں نے اپنے گھر کے چبوترے پر قدم رکھ کر لالٹین اٹھائی تو ٹھٹھک کر رہ گیا۔ کیونکہ دروازہ بالکل کھلا تھا۔ میں اور دھرما تیزی سے اندر داخل ہوئے مگر میری بیوی رادھا اور لڑکی میرا دونوں وہاں نہیں تھیں۔ دھرما بولا شاید کسی کام سے باہر گئی ہوں گی اور طوفان نے گھیر لیا ہو گا۔ ہم نے دو کمبل اوڑھ لئے۔ برف ہٹانے کے بیلچے سنبھالے اور لالٹین ہاتھوں میں پکڑے فوراً باہر نکل گئے۔

باہر آ کر میں اور دھرما الگ الگ دو سمتوں میں روانہ ہو گئے۔ ہم دونوں زور زور سے انہیں پکارتے بھی رہے تھے۔ کچھ ہی دور جانے کے بعد میرا پاؤں برف کے ایک چھوٹے سے ڈھیر سے ٹکرایا۔ میں نے لالٹین اٹھا کر دیکھا، یہ میرا تھی۔ میں نے ہاتھوں اور بیلچے سے برف کو ہٹا کر میرا کو اٹھا لیا۔ وہ بے ہوش اور نیلی تھی۔ مگر ابھی جان باقی تھی۔ میں نے اسے کمبل میں لپیٹا اور لوٹ کر دھرما کے راستے پر ہو لیا۔ وہ شاید دور نکل گیا تھا۔ مگر جلد ہی اُس نے میری آواز سُن لی اور مجھے آ ملا۔ دیکھ کر میری

طرف واپس آنے لگا۔ جیسے ہی وہ میرے پاس پہنچا میں نے کہا "میرا مل گئی ہے اور کمبل میں لپٹی ہوئی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے وہ کھیلتے کھیلتے گھر سے دور نکل آئی اور پھر اُسے طوفان نے گھیر لیا۔ رادھا اُس کی تلاش میں باہر نکلی ہوگی۔ اب اُسے کہاں ڈھونڈیں کیوں کہ ماں اپنی بچّی کو ڈھونڈے بغیر کیسے گھر لوٹے گی؟"

"بابو جی۔" دھرما بولا "میرا آپ کو جس راستے پر ملی ہے وہ تو بھیڑ بکریوں کے جانے کی پگڈنڈی ہے اور بی بی جی اُدھر نہیں گئی ہوں گی، میں اُنہیں ڈھونڈنے اسی راستے پر آگے جاتا ہوں، آپ گھر پہنچ کر میرا کی خبر لیں ورنہ وہ نہیں بچے گی۔"

میں لوٹ گیا۔ کوئی ایک گھنٹے کے بعد ٹھنڈ سے کانپتا اور بری طرح ہانپتا ہوا دھرما بے ہوش رادھا کو کندھے پر لادے کمرے میں داخل ہوا۔ وہ بھی میرا ہی کی طرح برف کے ایک ڈھیر میں دبی ملی تھی۔ اُس نے رادھا کو بستر پر لٹایا۔ میں نے ٹرنک میں سے دو نئے کمبل نکال کر اُس پر ڈال دیئے۔ دھرما نے اپنے گیلے کمبل اور اوورکوٹ اتار پھینکا۔ اور ایک خشک کمبل سے مونہہ ڈھانپ کر چارپائی پر لیٹ گیا۔ میں نے اُسے گرم پانی میں ملا کر برانڈی پلانے کی کوشش کی مگر اُس نے نہ پی۔ جب ڈاکٹر نے رادھا اور میرا کو دیکھا اُس نے دھرما کو بھی دوا دے دی۔ دھرما کا بدن بخار میں بھُن رہا تھا اور اُس کا سانس اُکھڑا اُکھڑا چل رہا تھا۔

بے ہوش اور برف سے نیلی پڑی ہوئی کمزور رادھا اور میرا تو بچ گئیں مگر پہاڑوں سے ٹکر لینے والا طاقت ور اور جفاکش دھرما ایسا لیٹا کہ پھر نہ اٹھا صرف دو دن بعد ہی اُس کی موت ہوگئی۔ میں بہت دیر تک اپنے بستر پر پڑا بچّوں کی طرح سسک سسک کر روتا رہا۔ دھرما سے ہمیشہ مجھے بیوی کی خدمت، ماں کی شفقت اور دوست کا خلوص ملا تھا لیکن

پڑوسیوں اور دوستوں کی نظر میں صرف میرا نوکر مر گیا تھا اور نوکر کو لوگ انسان نہیں ایک بے جان شے سمجھتے ہیں۔ اسی لئے کوئی بھی ہمارے گھر میں تعزیت کے لئے نہیں آیا۔ میرے ٹھیکے پر کام کرنے والے کچھ مزدور آئے اور میں اُن کے ہمراہ دھرملکے جسم کو آگ کے سپرد کر آیا۔

شام کو خلیل اور بختاور صرف یہ پوچھنے کے لئے آئے کہ دھرملکیسے مر گیا اور میرا آج شام کو کھیلنے کا کیا پروگرام تھا۔ میرے دل کو دھکا لگا۔ کیونکہ دھرما میرے گھر کی بکری یا گائے کا نام نہیں تھا بلکہ ایک انسان کا نام تھا۔ وہ میرا ہمدم، رفیق اور محسن تھا اور یہاں کے خلیل اور بختاور کوٹ دوارہ کے مُنّا لال اور مشتاق علی اور شملہ کے امرت اور رام سرن ہماری اُس دنیاوی دوستی کے نمائندے تھے جو موسم بہ موسم دھوپ چھاؤں کی طرح گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔

کاغذ کے پھول

اس کا نام نیلما تھا، لیکن گھر میں اسے سب نیلی کہتے تھے۔ جب وہ لندن اور پیرس گئی تو اس نے اپنے آپ کو نیلو کہنا شروع کر دیا تھا۔

وہ ایک امیر گھر کی لڑکی تھی اور اکلوتی ہونے کی وجہ سے بڑے لاڈ پیار میں پلی تھی۔ اس کی ماں اس کے بچپن ہی میں فوت ہو گئی تھی اور وہ آزاد خیال اور بے پروا باپ کی برائے نام نگرانی میں اور غیر معمولی آزاد ماحول میں پڑھی اور بڑی ہوئی تھی۔ نیلو لمبے قد کی ایک خوبصورت لڑکی تھی جس کے چہرے اور بدن میں ایک عجیب کشش تھی۔ وہ شروع سے ہی فیشن کی دل دادہ تھی اور اس کے بال اور لباس بہترین مغربی سٹائلوں کے مظہر تھے۔ پیرس اور لندن کی سڑکوں اور گلیوں کی رومان پرور فضا میں اس کا جسم اور اس کے بال اور لباس بہترین مغربی سٹائلوں کے مظہر تھے۔ پیرس اور لندن کی سڑکوں اور گلیوں کی رومان پرور فضا میں اس کا جسم اور اس کے خیالات یکسر ہی بدل گئے تھے اور سرسری طور پر دیکھنے

میں تو وہ ایک غیر ملکی لڑکی ہی معلوم ہوتی تھی۔
اگرچہ نیلو لندن اور پیرس میں جرنلزم کا کورس کرنے گئی تھی مگر بمبئی لوٹ کر اُس نے فیصلہ کیا کہ وہ ماڈل کے طور پر کام کرے گی۔ پیرس اور لندن کی کئی مشہور ماڈل لڑکیاں اس کی دوست رہی تھیں اور ان کی حیرت انگیز کامیابی سے بڑی متاثر ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ اس سے ہی ملتا جلتا ایک دل کش جسم اور مسحور کن خطوط اور زاویئے اس میدان میں اس کی کامیابی کے ضامن تھے۔ اگرچہ بمبئی میں کچھ نوجوان لڑکیوں نے ماڈل کے طور پر کام کرنا شروع کر دیا تھا، مگر نیلو کو یقین تھا کہ وہ جلد ہی بمبئی کی فضاؤں پر چھا جائے گی کیوں کہ اس کا ارادہ بالکل بے باکی سے غیر ملکی ماڈلوں کے پیمانے پر کام کرنے کا تھا۔ بمبئی میں آنے کے چند ہی دن بعد بمبئی کے چند رسالوں میں نیلو کی ایک بہت ہی دلکش پوز میں فوٹو چھپی جس کے نیچے نیلو کے مختصر تعارف کے ساتھ یہ بھی لکھا ہوا تھا کہ وہ ہندوستان کی پہلی لڑکی ہوگی جو پرائیویٹ ماڈل کے طور پر کام کرے گی۔
جس طرح آگ جنگل میں پھیل جاتی ہے اسی طرح نیلو کی شہرت بمبئی میں پھیل گئی۔ ہر طرف اس کے چرچے ہونے لگے اور وہ واقعی بمبئی کی فضاؤں پر چھا گئی۔ بمبئی کا امیر اور عیاش طبقہ اس کے گرد منڈلانے لگا۔ ایک روز گھر لوٹنے پر اسے تین خط ملے۔ یہ تینوں خط ان لوگوں کی طرف سے تھے جو نیلو کو ماڈل بنانا چاہتے تھے ایک خط داڈیا فوٹو گرافر کا تھا جو اشتہاری مقصد کے لئے نیلو کے کچھ فوٹو لینا چاہتا تھا۔ دوسرا خط ایک مسٹر پٹیل کا تھا، جو ایک ادھیڑ عمر کا گجراتی سیٹھ تھا اور جس کی بیوی کو فوت ہوئے دو سال ہو گئے تھے اور جس کو بیوی کی موت کے بعد بت تراشی کا شوق ہو گیا تھا۔ تیسری چٹھی ایک کمرشل فلمیں بنانے والے پروڈیوسر

ئی تھی جس میں اس سے پوچھا گیا تھا کہ کیا وہ کمرشل فلموں میں کام کرنا پسند کرے گی۔ نیلو ان خطوں کو پڑھ رہی تھی کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ اس نے خطوں کو رکھ کر ٹیلیفون اٹھایا۔ آواز آئی "مس نیلو میں داڈیا فوٹو گرافر ہوں۔ آپ کو میری چٹھی تو مل گئی ہوگی۔"

"آپ کی چٹھی ابھی میں نے دیکھی ہے۔ فرمائیے۔"

"مجھے اشتہاری مقصد کے لئے آپ کے کچھ پوز لینے ہیں اور یہ فوٹو یہاں کے اخباروں کے علاوہ غیر ملکی رسالوں میں بھی چھپیں گے۔"

"لیکن میں فی پوز پانچ سو روپے لوں گی اور اگر آپ غیر ملکی مارکیٹ میں یہ فوٹو استعمال کریں گے تو اس کی شرائط الگ سے طے ہوں گی۔"

"مجھے منظور ہے۔ کیا آپ کل صبح دس بجے آسکیں گی؟"

"آجاؤں گی۔ ڈریسز اور دوسرے آرائشی سامان کا انتظام تو آپ کے ہاں ہو گا ہی۔"

" اگلے روز ٹھیک وقت پر نیلو داڈیا کے ہتے پر پہنچ گئی۔ یہ ایک بڑا بنگلہ تھا داڈیا عالمی شہرت کا فوٹو گرافر تھا اور یہ بنگلہ اس کا اپنا تھا۔ نیلو کا ایک خادم نے استقبال کیا جو نیلو کو کئی کمروں میں سے گزارتا ہوا داڈیا کے کمرے میں لے گیا۔ داڈیا نے اُٹھ کر اور مسکرا کر نیلو کا خیر مقدم کیا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اندر کے سٹوڈیو میں لے گیا اور بولا "میں نے آپ کو مس شیریں کی پارٹی میں دیکھا تھا۔ آپ بے حد دلکش جسم کی مالک ہیں اور میری یہ خواہش ہے کہ آپ میرے ساتھ کام کریں۔ آج میں آپ کے دو پوز یہاں لوں گا اور کل دو پوز کے لئے شام میں آپ کو میرے ساتھ سمندر کے ساحل پر چلنا ہو گا۔ آپ ذرا اپنے بال بکھیر لیں اور یہ کالے پھولوں والا تیرنے کا لباس پہن لیں۔ پیروں کو ننگا رکھئے۔"

نیلو سٹوڈیو میں آدھ گھنٹے سے زیادہ نہیں رہی ہوگی اور ایک ہزار روپے کا چیک لے کر چلی گئی۔ اگلے روز بھی سمندر کے کنارے پر داڈیا نے اس کے

دو پونڈ لئے اور اسے ایک ہزار روپے کا چیک تھما دیا۔

پٹیل واڈیا سے بہت زیادہ امیر تھا۔ مالابار ہل پر اس کا بنگلہ قیمتی رنگین پتھروں کا بنا ہوا تھا جس میں آرائشی سامان کی قیمت ہی کئی لاکھ روپے تھی۔ مگر ساٹھ کمروں کے اس محل میں صرف دو عورتیں تھیں۔ ایک پٹیل کی بوڑھی ماں جو کسی روز بھی مر سکتی تھی اور دوسری پٹیل کے بڑے بھائی کی بیوہ جو اپنے تین بچوں کے ساتھ پشت کے چھ کمروں میں رہتی تھی۔ پٹیل کی بیوی کو مرے ہوئے اب دو سال ہو گئے تھے اور اس کے کوئی بچہ نہیں تھا۔ وہ کوئی اڑتالیس سال کا تھا اور روئی کا بہت بڑا بیوپاری تھا۔ وہ ہر وقت گھر میں، اوپر کی منزل میں رہتا تھا اور سارا بزنس نیچے دس کمروں میں بیٹھے ہوئے اس کے منشی اور کارندے کرتے رہتے تھے۔

جس وقت نیلو پٹیل کے یہاں پہنچی تو پٹیل چوتھی منزل کی چھت پر اپنی بت تراشی کی مشق میں مصروف تھا۔ نیلو کو لفٹ کے ذریعے اس کے پاس پہنچا دیا گیا۔ وہ ایک دلفریب گلابی لباس میں ملبوس تھی جو عریانی کی حد تک مختصر تھا۔ پٹیل اسے دیکھ کر ٹھٹھک کر رہ گیا۔ ایک لمحے کے لئے اسے اس کھلی چھت اور آسمان کے درمیان فاصلہ بہت کم نظر آیا اور اسے ایسا محسوس ہوا کہ نیلو نیچے سے نہیں آئی، اوپر سے اچانک کود گئی تھی۔ پٹیل اس وقت لکڑی کے ایک بڑے سے ٹھکے اور پیتل کے چند اوزاروں کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ نیلو کو دیکھ کر بغیر کسی تمہید کے بولا۔ "میں اپنے ماڈل لکڑی میں سے تراشتا ہوں۔ آپ کو سامنے بٹھا کر قدرتی رنگ و لباس میں ایک بت بنانا چاہتا ہوں۔"

"مگر آپ" نیلو مسکرا کر بولی "اس سخت لکڑی سے کیسے بت بنا لیتے ہیں؟"

"بت تو پتھر میں سے بھی تراشا جاتا ہے۔ مگر یہ لکڑی کسی درخت کی عام لکڑی نہیں ہے۔ یہ ایک نہایت نرم لکڑی اور مسالے کا مرکب ہے۔ دیکھئے اس چھری سے کیک کی طرح کٹ جائے گی۔"

نیلو پٹیل کے شوق اور انہماک سے زیادہ اس کی دولت سے متاثر ہوئی

پٹیل نیلو کو پیچھے اپنے سٹوڈیو میں لے گیا جس میں قبر کی سی خاموشی تھی۔ وہاں پٹیل نے کئی چیزوں کی ترتیب کو بدلا اور پھر ایک کونے میں پڑے ایک مخملی سٹول پر نیلو کو بٹھا کر اس نے ایک بٹن دبا کر نیلو پر اتنی روشنی کر دی جیسے نیلو عورت نہیں ایک مجسمہ تھی جو خیرہ کن روشنیوں میں نہایا ہوا تھا۔

نیلو بیس روز تک پٹیل کے یہاں جاتی رہی مگر پٹیل مجسمے کو مکمل نہ کر سکا کیوں کہ وہ نیلو کے جسم کے مدہوش کن خطوط اور زاویوں کو دیکھتا تو اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگتا۔

رفتہ رفتہ نیلو کو اتنا کام ملا کر اس کے لئے سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ آتی ہوئی دولت اور شہرت اس کے چہرے پر شراب کی مدہوشی اور سرخی لا رہی تھی اور اس کے جسم میں شعلوں کی لپک بڑھتی جا رہی تھی۔ لیکن ان ہی دنوں جب وہ ایک پارٹی میں سرورش سے ملی تو اسے ایسا محسوس ہوا کہ وہ پہلی مرتبہ ایک ایسے امیر نوجوان سے مل رہی ہے جو اس میں ایک سنجیدہ دلچسپی لے سکتا ہے۔ سرورش بمبئی کے کئی کارخانوں میں حصہ دار تھا۔ سرورش کو آرٹ میں کوئی دلچسپی نہیں تھی مگر عورت کا حسین جسم اسے بری طرح کھینچتا تھا۔ نیلو اپنا فالتو وقت اب سرورش کے ساتھ ہی گزارتی۔

نیلو نے ایک فیشن ایبل علاقے میں ایک فلیٹ خرید لیا۔ وہ ایک نئی کار کی مالک پہلے ہی سے تھی اور یہ سب کچھ صرف تین سال کے عرصے میں ہی ہو گیا تھا۔ اس خوب صورت فلیٹ میں اس کے ساتھ اس کی دو خادمائیں تھیں۔ ایک مسز گورا جو تقریباً چالیس سال کی ایک گوآنی عورت تھی اور ایک روزی جو بیس سال کی سانولے رنگ کی دلکش لڑکی تھی۔ مسز گورا کچن کا کام کرتی تھی اور روزی گھر کی صفائی اور عام دیکھ بھال کے علاوہ نیلو کی ذاتی خادمہ بھی تھی۔

جب نیلو کو ماڈل کے طور پر کام کرتے ہوئے تقریباً پانچ برس ہو گئے تو اسے اتنی دولت کے باوجود اچانک اپنی زندگی میں ایک خلا کا احساس ہونے لگا۔ اسے ایسا لگا کہ وہ ایک بھرے بازار میں بے مقصد دوڑ رہی تھی۔ اتنی دولت، شہرت

اور ترقی کے باوجود وہ کوئی چیز کھو رہی تھی۔ اُس نے ایک بوجھل پن اور اکتاہٹ کا احساس بھی کیا یہ بے تحاشہ دوڑ، بے لگام زندگی کامیابی تو لاتی ہی تھی مگر اس کی گود میں کئی ناکامیاں بھی آتی تھیں۔ یہ ناکامیاں زیادہ تر جذباتی محاذ پر تھیں۔ اس نے کئی کاغذ کے پھولوں کو اصلی سمجھ کر دھوکا کھایا تھا۔ اسے اتنی عالی شان، جگمگاتی دنیا میں پیار اور خلوص نہیں ملا تھا۔ وہ بت بنا تو کرتی تھی مگر ایک حقیقی بت نہیں تھی۔ کوئی اس کا پجاری نہ تھا۔ وہ اس تھوڑے سے عرصے میں بہت سے آدمیوں سے ملی تھی مگر اس نے ان سب کو موم اور شیشے کے کھلونوں کی طرح جذبات سے خالی پایا تھا۔ جن دو چار آدمیوں کی طرف اس نے جذباتی طور پر بڑھنا چاہا تھا انہوں نے نیلو کو شک اور ڈر کی نظر سے دیکھا تھا۔ داڈیا، دستور، پریم اور سردش خلوص اور پیار سے خالی ایسے ہی بھنورے ثابت ہوئے تھے۔

مسز گورا نے ایک دن نیلو کو بتایا کہ روزی کو جس لڑکے سے محبت تھی اس کے ساتھ اس اتوار کو اس کی شادی ہو جائے گی۔ یہ سن کر نیلو ایک لمحے کے لئے حیران سی ہو گئی اور پھر مسکرا دی۔ محبت اور شادی ــ عورت ہونے کے باوجود، یہ دو لفظ اس کے لئے بڑے اجنبی سے تھے۔ مگر آج نہ جانے کیوں ان لفظوں کو سُن کر اُس نے اپنے دل میں ایک درد سا محسوس کیا۔ پھر چند لمحوں کے بعد اسے کانت کا خیال آیا اور اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے دل کا بند کنول آہستہ آہستہ کھل رہا تھا۔ وہ خوشی کے لہجے میں بولی "کہاں ہے روزی؟ میرے سامنے کیوں نہیں آتی۔ یہ تو بڑی ہی خوشی کی بات ہے۔ گورا تم ہمارے ساتھ چلو۔ ہم روزی کے لئے تحفے لائیں گے۔"

روزی کے لئے تحفے خریدتے خریدتے نیلو پھر کانت کے بارے میں سوچنے لگی۔ کانت اس کے فلیٹ کے نیچے گراؤنڈ فلور میں ایک کمرے میں رہتا تھا اور کامرس کالج میں لیکچرر تھا وہ کوئی چھبیس ستائیس سال کا خوبصورت نوجوان تھا۔

نیچے اترتے اور باہر جاتے ہوئے کئی دفعہ کانت اور نیلو کی ملاقات اور باتیں ہوئی تھیں۔ بعض مرتبہ کانت کو بس کی انتظار میں کھڑا دیکھ کر نیلو اسے اپنی کار میں کالج تک چھوڑ آتی۔ کانت سادگی پسند اور شرمیلا تھا اور نیلو نے یہ محسوس کیا کہ کانت اس کی زندگی میں سکون، محبت اور خلوص بھر سکتا ہے۔ وہ زندگی میں اتنی بھٹک گئی تھی کہ خلوص اور محبت کی تلاش میں وہ ایک امیر اور جلد درجے فیشن ایبل لڑکی ہونے کے باوجود کانت کی سطح پر اترنے کے لئے تیار تھی مگر کانت کی محبت اور سکون کا نظریہ نیلو کی زندگی سے بڑا مختلف تھا۔ اس کی حدیں ایک چھوٹے سے گھر کی چار دیواری میں ایک گھریلو، شرمیلی لڑکی تک تھیں جو خلوص اور محبت کا پیکر ہوتی ہے۔ وہ نیلو سے کھنچا کھنچا، ڈرا ڈرا سا رہا نیلو اسے رنگ و بو میں ڈوبی ہوئی ایک ایسی مدہوش کن دنیا نظر آتی تھی جس میں سانس لینا بھی مشکل تھا۔ اس طرح نیلو کا یہ جذباتی تانا بانا بھی ٹوٹ گیا!

نیلو ایک رات بڑی اداس ہو کر لوٹی۔ اسے اپنی یہ رنگین دنیا ایک گھٹا ہوا تنگ پنجرہ نظر آئی۔ وہ ایک غلط راستے پر اتنی دور نکل آئی تھی کہ واپس لوٹنا بھی مشکل نظر آ رہا تھا۔ روزی نیلو کے انتظار میں بیٹھی ہوئی تھی۔ نیلو سیدھی بیڈ روم میں گئی اور اپنے بستر پر لیٹ گئی۔ روزی اس کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔ دو چار لمحے بعد میں نیلو جذبات سے مغلوب ہو کر بولی۔ "یہ میرے جو ہرات کی دنیا بڑی کھوکھلی بڑی سونی ہے۔ تو بڑی خوش نصیب ہے روزی کہ تجھے ایک شوہر کا پیار اور محبت ملی۔"

اور یہ کہہ کر نیلو بستر پر اوندھے مونہہ لیٹ کر بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی!

میں بلا جھجک یہ پیش گوئی کر سکتا ہوں کہ
م. م. راجندر کا شمار مستقبل قریب میں ہی اردو کے
صفِ اوّل کے افسانہ نگاروں میں ہوگا۔

حامد علی خاں (ایڈیٹر ہمایوں - لاہور)
جنوری ۱۹۴۵ء